شرح مثنوی پس چہ باید کرد

مع

مسافر

مؤلفہ

(پروفیسر) یوسف سلیم چشتی

عشرت پبلشنگ ہاؤس
متصل لاہور پریس عقب بانوالی گلی
ہسپتال روڈ انارکلی لاہور

جس کتاب پر پبلشر کے دستخط نہیں ہونگے وہ مال مسروقہ تصور ہوگا

شرح مثنوی پس چہ باید کرد

مع مسافر

مؤلفہ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ملنے کا پتہ

عشرت پبلشنگ ہاؤس ہسپتال روڈ انار کلی لاہور

عقب پانو والی گلی

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ

بار اوّل .... اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء

ناشر .... محمد یعقوب خاں

مطبوعہ .... رحمانی پریس۔ ڈیلیار روڈ۔ لاہور

قیمت: ساڑھے [redacted] روپیہ Rs [redacted]/[redacted]

انتساب

محترمی و مکرمی عالی جناب نواب سرور علی خاں بہادر فیروز جنگ
سابق والی ریاست کوروائی (وسط ہند)
کے نام
جن کی محبت کا نقش میرے دل پر ہمیشہ قائم رہے گا۔

نیاز مند
سلیم چشتی

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	حصۂ اول مسافر مقدمہ	
۲	فصل اوّل - بخوانندۂ کتاب	
۳	″ دوم - تمہید، خطاب بہ اقوامِ سرحد	
۴	″ سوم - خطاب بہ مہر عالمتاب	
۵	″ چہارم - حکمتِ کلیمی	
۶	″ پنجم - حکمتِ فرعونی	
۷	″ ششم - لا اِلٰہ الا اللہ	
۸	″ ہفتم - فقر	
۹	″ ہشتم - مردِ حُر	
۱۰	″ نہم - در اسرار شریعت	
۱۱	″ دہم - اشکے چند بر افتراقِ ہندیاں	
۱۲	″ یازدہم - سیاستِ حاضرہ	
۱۳	″ دوازدہم - حرفے چند با اُمتِ عربیہ	
۱۴	″ سیزدہم - پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق	
۱۵	″ چہاردہم - در حضور رسالتمآب۔	

حصۂ اوّل

مسافر

مقدمہ

وجہ تسمیہ

۱۹۳۳ء میں اقبال نے نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کا سفر کیا تھا۔ واپسی پر اپنے تاثرات قلمبند کر کے "مسافر" کے نام سے شائع کئے۔ پہلا ایڈیشن جیبی سائز پر نومبر ۳۴ء میں جداگانہ شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۳۶ء میں اس کو "مثنوی پس چہ باید کرد" کے ساتھ شائع کیا گیا۔

تقریبِ سفر

امان اللہ خاں کے عہد حکومت تک افغانستان میں قدیم نصاب تعلیم مروج تھا۔ جب نادر شاہ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے یہ چاہا کہ اس ملک کے باشندے مغربی علوم و فنون سے بھی آگاہی حاصل کریں اسلئے انہوں علامہ مرحوم، سر راس مسعود مرحوم اور مولینا سید سلیمان ندوی مرحوم کو مدعو کیا کہ تدوین نصاب میں مشورہ دیں۔ فرضِ منصبی سے فارغ ہو کر علامہ نے غزنی اور قندہار کی سیاحت بھی کی۔ بعد ازاں لاہور واپس آگئے۔

نادر شاہ کے سوانح حیات

نادر شاہ کا اصلی نام نادر خاں تھا۔ امان اللہ خاں کے عہد حکومت میں وہ سپہ سالار ہو گئے، پھر وزیر جنگ ہو گئے۔ جب ۱۹۲۹ء میں امان اللہ خاں کو تخت و تاج سے

دستبردار ہونا پڑا تو اس وقت وہ فرانس میں تھے امان اللہ خاں کے جانے کے بعد ملک میں ہر طرف بدنظمی رونما ہو گئی اس لئے ان کے جانشین عنایت اللہ خاں نے بھی مجبوراً دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اس خلفشار میں ایک معمولی شخص بچہ سقہ نے کابل پر قبضہ کر لیا اور حبیب اللہ خاں کا لقب اختیار کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

جنرل نادر خاں نے موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور یورپ سے واپس آکر کچھ فوج فراہم کی اور اکتوبر ۲۹ء میں بچہ سقہ کو شکست دی اور نادر شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت پر قبضہ کر لیا اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت بہت جلد سارے ملک میں امن و امان قائم کر دیا مگر نومبر ۱۹۳۳ء میں ایک افغان نوجوان نے انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کا بیٹا ظاہر شاہ تخت نشین ہوا جو تا ایندم برسرِ حکومت ہے۔

خلاصہ مثنوی

ناظرین کی سہولت کے لئے ذیل میں اس مثنوی کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

تمہید میں اقبال نے نادر شاہ کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو واضح کیا ہے، اس کے بعد اپنی طلبی کا تذکرہ لکھا ہے اور آخر میں اپنی روانگی کا حال قلمبند کیا ہے۔

دوسری فصل میں اقوام سرحد سے خطاب کیا ہے۔ اس کے ضمن میں دینِ اسلام کی حقیقت بیان کی ہے اور افغانوں کو قرآن و حدیث کے مطالعہ کی دعوت دی ہے جس کی بدولت غیر اللہ سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

تیسری فصل میں نادر شاہ سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے۔

چوتھی فصل میں شہنشاہ بابر کے مزار پر حاضری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پانچویں فصل میں حکیم سنائیؒ کے مزار پر حاضری کا تذکرہ کیا ہے۔
چھٹی فصل میں حکیم موصوف کی زبان سے فقر کا فلسفہ سپردِ قلم کیا ہے۔
ساتویں فصل میں سلطان محمود غزنوی کے مزار پر حاضری کا حال لکھا ہے۔
آٹھویں فصل میں "مردِ شوریدہ" کے پردے میں مسلمانوں کی حالتِ زار پر ماتم کیا ہے اور خدا سے یہ دعا کی ہے کہ ان کے دلوں میں پھر عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا کر دے تاکہ دنیا میں دوبارہ سربلند ہو سکیں۔
نویں فصل میں قندہار کے سفر کی طرف اشارہ کیا ہے اور "خرقۂ مبارک" کی زیارت کا تذکرہ قلمبند کیا ہے۔
دسویں فصل میں احمد شاہ ابدالی کے مزار کی زیارت کا حال لکھا ہے۔
آخری فصل میں ظاہر شاہ سے خطاب کیا ہے اور اسے رموزِ سلطانی سے آگاہ کیا ہے۔

آغازِ کتاب

تمہید

اشعار ۱ تا ۶ تمہید کے پہلے چھ شعروں میں اقبال نے نادر شاہ کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) اس کی زندگی میں درویشی کا رنگ نظر آتا ہے۔

(۲) اس کے حسنِ تدبیر کی بدولت افغانوں کو استحکام نصیب ہوا اور وہ دینِ اسلام کا محافظ ہے۔

(۳) اس کی نمازوں میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی خشیت اور خود گدازی کی جھلک نظر آتی ہے، لیکن میدانِ جنگ میں اس کی تلوار خارا گداز ہے۔

(۴) وہ مسلمانوں پر رحیم ہے مگر ملت کے دشمنوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے۔ اس نے اپنی شانِ جمال سے حضرت صدیق اکبرؓ اور شانِ جلال سے حضرت فاروق اعظمؓ کا زرین عہد تازہ کر دیا۔

(۵) وہ ہر وقت دین کے غم میں کڑھتا رہتا ہے اور مشرق کی تاریک رات میں اس کا وجود بمنزلہ چراغ ہے۔

(۶) اس کی نگاہوں سے عاشقانِ الٰہی کی مستی ٹپکتی ہے۔ یوں سمجھو کہ اس کا خمیر عشق و محبت سے تیار ہوا ہے۔

حضرات صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ تو غایتِ شہرت کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے مختصر حالات ذیل میں

درج کرتا ہوں:۔

ان کا اصلی نام جندب تھا، ابوذر کنیت ہے۔ "مسیح الاسلام" لقب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا "میری اُمت میں ابوذرؓ میں عیسیٰ بن مریمؑ جیسا زہد پایا جاتا ہے" جاہلیت میں نہایت مشہور راہزن تھے لیکن رحمتِ حق نے ان کی دستگیری کی جس کی تفصیل خود ان کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ جب میں نے سُنا کہ مکہ میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا۔

اسلام لانے والوں میں ان کا پانچواں نمبر ہے۔ قبول اسلام کے بعد حضورؐ کے حکم سے اپنے قبیلہ میں واپس آئے اور ان کی تبلیغی کوششوں سے نصف قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ جب حضورؐ نے ہجرت فرمائی تو یہ بھی مدینہ آگئے اور دن رات حضورؐ کی خدمت کرنے لگے۔

حضرت ابوذرؓ فطرتاً زہد پیشہ اور تارک الدنیا تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات کے بعد مدینہ سے شام چلے گئے لیکن شامی مسلمانوں کے طرزِ عمل سے دل برداشتہ ہوگئے کیونکہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے لوگوں میں عیش و عشرت کا رنگ پیدا ہوگیا تھا لیکن حضرت ابوذرؓ سب کو اپنی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کے مشرب میں زائد از ضرورت دولت جمع کرنا اور قیمتی لباس زیب تن کرنا جائز نہ تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے علانیہ ایسے مسلمانوں کو اس آیت کا مورد قرار دیا ہو وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اُس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو

آپؐ ان لوگوں کو دردناک عذاب کی بشارت دیدیجئے۔

امیر معاویہؓ نے ان کو مدینہ بھجوادیا۔ لیکن یہاں بھی نہ رہ سکے۔ اسلئے مکہ کے قریب ایک گاؤں (ربذہ) میں مستقل سکونت اختیار کرلی، اور یہیں ۳۲ھ میں وفات پائی۔ حضرت ابوذرؓ زہد وورع، تقویٰ حق گوئی، توکل اور قناعت میں تمام صحابہؓ میں ممتاز تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالیہ میں جو مقام انہیں حاصل تھا اس کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مرض الموت میں ان کو طلب فرمایا۔ جب حاضر خدمت ہوئے اسوقت حضور صلعم لیٹے ہوئے تھے ابوذرؓ حضور صلعم کے اوپر جھک گئے۔ حضورؐ نے ہاتھ بڑھا کر انہیں سینۂ مبارک سے چمٹا لیا۔ ایک دفعہ حضورؐ نے فرمایا کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے۔

اشعار ۲ تا ۵ ان اشعار میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ انسان میں شانِ جمال اور شانِ جلال کیسے پیدا ہو سکتی ہے اور ان کا منبع کہاں ہے؟ کہتے ہیں کہ خسروی (شانِ جلال) نام ہے بزورِ شمشیر اجسام (مادیات) کی تسخیر کا یعنی بادشاہ تلوار کے زور سے انسانوں کے اجسام پر حکومت کرتا ہے، اور درویشی (شانِ جمال) کہتے ہیں انسانوں کے قلوب پر حکومت کرنے کو یعنی درویش کی نگاہ میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ وہ جسے ایک نظر بھر کے دیکھ لیتا ہے وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں ؎

نہیں فقر وسلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی (بالِ جبریل)

اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ خسروی اور درویشی، یہ وہ موتی ہیں جو لا الٰہ کے سمندر سے نکلتے ہیں یعنی اگر انسان حقیقی معنی میں موحد ہو جائے تو اس میں

یہ دو نو شانیں پیدا ہو جاتی ہیں اور چونکہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم موجوداتِ عالم کے سردار ہیں (آپ افضل المرسلین ہیں) اور سب سے بڑے موحد ہیں اسی لئے فقر اور شاہی (خسروی اور درویشی) آپ کی دو شانیں (واردات) ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ آپ کی ذات کی تجلیات ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو ان دونوں شانوں کا مظہرِ اتم بنایا ہے۔ اس لئے جو شخص ان دونوں شانوں کو اپنے اندر جمع کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ آپ کی اتباع کرے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ ان دونوں قوتوں کا ظہور مومن کے وجود پر موقوف ہے یعنی جب تک کوئی شخص حضور کی غلامی اختیار نہ کرے اس میں یہ دونوں شانیں بیک وقت جلوہ گر نہیں ہو سکتیں جس طرح نماز نام ہے قیام اور سجود کا اسی طرح مومن کی زندگی عبارت ہے خسروی (جلال) اور درویشی (جمال) سے۔

آخر میں فقر کی تعریف بیان کرتے ہیں کہ فقر سوز، درد، داغ اور آئینہ (عشق) کا نام ہے۔ بالفاظِ دیگر فقر عشقِ الٰہی کا ثمرہ ہے اور فقیر (عاشق) کی زندگی کی معراج یہ ہے کہ وہ راہِ خدا میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے کیونکہ شہادت ہی سے اسے عزت (آبرو) حاصل ہوتی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے۔

اشعار ۱۲۲ تا ۱۲۳

ان اشعار میں اقبال نے نادر شاہ کی شہادت کی طرف اشارہ کیا ہے گویا یہ اشعار بطور جملہ معترضہ لکھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مرحوم نے دین و ملت کی راہ میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔

اس کے بعد اقبال نے یہ لکھا ہے کہ نادر شاہ نے مجھے کابل آنے کی دعوت

۱؎ اور چونکہ فقر کی تشریح مثنوی "پس چہ باید کرد" کی شرح میں لکھوں گا اس لئے یہاں عمداً اس کی تشریح سے احتراز کیا ہے ۱۲۔

دی، اور دعوت نامہ کا مضمون یہ تھا کہ

"میں نے آپ کے کلام (آواز) کا مطالعہ کیا ہے اور میں آپ کی ملت پروری اور جذبۂ دینی سے بہت متاثر ہوں۔ بلاشبہ وہ قوم بہت مبارک ہے جو آپ کے خیالات (راز) سے آگاہی حاصل کرے۔ ہماری قوم آپ کے جذبۂ دینی (عمل) سے بخوبی واقف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کے افکار کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ آپ چند روز کے لئے کابل تشریف لائیں تاکہ ہم اور ہماری قوم کے افراد آپ کے خیالات سے مستفید ہو سکیں۔"

آخری اشعار میں اپنے سفر کی طرف اشارہ کیا ہے اور ضمناً افغانوں کی "بے مرکزی" پر اظہار افسوس بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے مستقر سے روانہ ہو کر درہ خیبر پہونچا (کابل جانے کا یہی راستہ ہے)۔ اس کے بعد قارئین سے اس درہ کا تعارف کراتے ہیں کہ یہ وہ درہ ہے جس میں سے ہو کر بہت سے مردانِ حق ہندوستان آئے "مردانِ حق" سے وہ صوفیائے کرام بھی مراد ہیں جو یہاں تبلیغ و اشاعت اسلام کے سلسلہ میں آئے۔ مثلاً حضرت شیخ علی ہجویری الملقب بہ داتا گنج بخش، سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین اجمیری، قطب الاقطاب حضرت خواجہ بختیار کاکی، مخدوم جہانیاں حضرت سید جلال بخاری، امیر کبیر سید علی ہمدانی اور حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی وغیرہم نیز ان فاتحین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے یہاں آکر فتوحات حاصل کیں۔ مثلاً سلطان محمود غزنوی، سلطان شہاب الدین غوری، بابر اور احمد شاہ ابدالی وغیرہم۔

اس کے بعد اس خطہ کے باشندوں (افغانوں) کی حالت پر تنقید کی گئی ہے کہ اگرچہ یہ لوگ بہت بہادر ہیں مگر اتحاد اور اتفاق کی نعمت سے محروم ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

فصل دوم

خطاب بہ اقوامِ سرحد

تمہید اس فصل میں اقبال نے مسلمانانِ سرحد کو یہ پیغام دیا ہے کہ اگر دنیا میں عزت کی زندگی مطلوب ہے تو اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کرو یعنی یہ معلوم کرو کہ دنیا میں تمہارا مقام اور منصب کیا ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تمام اقوامِ عالم کا سردار اور معلم بنایا ہے جس پر یہ آیت گواہی دے رہی ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (۳-۱۱)

تم بہترین اُمت ہو جو تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ تم لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلائیں اور بُرائی سے باز رکھیں۔ ادنیٰ تامل سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ وہ اس فرض کو اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب ان کے پاس طاقت (حکومت) ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں کو دنیا کی قوموں پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے اسلام اور غلامی ایک دوسرے کی ضدیں۔

اب سوال یہ ہے کہ طاقت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ میرے سوا کسی سے مت ڈرو، اور اس بات پر یقین رکھو کہ تمہاری زندگی اور موت کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ دنیا میں میرے سوا کوئی تم پر حکمران یا قاہر نہیں ہے۔ اگر تمہارے اندر ایمان و یقین کامل پیدا ہو جائے تو کوئی طاقت تمہیں مغلوب نہیں کر سکتی۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ۔

اور یقیناً تم غالب رہو گے اگر تم اپنے اندر ایمان پیدا کر لو۔

یہاں کس بات پر ایمان مطلوب ہے؟ اس بات پر کہ اللہ کے سوا کائنات میں کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دگر۔

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ

واضح ہو کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ انسان کے اندر بے پناہ طاقت اور حوصلہ ہمت اور شجاعت پیدا کر دیتا ہے۔ جب یہ مسلمان کے دل میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کائنات میں کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے تو وہ کسی شئی سے نہیں ڈر سکتا۔ چنانچہ اقبال نے اس نکتہ کو یوں بیان کیا ہے:

از ضمیر کائنات آگاہ اوست

تیغ "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ" اوست

اس شعر سے پہلے شعروں میں اقبال نے یہ کہا ہے کہ

(۱) اے مسلمان! تو اپنے آپ سے پوشیدہ ہے اس لئے خود را باز یاب"

(۲) اسلام کی روح یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو دیکھ لے تو کائنات پر حکمران ہو جائے گا۔

(۳) دین اسلام کیا ہے؟ اپنے اسرار سے آگاہی حاصل کرنا جو شخص اپنی حقیقت

سے بیگانہ ہے وہ دراصل مُردہ ہے۔

(۴) جو مسلمان اپنے آپ کو دیکھ لیتا ہے یعنی اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو برگزیدۂ کائنات یقین کر لیتا ہے۔

(۵) وہ کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے یعنی اسے اس بات کا یقین کامل حاصل ہو جاتا ہے۔ ((لا موجود الا اللہ))

اس شعر کے بعد اگلے (۳) شعروں میں اس شخص کی صفات بیان کی ہیں چونکہ ان اشعار کا سمجھنا اس نکتہ کے سمجھ لینے پر موقوف ہے کہ اللہ کے سوا کائنات میں کوئی ہستی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے اس لئے ہم اس جگہ اس نکتہ (لا موجود الا اللہ) کی تشریح درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد فصل کا مطلب بیان کریں گے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اپنی تمام تصانیف میں اس عقیدہ کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ اس عقیدہ کو اصطلاح میں وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔

ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی | کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی | تلاش خود کنی جز او نیابی

(پیام مشرق ۱۹۲۳ء)

ز آغاز خود دکس را خبر نیست | خودی در حلقۂ شام و سحر نیست
ز خضر ایں نکتۂ نادر شنیدم | کہ بحر از موج خود دیرینہ تر نیست

(ایضاً۔)

بانگِ درا میں لکھتے ہیں:-

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

زمانے میں وہ قمر ہیں وہ جلوہ گہ سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

(بانگ درا سنہ ۱۹۲۴ء)

زبورِ عجم (۱۹۲۷ء) میں لکھتے ہیں:-

در خاکِ ما گہرِ زندگی گم است
ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

بکنارت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی
بکنارہ برفگندی دُرِ آب دارِ خود را

گشائے پردہ ز تقدیرِ آدمِ خاکی
کہ ما بہ رہگذرِ تو در انتظارِ خودیم

اگر زیری ز خودگیری زبر شو
خدا خواہی بخود نزدیک تر شو

رموزِ بیخودی (۱۹۱۸ء) میں لکھتے ہیں:-

بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن
تیغِ لا موجود الا ھو بزن

ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) میں لکھتے ہیں:۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری   نہ ہے زمان و مکاں لا الہ الا اللہ

بالِ جبریل (۱۹۳۵ء) میں لکھتے ہیں:

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات   خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) میں لکھتے ہیں:

لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ   فاش تر خواہی ؟ بگو ہو عبدہٗ !

ارمغانِ حجاز (۱۹۳۸ء) میں لکھتے ہیں:

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب   بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب

چساں مومن کند پوشیدہ را فاش   ز "لا موجود الا اللہ" دریاب

خطباتِ مدراس (مذہبی فکر کی تشکیلِ جدید) میں لکھتے ہیں:۔

"یہ کائنات اپنی تمام جزئیات و تفصیلات ... سالماتِ مادی سے لیکر انسانی خودی میں فکر کی آزاد حرکت تک، انائے کبیر (حق ہو) کا جلوۂ ذات ہے"!

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۴ء ص ۶۹

اسرارِ خودی (۱۹۱۵ء) میں لکھتے ہیں:

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است   ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

ان اشعار سے ثابت ہوا کہ اقبال نے از اول تا آخر اپنی تمام تصانیف میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے۔

(ب) اقبال کے مرشد مولانا رومؒ نے بھی یہی تعلیم دی ہے:۔

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ — زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

ما ہے کہ نہ زیر و نے بما است کجا است — جانے کہ نہ بے با و نہ با ما است کجا است
ہیجا آنجا مگو، بگو راست کجا است — عالم ہمہ او ست آنکہ بینا ست کجا ست

(ج) عارف جامیؒ لکھتے ہیں:۔

پس عالم، ظاہر حق است و حق، باطن عالم۔ عالم پیش از ظہور عین حق بود و حق بعد از ظہور عین عالم۔ فی الحقیقت یک حقیقت است و ظہور و بطون و اولیت و آخریت از نسب و اعتبارات اوید کما قال اللہ تعالیٰ

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

ہمسایہ و ہمنشیں و ہمرہ ہمہ اوست — در دلق گدا و اطلس شہ ہمہ او ست
در انجمن فرق و نہانخانۂ جمع — باللہ ہمہ او ست ثم باللہ ہمہ او ست

(لائحہ بست و دوم)

(د) خواجہ باقی باللہ نقشبندیؒ فرماتے ہیں:۔

بشناس کہ کائنات در عدم اند — بل در عدم ایستادہ ثابت قدم
ایں بود معلق از خیال و وہم است — باقی ہمگی ظہور نوبہ قدم

حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

"اللہ کی وحدانیت کے دو معنی ہیں۔ علماء ظاہر کے نزدیک وحدانیت کے معنی یہ ہیں کہ جاننا چاہیے کہ معبود صرف ایک ہے دوسرا کوئی معبود نہیں۔ حضرات صوفیہ کے نزدیک وحدانیت کے معنی یہ ہیں کہ جاننا چاہیے کہ موجود

صرف ایک ہے دوسرا کوئی موجود نہیں۔ آیات قرآنی میں دونوں قسم کی وحدانیت کا ذکر موجود ہے۔

منجملہ ان آیات کے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جاننا چاہیئے کہ صرف ایک ذاتِ حق، موجود ہے۔ پہلی آیت یہ ہے:۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ

پس تم جس طرف رُخ کرو وہیں اللہ کا منہ ہے تحقیق کہ اللہ صاحب وسعت صاحب علم ہے۔

دوسری آیت یہ ہے:۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی

اور نہیں تیر چلایا آپ نے جب تیر چلایا آپ نے بلکہ اللہ نے تیر چلایا۔

تیسری آیت:۔

کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ

اللہ کی ذات کے سوا ہر شئی ہالک ہے یعنی بالفعل معرض فنا میں ہے۔

نوٹ:۔ امام غزالیؒ اس آیت کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "ہالک" اسم فاعل ہے۔ اور اسم فاعل میں زمانہ نہیں پایا جاتا اس لئے اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر شئی آئندہ زمانہ میں فنا ہو گی بلکہ اس وقت بھی معرضِ فنا میں ہے یعنی حقیقی معنی میں ذاتِ حق کے سوا کوئی شئی موجود نہیں ہے۔

چوتھی آیت:۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ

اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا الخ

یعنی حقیقی معنی میں صرف وہی موجود ہے۔

پانچویں آیت :-

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ۝ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ۝

جو زمین پر ہے وہ سب فانی ہے صرف ذات آپؐ کے رب کی باقی ہے جو صاحب عظمت و اکرام ہے۔

چھٹی آیت

سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ۝

ہم دکھا دیں گے ہم ان کو اپنی نشانیاں ملکوں میں اور ان کی جانوں میں یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے گا اُن پر کہ یہ حق ہے آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہر شئی پر محیط ہے۔

ساتویں آیت :-

ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

وہی اللہ اول ہے اور آخر ہے اور ظاہر ہے اور باطن ہے اور وہ ہر شئی کا علم رکھتا ہے

آٹھویں آیت :- وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ

اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو

نویں آیت :-

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔

ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

دسویں آیت :-

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللہَ یَدُ اللہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ

بلا شبہ جو لوگ آپؐ سے بیعت کرتے ہیں سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

گیارہویں آیت:۔

مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا ہُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَ مَا كَانُوْا ؕ

نہیں ہوتا ہے مشورہ تین شخصوں میں مگر اللہ ان میں چوتھا ہے۔ اور نہیں ہوتا مشورہ پانچ شخصوں میں مگر اللہ ان میں چھٹا ہوتا ہے۔ خواہ لوگ کم ہوں یا زیادہ، اللہ ان کے ساتھ ضرور ہوتا ہے جہاں کہیں بھی وہ ہوں۔ (ترجمہ فتاویٰ عزیزیہ جلد دوم صفحہ ۶۵ تا صفحہ ۶۶)۔ نیز اسی جلد کے صفحہ ۲۴۸ پر لکھتے ہیں:۔

جاننا چاہیئے کہ وحدت الوجود کا قائل ہونا ایسے طور پر کہ احکام شرع کے خلاف نہ ہو، عین ایمان و اسلام ہے۔[1] اس میں کفر کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ یعنی تمام موجودات کو مظاہر حق جانے اور یہ سمجھے کہ وجود ایک ہے لیکن وجود کے ہر مرتبہ کے لئے جداگانہ حکم ہے۔ مثلاً وجود بعض مراتب میں عبودیت کے ساتھ موصوف ہے اور بعض مراتب میں الوہیت کے ساتھ موصوف ہے۔ بعض مراتب میں حرام کے ساتھ اور بعض مراتب میں حلال کے ساتھ۔ بعض مراتب میں طاہر کے ساتھ اور بعض میں نجس کے ساتھ۔ وجود کے مراتب میں غلط نہ کرے اور یہ عقیدہ رکھے۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد   گر فرق مراتب نکنی زندیقی (جامی)

اور یہ بھی عقیدہ رکھے کہ عبد بہر حال عبد رہے گا خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے اور رب بہر حال رب رہے گا خواہ کتنا ہی تنزل کیوں

---

[1] شاہ صاحب کے اس قول سے معلوم ہوا کہ حضرات صوفیہ، وحدت الوجود کی اس تعبیر کو تسلیم نہیں کرتے جو احکام شرع کے خلاف ہے مثلاً شنکر آچاریہ اور اسپنوزا اور ہیگل نے وحدت وجود کی جو تعبیر پیش کی ہے چونکہ وہ احکام شرع کے خلاف ہے اس لئے کوئی مسلمان اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔

نہ فرمائے۔[1]

حضرات مشائخ کبار اور علماء نامدار نے ان سب امور کی تصریح فرمائی ہے قادریہ طریقہ کے مشائخ سے حضرت غوث اعظمؒ اور شیخ عبدالرزاقؒ کا یہی قول ہے اور چشتیہ طریقہ کے مشائخ سے حضرت سید گیسو درازؒ اور سید جعفر مکیؒ کا یہی ارشاد ہے اور نقشبندیہ طریقہ کے مشائخ سے حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ، خواجہ عبیداللہ احرارؒ، مولینا عبدالرحمن جامیؒ، مولینا عبدالغفور لاریؒ کا یہی فرمودہ ہے اور مشائخ عرب سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، شیخ صدرالدین قونویؒ، شیخ عبدالکریم جیلیؒ، شیخ ابراہیم کردیؒ، شیخ حسام الدین علی متقیؒ نے یہی تعلیم دی ہے۔[2] تو یہ جاننا کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ کفر ہے گویا ان تمام بزرگوں کی تکفیر ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک" (ضؔ ۲۴، صؔ ۲۴)

(۷) مولینا شبلی نعمانی مرحوم اپنی مشہور تصنیف "سوانح مولینا رومؒ" میں لکھتے ہیں کہ وحدتِ وجود کا مسئلہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اور اہل ظاہر کے نزدیک تو اس کے قائل کا وہی صلہ ہے جو منصور کو دار پر ملا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدت وجود کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے مقدمات ذیل کو

---

[1] یہ قول شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے اس قول کا ترجمہ ہے۔

وَالعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ

[2] ان بزرگوں کے علاوہ حسب ذیل اکابر اور علماء فحول نے بھی اسی عقیدہ کی تعلیم دی ہے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ، حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلویؒ، حضرت مولینا عبدالعلی بحرالعلومؒ، حضرت خاتم الحکماء مولینا فضل حق صاحب خیرآبادی مرحوم، حضرت مولینا عبدالحق خیرآبادی مرحوم، حضرت مولینا برکات احمد صاحب ٹونکی مرحوم، شیخ العرب والعجم مرشدی حضرت مولینا حاجی امداد اللہ صاحب چشتی مہاجر مکیؒ اور ان کے خلیفہ مولینا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم ۱۲۔

ذہن نشین کرنا چاہیئے۔

(۱) خدا قدیم ہے۔

(۲) قدیم، حادث کی علت نہیں ہو سکتا کیونکہ علت اور معلول کا وجود ایک ساتھ ہوتا ہے اس لئے اگر علت قدیم ہو تو معلول بھی قدیم ہوگا۔

(۳) یہ عالم حادث ہے۔ اب نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا عالم کی علت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا قدیم ہے اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں قدیم، حادث کی علت نہیں ہو سکتا۔

اس اعتراض سے بچنے کے لئے علماء ظاہر نے یہ پہلو اختیار کیا کہ خدا کا ارادہ یا اُس ارادہ کا تعلق حادث ہے اس لئے وہ عالم کی علت ہے۔ لیکن سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے ارادے یا ارادہ کے تعلق کی علت کیا ہے؟ کیونکہ جب ارادہ یا اس کا تعلق حادث ہے تو وہ علت کا محتاج ہوگا اور ضرور ہے کہ یہ علت بھی حادث ہو کیونکہ حادث کی علت، حادث ہی ہوتی ہے اور چونکہ علت حادث ہے تو اسکے لئے بھی علت کی ضرورت ہوگی۔ اب اگر یہ سلسلہ الیٰ غیر النہایہ چلا جائے (یعنی اگر اس سلسلہ کی کہیں نہایت یا حد نہ ہو) تو غیر متناہی کا وجود لازم آتا ہے جو متکلمین اور ارباب ظاہر دونوں کے نزدیک محال ہے اور اگر یہ سلسلہ کسی علت پر ختم ہو جائے تو ضرور ہے کہ وہ علت قدیم ہو کیونکہ حادث ہوگی تو پھر سلسلہ آگے بڑھیگا لیکن قدیم ہونے کی صورت میں لازم آئے گا کہ قدیم، حادث کی علت ہو جائے اور یہ صورت پہلے ہی باطل ثابت ہو چکی ہے، اسلئے تین صورتوں سے چارہ نہیں۔

(ا) یا تو یہ تسلیم کرو کہ عالم قدیم اور ازلی ہے اور اس کے باوجود خدا کا پیدا کردہ ہے لیکن جب خدا بھی قدیم اور ازلی ہے تو ازلی چیزوں میں سے کسی ایک کو علت اور دوسری کو معلول کہنا ترجیح بلا مرجح ہے اور یہ محال ہے۔

(ب) یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عالم قدیم ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے۔

لیکن یہ تو ملحدیوں اور دہریوں کا مسلک ہے جسے متکلمین قبول نہیں کر سکتے۔

(ج) لہٰذا تیسری صورت تسلیم کرنی پڑے گی کہ یہ عالم قدیم ہے لیکن ذات باری سے علیحدہ نہیں ہے بلکہ ذات باری ہی کے مظاہر کا نام عالم ہے۔[1] حضرات صوفیہ کا یہی مذہب ہے اور اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا، کیونکہ تمام مشکلات کی بنیاد اس پر ہے کہ عالم اور اس کا خالق دو جداگانہ چیزیں ہیں اور ان میں معلول اور علت کا رشتہ ہے۔ غرض فلسفہ کی رُو سے تو صوفیہ کے مذہب کے بغیر چارہ نہیں ہے البتہ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اور نصوص قرآنی اس کے خلاف ہیں لیکن یہ شبہ بھی صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم[2] کی آیتیں بکثرت موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن، اول و آخر جو کچھ ہے خدا ہی ہے مثلاً:-

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

(سوانح مولانا روم صفحہ ۲۰۲ تا صفحہ ۲۰۶)

(د) اب ہم عالم ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات سے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔ چونکہ حضرت موصوف کو اللہ تعالیٰ نے دین کی تجدید و اصلاح کے لئے مامور فرمایا تھا اس لئے ان کے قلم سے کوئی بات ایسی نہیں

---

[1] چنانچہ شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں: وَاِنَّ الْعَالَمَ لَيْسَ اِلَّا تَجَلِّيَهٗ فِيْ صُوَرِ اَعْيَانِهِمُ الثَّابِتَةِ الَّتِيْ يَسْتَحِيْلُ وُجُوْدُهَا بِدُوْنِهٖ (فصوص الحکم۔ فص ابراہیمی) "اور بلاشبہ یہ عالم نہیں ہے کوئی شئی مگر تجلی ہے حق تعالیٰ کی اعیان ثابتہ کی اُن صورتوں میں جن کا وجود تجلی کے بغیر محال ہے"۔ گویا مولانا شبلی مرحوم نے شیخ کی اس عبارت کا ترجمہ یا مفہوم بیان کر دیا ہے۔ ناظم ۱۲

[2] شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے اس مضمون کی گیارہ آیتیں اپنے جواب میں درج کر دی ہیں۔ ناظرین ان گیارہ آیتوں کو مدنظر رکھیں ۱۲۔

نکل سکتی جو شریعت حقہ کے خلاف ہو۔ چنانچہ حضرت موصوف نے اس مسئلہ کی تعبیر اس انداز سے کی ہے جو شریعت کے مطابق ہے۔

(۱) مکتوب اوّل جلد دوم صکے پر لکھتے ہیں:۔

"وجود، مبداء ہر خیر و کمال ہے اور عدم، منشاء ہر نقص و شرارت ہے پس وجود صرف واجب کے لئے ثابت ہے اور عدم، نصیب ہر ممکن ہے تاکہ تمام خیر و کمال، واجب کی طرف عائد ہو اور تمام نقص و شرارت ممکن کی طرف راجع ہو ممکن کے لئے وجود ثابت کرنا اور اس سے خیر و کمال منسوب کرنا فی الحقیقت اُسے حق تعالیٰ کے مُلک اور مِلک میں شریک کرنا ہے۔ اگر علماء ظاہر اس نکتہ سے آگاہ ہوتے تو ممکن کے لئے وجود ثابت نہ کرتے۔"

(۲) مکتوب چہل و چہارم جلد دوم ص۳ پر لکھتے ہیں:۔

"حضرات صوفیہ جو وحدت وجود کے قائل ہیں تو اس سے اُن کی مراد یہ نہیں ہے کہ اشیاء حق تعالیٰ سے متحد ہیں یا واجب (حق تعالیٰ) ممکن ہو گیا ہے یا حق تعالیٰ اشیاء میں حلول کر گیا ہے۔ یہ سب باتیں کفر اور الحاد ہیں[1] بلکہ ہمہ اوست کا مطلب یہ ہے کہ اشیاء موجود نہیں ہیں، صرف حق تعالیٰ موجود ہے۔ چنانچہ منصور نے جب انا الحق کہا تو اُس کی مراد یہ نہیں تھی کہ میں حق ہوں۔ یا حق کے ساتھ متحد ہو گیا ہوں بلکہ من نیستم، موجود حق است۔"

"اگرچہ صوفیہ کائنات کے وجود خارجی کو وہمی قرار دیتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ یہ وجود وہمی، جس نے خارج میں نمو پیدا کر لیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ارتفاع وہم سے مرتفع ہو جائے بلکہ یہ وجود وہمی اور نمود خیالی چونکہ مصنوع حق ہے

---

[1] حلول و اتحاد این جا محال است   کہ در وحدت دوئی عین ضلال است
(مثنوی گلشن راز مؤلفہ علامہ محمود شبستری)

اور اس کی قدرتِ کاملہ کا نقش ہے اس لئے زوال سے محفوظ ہے۔"

نوٹ:۔ مطلب حضرت مجدد الف ثانیؒ کا یہ ہے کہ خارج میں دراصل صرف حق تو موجود ہے۔ کائنات بھی موجود نظر آتی ہے مگر اس کا وجود خارجی حقیقی نہیں ہے بلکہ وہمی ہے یعنی صرف وہم کے درجہ میں ہے۔ ہماری عقل اشیاء کو خارج میں موجود سمجھتی ہے جیسے کوئی بچہ آئینہ میں کسی صورت کو دیکھ کر یہ یقین کر لے کہ وہ صورت درحقیقت آئینہ میں موجود ہے۔

اسی مضمون کو مرزا بیدل نے یوں ادا کیا ہے:۔

صورتِ وہمی بہ ہستی متہم داریم ما
چوں حباب آئینہ بر طاقِ عدم داریم ما

یہاں ایک شبہ وارد ہوتا ہے جس کا ازالہ از بس ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اگر کائنات کا وجود وہمی ہے تو پھر شریعت بالکل عبث ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معترض نے لفظ "وہمی" کا مفہوم دریافت نہیں کیا اس لئے یہ شبہ لاحق ہو گیا۔ واضح ہو کہ یہ لفظ دو معنوں میں مستعمل ہے:۔

(ا) وہمی اختراعی جس کا مطلب ہے ایک بے سر و پا یا من گھڑت بات جس کا منشا خارج میں کہیں موجود نہ ہو۔ مثلاً گدھے کے سینگ یا گھوڑے کے پر وغیرہ وغیرہ، بالفاظ دگر، موہوم بمعنی معدوم مستعمل ہے۔

کوئی صوفی کائنات کو اس معنی میں موہوم نہیں کہتا۔

(ب) وہمی واقعی یعنی وہ شئی جو اگرچہ خارج میں کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی مگر اس کا منشاء خارج میں موجود ہے جس سے اس کو منتزع کر لیتے ہیں مثلاً فوقیت کہ اس کا منشاء (آسمان) خارج میں موجود ہے۔

صوفیہ جب کائنات کو وہمی کہتے ہیں تو لفظ وہمی سے ان کی مراد، وہمی واقع

ہوتی ہے یعنی کائنات کا منشا، خارج میں موجود ہے اور وہ منشا، یا مصدر، ذاتِ حق ہے۔ جیسے شعلۂ جوالہ کو گردش دو تو دائرۂ آتشیں نظر آتا ہے اس دائرہ کا وجود وہمی واقعی ہے یعنی دیکھو تو ہے، غور کرو تو ... وہم ہے چنانچہ جب گردش رُک جاتی ہے تو دائرہ غائب ہو جاتا ہے ؎

ہمہ از وہم تست این صورت غیر
کہ نقطہ دائرہ است از سُرعتِ سیر (گلشنِ راز)

(۳) مکتوب پنجاہ و ہفتم جلد دوم صـ۹۶ میں فرماتے ہیں:۔

"عالم مرتبہ، وہم و حس میں ہے یعنی موہوم اور محسوس تو ہے مگر خارج میں اس کا کوئی نام یا نشان نہیں ہے۔ خارج میں صرف ذاتِ حق موجود ہے۔ اس کی مثال نقطۂ جوالہ اور دائرۂ موہوم ہے کہ دراصل صرف نقطۂ جوالہ موجود ہے دائرہ کا وجود وہمی ہے یعنی خارج میں معدوم ہے۔ نامے و نشانے در خارج ندارد۔ کوئی شئی غیر از حق جل و علا خارج میں موجود نہیں ہے!"

(۴) مکتوب شصت و ہفتم جلد سوم صـ۱۱ میں فرماتے ہیں:۔

"اس فقیر کا اعتقاد یہ ہے کہ یہ کائنات وہمی ہے اور جو صورتیں اور شکلیں اس کائنات میں نظر آتی ہیں یہ صور و اشکالِ ممکنات ہیں جنہوں نے صنعتِ خداوندی کی بدولت، مرتبۂ حس اور وہم میں، ثبوت حاصل کر لیا ہے"۔

(۵) مکتوب شصت و ہشتم جلد سوم صـ۱۱ میں فرماتے ہیں:۔

"میں جو اس عالم کو موہوم کہتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ عالم مجعول وہم ہے (ہمارے وہم کی تخلیق ہے) بلکہ اس سے میری مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم کو مرتبۂ وہم میں خلق کیا ہے!"

(۶) مکتوب صد و نہم جلد سوم صـ۱۹۸ میں فرماتے ہیں:۔

"ایجادِ عالم، مرتبۂ وہم میں ہے۔ مرتبۂ وہم سے مراد ہے نمود بے بود، یعنی یہ عالم نظر آتا ہے مگر درحقیقت موجود نہیں ہے، جیسے آئینہ میں کسی شخص کا عکس کہ محسوس و مشہود تو ہے مگر درحقیقت معدوم ہے۔ کشف صحیح اور شہود صادق دونوں سے ثابت ہے کہ حق تعالیٰ نے کمالِ قدرت سے عالم کو نمود بے بود عطا فرمائی ہے۔ چونکہ عالم اس مرتبہ میں مخلوق ہوا ہے اس لئے اسے نمودِ بے بود حاصل ہو گئی ہے۔ حق تعالیٰ میں یہ قوت ہے کہ وہ نمود کو بود (وجودِ حقیقی) عطا کر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ عالم وہمی نفس الامری ہے اور اسی لئے اس پر احکام و آثار بھی مرتب ہو گئے۔ درحقیقت ذاتِ احدیت کے سوا اور کوئی شئی موجود نہیں ہے"

(ح) علامہ حکیم سید برکات احمد صاحب ٹونکی مرحوم نے اس مسئلہ کی وضاحت میں ایک رسالہ فارسی زبان میں لکھا تھا جو طبع نہ ہو سکا۔ ہم اس رسالہ کے بعض مباحث ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ناظرین کی آگاہی کے لئے یہ صراحت لازمی ہے کہ حکیم صاحب شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی مرحوم کے بھانجے تھے اور معقولات (منطق، فلسفہ اور کلام) میں عدیم المثال تھے۔ جس پر انکی تصانیف جمۃ البازغہ شاہد ہے۔ فی الجملہ حکیم صاحب فرماتے ہیں:۔

"پہلے وحدت وجود کا مفہوم بیان کرتا ہوں، اس کے بعد اس پر براہین مرتب کروں گا۔ واضح ہو کہ حق تعالیٰ وجود مطلق ہے اور اسکے علاوہ اور کسی کو وجود حقیقی حاصل نہیں ہے۔ یہ کائنات اس کی صفات اور اس کے اسماء کا ظل اور عکس ہے۔ عالم کا وجود ظلی ہے۔ ممکنات اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہیں۔ ان کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ وہمی ہے یعنی انہیں وجود حقیقی کے ساتھ ایک گونہ نسبت حاصل ہو گئی ہے۔ مثلاً سایۂ شجر کہ اگرچہ بظاہر موجود ہے لیکن درحقیقت اُس کا

کوئی وجود نہیں ہے۔ اسکے باوجود سایہ کے ساتھ کچھ احکام و آثار مخصوص ہیں جن کا تعلق شجر سے نہیں ہے مثلاً سایہ حرکت کرتا ہے لیکن شجر اپنی جگہ قائم رہتا ہے اسی طرح ممکنات کے لئے کچھ احکام و آثار ہیں جو ذاتِ واجب کے لئے ثابت نہیں ہو سکتے۔ پس تمام ممکنات معدومۃ الذوات و معلومۃ الآثار ہیں اور وجودِ ظلی کا یہی معنی ہے کہ وہ معدوم الذات اور معلوم الآثار ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ چونکہ محض وجود خارجی ہے اس لئے خارج میں موجود ہے اور ممکنات (اشیاء) نہ وجودِ خارجی رکھتی ہیں اور نہ وجودِ ذہنی لیکن ثبوتِ علمی کے مقابلہ میں ان کو خارج میں وجودِ ذہنی حاصل ہے یعنی وجود اصلی و حقیقی جو وجود مطلق ہے اُن سے ایک گونہ نسبت رکھتا ہے جس کی وجہ سے اِن ماہیاتِ علمیہ کو موجود فی الخارج کہہ سکتے ہیں چنانچہ اسی اعتبار سے اظلال کو موجود فی الخارج کہہ سکتے ہیں۔

ان اظلال کو مظاہر بھی کہتے ہیں۔ وجودِ مطلق بحیثیت اطلاق، غیب میں ہے اور کسی پر ظاہر نہیں ہو سکتا مگر وہ تعینات میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسکی توضیح یہ ہے کہ وجودِ مطلق اپنی قدرتِ کاملہ سے اپنے ظلِ اسمی کو ثبوتِ علمی سے وجودِ خارجی میں لے آتا ہے یعنی اُس پر اپنا پرتوِ مجہول الکیفیۃ ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ ظل اپنی معدومیتِ ذاتی کے باوجود، ظاہر ہو جاتا ہے اس ترتبِ آثار کی وجہ سے اسے موجود کہہ دیتے ہیں۔ اس کی موجودیت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اس پر وجود حقیقی کا پرتو پڑ جاتا ہے۔ پس اس تعین میں وجودِ حقیقی کا ظہور ہو جاتا ہے اور اس طرح وجودِ حقیقی، ممکن کے لباس میں ظاہر ہو جاتا ہے

یہیں سے یہ معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ وجودِ مطلق ہے اور ممکنات اسکے اظلال و تعینات ہیں اور یہ دونوں باعتبارِ ذات، متغائر ہیں نہ تو ... کو ظل کہہ

سکتے ہیں اور نہ ظل کو اصل کہہ سکتے ہیں اور جس کسی نے ممکن کو لباسِ واجب کہا ہے تو اسی معنی میں کہا ہے کہ مرتبۂ احدیت غیب میں ہے۔ ہاں۔ اس کا ظہور، اظلال و مظاہر میں ہوا ہے۔ چونکہ اہلِ وحدۃ الوجود، ظہورِ واجب کی تعبیر، لباسِ ممکن سے کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ خود واجب، ممکنات میں ظاہر ہوا ہے بایں معنی کہ باطن میں واجب ہے ظاہر میں ممکن ہے اس لئے ظاہر بیں حضرات ان پر معترض ہوتے ہیں۔

جب ظاہر بیں حضرات، جو اہلِ وحدۃ الوجود کی اصطلاحوں سے بیگانہ ہیں حسب ذیل اشعار پڑھتے ہیں:۔

ز دریا موج گوناگوں برآمد　　ز بیچونی برنگِ چوں برآمد

گہے در کسوتِ لیلیٰ فرو شد　　گہے در صورتِ مجنوں برآمد

تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وجودیوں کا عقیدہ یہ ہے (اعوذ باللہ) کہ خود واجب تعالیٰ ممکن کے لباس میں پوشیدہ ہے حالانکہ یہ کفرِ صریح ہے۔ ظاہر بینوں کی غلطی کا مبنیٰ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قائلینِ وحدۃ الوجود، واجب کے علاوہ ممکن کو بھی موجود سمجھتے ہیں اور ممکن کا مستقل وجود تسلیم کرنے کے بعد پھر یہ کہتے ہیں کہ واجب، ممکن میں پوشیدہ ہے چونکہ یہ عقیدہ "حلول" پر دلالت کرتا ہے اور عقیدہ حلول کفر ہے اس لئے وہ اہلِ وحدۃ الوجود کو کافر قرار دیتے ہیں۔

لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ کوئی وجودی، ممکن کو موجود تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ ممکن بذاتہٖ معدوم ہے۔

حلول و اتحاد ایں جا محال است

کہ در وحدت۔ دوئی عین ضلال است

وجودی حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ ممکن بذاتہٖ معدوم ہے لیکن پرتوِ ہے واجب

کا۔ یعنی ممکن کچھ نہیں مگر واجب کا ظہور ہے۔ اس کی نہ کوئی اصل ہے نہ حقیقت ہے۔ اگر ہم ممکن کو بھی موجود تسلیم کریں تو یہ شرک فی الوجود ہے اور شرک فی الوجود اسی طرح کفر ہے جس طرح شرک فی الذات یا شرک فی الصفات یا شرک فی الحکم۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

جاں دوب لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
با گرد فرش وسبزہ بایوان برابر است

پس ثابت ہوا کہ من حیث الذات ممکن، واجب کا غیر ہے اور یہ غیریت دو اعتبار سے ہے۔ اول یہ کہ واجب ذات رکھتا ہے اور ممکن ذات نہیں رکھتا دوسرا یہ کہ واجب، وجود مطلق ہے۔ اور ممکن اپنی ذات سے معدوم ہے البتہ نسبت کے اعتبار سے ممکن کو بھی موجود کہہ دیتے ہیں ورنہ فی نفسہٖ اس کا وجود نہیں ہے۔

اسی لئے وجودی حضرات یہ کہتے ہیں کہ واجب اور ممکن میں ذات کے اعتبار سے غیریت ہے لیکن وجود کے اعتبار سے عینیت ہے یعنی ذات کا اعتبار کرو تو ممکن، واجب کا غیر ہے اور وجود کا اعتبار کرو تو وہی ممکن واجب کا عین ہے۔ چنانچہ سعدی کہتے ہیں:-

دوست نزدیک تر از من بمن است
ویں عجب تر کہ من از وے دورم

یعنی از روئے ظہور یا وجود، حق تو مجھ سے میری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ لیکن از روئے ذات، میں اس سے دور ہوں یعنی اس کا غیر ہوں یعنی وہ موجود ہے میں معدوم ہوں پھر کہتے ہیں:-

چہ کنم با کہ توان گفت کہ دوست
در کنار من و من مہجورم

لہ نحن اقرب الیہ من حبل

یعنی ظہور یا وجود کے اعتبار سے وہ ہر وقت میری آغوش میں ہے مگر اس کا ظہور اس کے لئے حجاب بن گیا ہے اس لئے میں اس سے دور ہوں۔

اب ہم عقیدہ وحدۃ الوجود پر براہین مرتب کرتے ہیں :-

مقدمہ اوّل :- تمام عرفاء و علماء و جمیع اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ حق تعالیٰ وحدہ لاشریک لہٗ ہے۔ اس کی ذات میں ہر قسم کی شرکت مستحیل ہے۔ خواہ شرکت فی الذات ہو یا فی الصفات یا فی الافعال کیونکہ شرکت مطلقاً افتقار و احتیاج سے پیدا ہوتی ہے اور یہ دونوں باتیں منافی وجوبِ ذاتی ہیں یعنی واجب الوجود کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

مقدمۂ دوم :- وجود حقیقی اور واجب تعالیٰ میں عینیت کی نسبت ہے۔ بایں معنیٰ کہ واجب نفس وجود حقیقی ہے یعنی واجب تعالیٰ بذات خود، وجود مطلق حقیقی ہے اور اس کے سوا دوسرا موجود نہیں ہے۔ وجود مطلق کی طبیعت ہی قابل اشتراک نہیں ہے۔ اگر اشتراک فرض کیا جائے تو واجب کا وجوب برقرار نہیں رہ سکتا۔ البتہ غیر کو اس اعتبار سے موجود کہہ سکتے ہیں لہٰذا اسے وجود حقیقی سے نسبت عارضی ہو گئی ہے۔

مقدمۂ سوم :- وجود مطلق سے اعم کوئی چیز نہیں ہے اس لئے کوئی شئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں ہے۔ وجود مطلق، واجب الوجود ہی میں منحصر ہے اور اس کے ماسوا جو کچھ متصور ہے معدوم ہے۔ اسی لئے وجود حقیقی کو عین واجب کہتے ہیں اور وہ تمام قیود سے بری ہے۔

مقدمۂ چہارم :- چونکہ واجب تعالیٰ وجود حقیقی ہے اور موجود حقیقی بھی ہے۔ اور وجود مطلق، واجب تعالیٰ میں منحصر ہے اس لئے تمام ممکنات معدومۃ الذات ہیں ممکنات کا ثبوت، مرتبہ علم میں ہے اسی لئے ان کو اعیانِ ثابتہ کہتے ہیں۔

صوفیہ وجودِ ظلی کو وجود نہیں کہتے بلکہ ثبوت کہتے ہیں اور اعیانِ ثابتہ نے وجود کی خوشبو بھی نہیں سونگھی ہے۔

مقدمۂ پنجم:۔ ظاہر اور مظہر میں مغائرت ضروری ہے چنانچہ جب حق نے درخت پر تجلی فرمائی تو نہ یہ ہوا کہ واجب تعالیٰ درخت ہو گیا اور نہ یہ ہوا کہ درخت واجب تعالیٰ ہو گیا بلکہ درخت اپنی حالت اصلی پر رہا مگر اس پر ایسی حالت طاری ہو گئی کہ اس سے اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ کی آواز پیدا ہو گئی اور کہنے والا اس کلمہ کا حق تعالیٰ تھا بلا حلول و سریان۔

مقدمۂ ششم:۔ حق تعالیٰ جب اپنی قدرتِ کاملہ سے کسی ماہیت پر تجلی فرماتا ہے تو وجود مطلق کے آثار اس ماہیت میں پیدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح وہ ماہیت خانۂ علمی سے باہر آ جاتی ہے اور جب وہ ماہیت موجود ہو جاتی ہے تو اس کو وجود اضافی کہتے ہیں۔ ماہیت فی نفسہا موجود نہیں ہوتی بلکہ وجود حقیقی سے نسبت کی بنا پر اسے موجود کہہ دیتے ہیں۔

مقدمۂ ہفتم:۔ وجود حقیقی جو ان مظاہر میں ظاہر ہوتا ہے، مظاہر سے مغائر بالذات ہوتا ہے کیونکہ ظاہر (حق) ذات رکھتا ہے اور مظاہر ذات نہیں رکھتے مگر بحیثیت وجود و ظہور عینیت رکھتے ہیں بایں معنی کہ مظاہر کا وجود بعینہٖ ظاہر کا وجود ہے اسی لیے صوفیہ فرماتے ہیں واجب اور ممکن دونوں من حیث الذات متغائر ہیں مگر من حیث الوجود والظہور عین یکدیگر ہیں۔

مقدمۂ ہشتم:۔ وجود حقیقی نے اپنا پرتو تمام ممکنات پر ڈالا ہے اور اس طرح انہیں لباس وجود عطا فرمایا ہے پس وجود مطلق ممکنات میں ظاہر ہوتا ہے اور اسی لیے عرفا کہتے ہیں کہ واجب تعالیٰ ممکن کے لباس میں ظاہر ہوا۔ مراد ان کی اس قول سے وہی ہے جو میں نے بیان کی وہ جو ظاہر میں سمجھتے ہیں کہ واجب

اور ممکن ایک ہوگئے، اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ خیال کفر صریح ہے ممکن کا وجود ہی کہاں ہے جو دونوں کے ایک یا متحد ہوجانے پر حکم لگایا جائے؟ صوفیہ یہ نہیں کہتے کہ یہ کائنات، جلوۂ ذات ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جلوۂ ذات یہ کائنات ہے پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزیں موجود ہیں اور پھر دونوں ایک ہوگئیں مگر یہ قول تو کفر صریح ہے۔ دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک ذات (حق) موجود ہے اور جسے تم کائنات کہتے ہو یہ بذاتِ خود کچھ نہیں ہے، محض اس کا جلوۂ ذات ہے یعنی وہ خود ظاہر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم فرماتا ہے:۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔

مقدمۂ سوم:۔ پس تمام موجودات، مظاہر اسماءِ حسنیٰ ہیں۔ جب حق تعالیٰ بحکم کل یوم ھو فی شان اپنی صفاتِ کمالیہ میں سے کسی صفت کو ظاہر فرماتا ہے تو اس صفت سے اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک اسم پیدا ہوجاتا ہے اور اس اسم سے اس کی صورتِ علمیہ پیدا ہوتی ہے۔ پس صفت مُربّیِ اسم ہے اور اسم مُربّیِ صورتِ علمیہ ہے جسے اصطلاح میں عینِ ثابت کہتے ہیں۔ اور صورتِ علمیہ سے وجودِ اضافی پیدا ہوجاتا ہے۔

یہ ہے تقریر مذہب صوفیہ کی۔ اب جاننا چاہیئے کہ اس طائفۂ مقدسہ کے مذہب کی بنیاد تین مقدمات پر ہے:۔

مقدمۂ اولیٰ:۔ واجب تعالیٰ وجود مطلق حقیقی ہے۔ وجود میں نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ شرکت کا امکان ہی نہیں ہے

مقدمۂ ثانیہ:۔ تمام ممکنات معدوماتِ عینیہ ہیں کیونکہ وہ ماہیات ہیں اور ماہیات کے لئے وجود عینی ممکن ہی نہیں ہے۔

مقدمۂ ثالثہ:- تمام موجودات، مظاہر اسماءِ حسنیٰ ہیں حق تعالیٰ کے
اسماءِ حسنیٰ کا ظہور ان مظاہر میں ہوا ہے۔

یہ مقدمات محض عقلی نہیں ہیں نقل (قرآن) سے بھی ثابت ہیں۔ لہٰذا
ذیل میں نصوص قرآنی بھی درج کی جاتی ہیں:-

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ وجود مطلق حقیقی ہے اور وجود میں کوئی
اس کا شریک نہیں ہے۔ اس مقدمہ کے دو جزو ہیں۔ پہلا جزء اس آیت سے
ثابت ہے:-

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ
اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ
مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ
لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ط يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۲۴:۳۵)

اس آیت کی ابتدا اس بات پر نص ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا
نور ہے۔ نور، اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور اس کا اطلاق ضوٗ
(روشنی)، علم اور وجودِ اضافی پر ہوتا ہے کیونکہ نور کا لغوی حقیقی معنی یہ ہے
کہ نور خود ظاہر ہوتا ہے۔ اور دوسرے کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ ضوٗ اور علم
اور وجودِ اضافی، معنیٔ حقیقت سے نسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے نور
کا اطلاق ان اشیاء پر بھی کیا جاتا ہے۔ ضوٗ پر اس لئے کہ اگر ضوٗ نہ ہوتی تو تمام
محسوسات ظلمت میں مستور رہتیں۔ اور علم پر اس لئے کہ اگر علم نہ ہوتا تو کسی
چیز کا ادراک نہ ہوتا۔ اور وجود اضافی پر اس لئے کہ اگر وجود اضافی نہ ہو تو تمام
اشیاء اپنی ذات کے اعتبار سے ظلمتِ عدم میں ہوتیں لیکن ظاہر ہے
کہ تینوں معانی یہاں مستقیم نہیں ہیں۔

معنی اوّل :- ظاہر ہے کہ ضوء ایک مادی کیفیت ہے جو اجسام مادی میں پائی جاتی ہے اور واجب تعالیٰ مادہ سے منزہ ہے۔

معنی دوم :- سیاق کلام اس سے انکار کرتا ہے۔

معنی سوم :- واجب تعالیٰ وجود حقیقی ہے نہ کہ اضافی۔

پس نور اس آیت میں لغوی معنی میں مستعمل ہے یعنی ظاہر لذاتہ اور مظہر لغیرہ۔ اور چونکہ یہاں معنی حقیقی صحیح ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ لغوی حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی لئے جائیں اور جس کا وجود لذاتہ ہے اس کا ظہور بھی لذاتہ ہوگا۔ اور چونکہ واجب تعالیٰ وجود لذاتہ ہے اور تمام اشیاء اعدام ہیں اسلئے واجب تعالیٰ بذات خود ظہور سموات والارض ہے یعنی سماویات، علویات اور سفلیات میں ظاہر ہو رہا ہے

نور کی اس مثال کے بعد اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا کہ ایک طاق فرض کرو جس میں ایک زجاج ہے اور اس میں مصباح ہے اور وہ مصباح، روشن ہے زیتون کے اس مبارک درخت کے تیل سے جو نہ شرقی ہے نہ غربی غور سے دیکھو تو صرف ایک نور ہے جو شجر مبارکہ سے فائز ہوتا ہے لیکن چونکہ مصباح سے متعلق ہے اس لئے اس کا نام نور مصباحی ہوگیا اور چونکہ زجاج تک راہ پا گیا اس لئے نور زجاجی نام ہوگیا اور جب طاق میں پہونچا تو نور مشکوٰۃ نام ہوگیا۔ اگرچہ ظاہر میں تو کئی نور نظر آتے ہیں مگر دراصل وہ ایک ہی نور ہے۔ جو متعدد ہوگیا ہے یعنی اشیاء مختلفہ سے متعلق ہوجانے کی وجہ سے اسکے نام مختلف ہو گئے ہیں، اسی طرح سے خدا تعالیٰ ایک ہی نور اور ایک ہی وجود ہے مضاف الیہ کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوگیا ہے اور قرینہ اس بات کا کہ حق تعالیٰ نے شجر مبارکہ سے اپنی ذات مراد لی ہے۔ یہ جملہ ہے :-

"لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ" یعنی وہ وجود مطلق، جہات میں سے کسی جہت میں

مقید نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام علویات و سفلیات کا نور ہے اور ان میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سمٰوات اور ارض و کائنات کو بذات خویش نور حاصل نہیں ہے۔ وہی واحد حقیقی ساری کائنات کو منور کر رہا ہے، البتہ مضاف الیہ کے تعدد سے تعدد اضافی راہ پا گیا ہے جو وحدت حقیقی میں مخل نہیں ہو سکتا۔ پس مقدمۂ اولیٰ کا پہلا جزء قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ وجود مطلق ہے اور اسی کو وجودِ حقیقی حاصل ہے۔ عالم کا وجود اضافی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ توحید اسرارِ الٰہی میں سے ایک سر ہے جس کی صراحت نہیں ہو سکتی۔ صرف مثال سے سمجھا سکتے ہیں۔

مقدمۂ اولیٰ کا دوسرا جزء مرتبۂ احدیت "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" سے ثابت ہے۔ احدیت اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب کثرت کا شائبہ نہ ہو خواہ کثرت ثنائیہ ہو یا اسمائیہ یا صفاتیہ۔ کیونکہ مرتبۂ احدیت میں شئون و اسماء و صفات قہرِ احدیت کی وجہ سے مرتبۂ احدیت میں مستہلک اور مندمج ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ شیخ اکبر نے قل ہو اللہ احد کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ہُویت، عینِ احدیت ہے کوئی دوسرا احد نہیں ہے کیونکہ ہویت میں شرکت محال ہے۔

اس کے بعد فرمایا "اَللّٰهُ الصَّمَدُ" یعنی اللہ کی طرف استناد کی حیثیت سے، غیر اللہ جو کچھ بھی ہے، سب اس کی طرف مستند ہے۔ ظہورِ کثرت اسی واحد حقیقی کے ظہور کی وجہ سے ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شئی نہیں جس سے کثرت منسوب کی جائے

اس کے بعد ولایت اور والدیت کی نفی کے لیے فرمایا "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" یعنی کسی شخص کو اللہ تعالیٰ سے بواسطۂ والدیت یا ولدیت کوئی نسبت حاصل نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تو امکان کی خصوصیات میں سے ہے۔ واجب تعالیٰ ان

تمام مادی جسمانی نسبتوں سے پاک ہے۔ بلکہ واجب اور ممکن میں نمایاں ترین فرق یہی ہے کہ واجب "لم یلد ولم یولد" کا مصداق ہے اور ممکن (انسان) کسی کا باپ ہے اور کسی کا بیٹا ہے۔

آخر میں فرمایا "ولم یکن لہ کفوا احد"، یعنی ہر شخص کبھی نہ کسی کا ہمسر یا شریک کار یا مدمقابل ہوتا ہے مگر کوئی ہستی اس کی مدمقابل یا ہمسر نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ واجب ہے اور اسکے سوا جو کچھ ہے وہ از قبیل ممکن ہے۔

مقدمہ ثانیہ کا ثبوت:۔ اس کے لئے قرآن حکیم کی اس آیت میں غور کرنا چاہیئے کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ یعنی حق تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ہر شئی ہالک ہے۔ ہالک کا مفہوم یہ نہیں کہ اشیاء زمانہ مستقبل میں ہلاک (معدوم) ہوں گی، بلکہ تمام اشیاء بالفعل معدوم ہیں کیونکہ علم صرف کا قاعدہ یہ ہے جو علوم عربیہ میں مسلم ہے کہ مشتقات معنی حال میں حقیقت ہیں اور معنی استقبال میں مجاز ہیں پس ہالک کا یہ معنی لینا کہ اشیاء آئندہ زمانہ میں ہلاک ہوں گی مجاز کی طرف جاتا ہے حالانکہ حقیقی معنی لینے میں کوئی استحالہ لازم نہیں آتا۔ پس آیۂ شریفہ کا معنی یہ ہے کہ ہر شئی بالفعل معدوم ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

"اَصْدَقُ کَلِمَۃٍ قَالَھَا الْعَرَبُ اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللہَ بَاطِلٌ"، یعنی سب سے زیادہ سچی بات جو کسی عرب کی زبان سے نکلی یہ ہے کہ خبردار ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا ہر شئی باطل ہے اور بطلان کا معنی عدم الذات ہے یعنی اللہ کے سوا ہر شئی فی ذاتہ معدوم اور فی نفسہ باطل ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لیس دعی نام شیئ اور شئی عرف متشرعہ میں بمعنیٰ وجود ہے۔ یعنی اے اللہ!

تیرے سوا کوئی شئی موجود نہیں ہے۔

مقدمۂ ثالثہ کا ثبوت:۔ یہ اس حدیث سے ثابت ہے:۔

إنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدمَ علیٰ صُوْرَتِہٖ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ لیکن یہاں صورت سے شکل مراد نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ مادی نہیں ہے۔ لہٰذا صورت سے وجود مراد لی جائے گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنے وجود پر پیدا کیا۔ یا صورت سے صفات مراد ہونگی یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو مظہرِ صفات خود بنایا ہے۔ اور اصحاب کشف و شہود نے اس حقیقت کا ادراک کیا ہے کہ عالم عبارت ہے تجلیات حق سے مظاہر ممکنہ میں اور تمام عرفا کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ کے سوا کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ وجودِ مطلق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے معدوم ہے۔ حضرت موصوفؒ نے شیخ اکبرؒ سے صرف ماہیات ممکنات میں اختلاف کیا ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ

(۱) شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ حقائق ممکنات، اسماء و صفات ہیں۔ اگر اسماء کی تجلی نہ ہوتی تو حقائق ممکنات، مخفی رہتے۔

(۲) حضرت مجددؒ یہ فرماتے ہیں کہ حقائق ممکنات، اسماء و صفات کے عکوس و اظلال ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ وحدت وجود میں دونوں متفق ہیں۔ اگر اختلاف ہے تو ممکن کی ماہیت میں ہے یعنی جس کو حضرت مجددؒ اعدام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کو شیخ اکبرؒ اعیانِ ثابتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا اہل وجود اور اہل شہود میں فقط نزاع لفظی ہے۔

شیخ اکبرؒ کہتے ہیں کہ اعیانِ ثابتہ پر اسماء و صفات کی تجلی ہوئی تو عالم موجود

ہو گیا۔ حضرت مجددؒ کہتے ہیں کہ اعدام متقابلہ پر اسماء و صفات کی تجلی ہوئی عالم موجود ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے۔ نفسِ مسئلۂ وحدتِ وجود میں دونوں متفق ہیں۔

میں نے وحدۃ الوجود کی تشریح اس لئے سپردِ قلم کی ہے کہ قارئین کرام کو یہ معلوم ہو جائے کہ اقبالؔ نے جو اپنی تمام تصانیف میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے تو یہ تعلیم بقول شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ عینِ اسلام ہے۔ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے اور اُمتِ اسلامیہ کے تمام عرفاء کا اس پر اجماع ہے۔

یہ تصریح اس لئے بھی ضروری ہے کہ آجکل بعض مسلمان اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وحدۃ الوجود کی تعلیم غیر اسلامی ہے۔ ان لوگوں کو یہ غلط فہمی اسلئے پیدا ہوئی کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ غیر مسلموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ یونان، ہندوستان، ایران اور یورپ کے بعض حکماء نے بھی وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے مگر اسکی جو تعبیر انہوں نے پیش کی ہے وہ غیر اسلامی ہے بعض مسلمان اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اقبالؔ یا حضرت مجددؒ یا شاہ ولی اللہؒ یا رومیؒ یا جامیؒ یا شیخ اکبرؒ نے غیر مسلموں کے خیالات سے استفادہ کیا ہے یا انہی کی تعبیر اختیار کر لی ہے لیکن حقیقتِ حال اسکے خلاف ہے۔ حضرات صوفیہؒ نے اس کی وہ تعبیر پیش کی ہے جو قرآن اور حدیث پر مبنی ہے اس لئے عینِ اسلام ہے اور اور اقبالؔ نے انہی اکابرِ اُمت کی پیروی کی ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

شنیدم آنچہ از پاکانِ اُمت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

اب ہم اس فصل کی شرح ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:-

واضح ہو کہ اس فصل کے پہلے پانچ اشعار کا مطلب تمہید کے آغاز میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں ربط کلام کے لئے اس کا خلاصہ بیان کئے دیتا ہوں:۔

کہتے ہیں کہ اے افغان! تو اپنی حقیقت سے بے خبر ہے اسلئے تیرا فرض یہ ہے کہ اپنے آپ کو پہچان یعنی اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں سے آگاہی حاصل کر۔ ضرب کلیم میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔

ع اپنی خودی پہچان! او غافل افغان!

تعلیماتِ اسلام کی روح یہ ہے کہ جو شخص اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے وہ دنیا میں حکمران ہو جاتا ہے۔ دین اسلام نام ہی ہے اپنی "خودی" کی پوشیدہ طاقتوں سے آگاہی حاصل کرنے کا۔ جو شخص اپنی خودی سے واقف نہیں وہ دراصل مُردہ ہے۔ قرآنی تعلیمات کی رُو سے اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔

جو مسلمان اپنی خودی سے آگاہ ہو جاتا ہے اس میں حسبِ ذیل صفات پیدا ہو جاتی ہیں:۔

(۱) اس میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ میں خلیفۃ اللہ یعنی اشرف المخلوقات ہوں یعنی کائنات میں مجھ سے برتر ہستی کوئی نہیں ہے۔

(۲) وہ کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے یعنی اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے، لہٰذا یہ کائنات اس قابل نہیں ہے کہ اسے مقصودِ حیات بنایا جائے، بالفاظِ دگر، چونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی شئی حقیقی معنیٰ میں موجود ہی نہیں ہے اسلئے صرف اللہ تعالیٰ ہی میرا مقصودِ حیات ہے۔ یعنی جب ایک مسلمان پر یہ صداقت آشکار ہو جاتی ہے کہ

لا موجود الا اللہ

تو وہ ماسویٰ اللہ سے قطع نظر کر کے اللہ ہی کو اپنا مطلوب اور مقصود بنا لیتا ہے یعنی حقیقی معنی میں موحد بن جاتا ہے۔ سعدیؒ نے اس شعر میں اسی مضمون کو باندازِ دگر بیان کیا ہے:-

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عاشقاں جز خدا ہیچ نیست

(۳) اس کی شہرت ساری کائنات میں ہو جاتی ہے اور یہ وسیع کائنات اس کے قلب کے ایک گوشہ میں سما جاتی ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس شعر کی صداقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے مثلاً شیخ شیوخِ عالم حضرت اقدس بابا فریدالدین گنج شکر چشتی اجودھنی رحمۃ کی زندگی کا مطالعہ کرو۔

(ا) حضرت کے وصال کو سات سو برس گزر چکے ہیں مگر آنجناب کا نام نامی آج بھی چار دانگِ عالم میں مشہور ہے۔

(ب) جب سلطان غیاث الدین بلبن نے چار گاؤں کی معافی کا پروانہ ان کی خدمت میں بھجوایا تو انہوں نے اس کاغذ کے ٹکڑے کو چاک کر کے ایلچی کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا "بادشاہ سے کہہ دینا کہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس کی وجہ یہ تھی کہ "نہ سپہر در پناہ او، آوارہ بود" ان کے قدموں میں تو ساری کائنات سربسجود تھی وہ چار گاؤں لیکر کیا کرتے؟

(۴) اس کے بعد اقبالؒ کہتے ہیں کہ بندہ حق داں مسلمانے کہ بیند خویش را، تو مغیبوں کا وارث ہوتا ہے وہ دوسروں کی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں رہتا وہ تو اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔

(۵) وہ غیر حق سے بکلی قطع نظر کر لیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ غیر حق کا

وجود ہی نہیں ہے تو اُس سے رابطہ یعنی چہ؟

(۶) ع پائے او محکم بہ زمِ خیر و شر او

اس دنیا میں شروع سے خیر و شر میں جنگ ہو رہی ہے یعنی انبیاء، انسانوں کو نیکی کی طرف بُلاتے ہیں اور ابلیس اُن کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر بندۂ حق ذکر اور فکر کی بدولت ابلیس کا مقابلہ کرتا ہے اور کسی موقع پر بھی اس کے قدموں کو لغزش نہیں ہوتی۔

وہ ذکر کی تلوار سے ابلیس پر حملہ کرتا ہے اور فکر کی ڈھال پر اس کے حملوں کو روکتا ہے۔ یعنی ذکر الٰہی سے اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ابلیس پر حملہ کرتا ہے اور فکر کی بدولت اس کے پیدا کردہ وساوس کو دفع کرتا ہے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ کے نظامِ فکر میں ذکر اور فکر کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ انہی دو قوتوں کے اختلاط سے مسلمان میں شانِ فقر پیدا ہوتی ہے اور فقر کی تعلیم اقبالؔ کے فلسفہ کی روح ہے۔ یعنی اقبالؔ نے اپنی تمام تصانیف نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ:-

(۱) مسلمان کا مقصدِ حیات، اعلائے کلمۃ الحق ہے یعنی دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا تاکہ بنی آدم، اللہ کے قانون کی اتباع کر سکیں۔

(ب) حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ مسلمان اپنے اندر شانِ فقر پیدا کریں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے اندر یہی شانِ فقر پیدا کر دی تھی اور خلفائے راشدینؓ اس شان کے بہترین مظہر ہیں۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صفت پر فخر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "الفقر فخری" یعنی میں اپنی زندگی میں جس بات پر فخر کر سکتا ہوں، وہ فقر ہے۔

اس سے فقر کی عظمت اور قدر و قیمت واضح ہو سکتی ہے۔

(ج) یہ شانِ فقر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مسلمان اپنی زندگی میں ذکر اور فکر کا صحیح اختلاط پیدا کر لیں۔ چنانچہ اقبالؔ کہتے ہیں:۔

جز بقرآں ضیغمی روباہی است　　فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

فقرِ قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر؟　　فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

(جاوید نامہ)

چونکہ مثنوی "پس چہ باید کرد" میں اقبالؔ نے فقر پر ایک مستقل باب باندھا ہے اور میں اُس مقام کی شرح میں فقر کی پوری تشریح درج کروں گا اس لئے یہاں تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں کہ مومن ذکر اور فکر کی بدولت ابلیس کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتا ہے اور کسی مرحلہ پر اس کا قدم صراطِ مستقیم سے نہیں ڈگمگاتا۔

(۷) ساتویں صفت "بندۂ حق" میں یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زمان و مکان پر غالب آجاتا ہے اور یہ ساری کائنات اس کا طواف کرنے لگتی ہے یعنی اس کی مطیع ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے بندۂ حق یا مومن کی جو صفات بیان کی ہیں وہ اس قدر فوق العادت اور محیر العقول ہیں کہ اس دورِ مادیت میں ان کی صداقت پر یقین لانا بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر ایک شخص بزرگانِ دین کی صحبت اختیار کرے

لہ اسی لئے اقبالؔ نے اپنی تمام تصانیف میں بزرگانِ دین (اولیاء اللہ) کی صحبت اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر

علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

اور ان بزرگوں کی ہدایت پر عمل بھی کرے تو بفضلِ خدا اس کے اندر کم و بیش یہ تمام صفات پیدا ہو سکتی ہیں۔

بندۂ حق (عارف کامل) کی صفات بیان کرنے کے بعد اپنے دعاوی کی صداقت پر قرآن حکیم سے استشہاد کرتے ہیں:۔

مصرع
شاہد آمد بر عروج او کتاب

یعنی اے مخاطب! میں نے بندہ حق (آنکہ خود را دیدہ است) کی جو کیفیت بیان کی ہے بالفاظِ دگر اس کے روحانی عروج کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی صداقت پر خود قرآن عظیم گواہی دے رہا ہے۔ ذیل میں چند آیات لکھتا ہوں:۔

(۱) اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں (بندگانِ حق) کو نہ تو (آیندہ زندگی کے متعلق) خوف ہوگا اور نہ (گذشتہ زندگی پر) افسوس ہوگا۔

قرآن حکیم نے بندگانِ حق کی یہ شناخت بتائی ہے کہ وہ خوف اور غم دونوں سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عام طور سے ہر شخص انہی دو آفتوں میں مبتلا ہے:۔

(۱) چونکہ وہ اللہ کے قانون سے منحرف رہتا ہے اور نفسِ امارہ کی پیروی کرتا رہتا ہے اس لئے تحت الشعور میں اُسے ہر وقت عاقبت کا خوف دامنگیر رہتا ہے کہ مرنے کے بعد جب خدا کے سامنے جانا ہوگا تو کیا جواب دوں گا؟

(۲) چونکہ وہ اپنے آپ کو خالقِ حقیقی اور مدبر الامور سمجھتا ہے اسلئے جب کبھی اس پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یا اسے مالی نقصان پہونچتا ہے تو محزون اور ملول ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر بندۂ دنیا ہر وقت دو بلاؤں میں گرفتار رہتا ہے۔ زمانہ گذشتہ کے مصائب اور نقصانات پر حزن اور زمانہ آیندہ میں بازپرس

کا خوف، لیکن بندہ حق (آں مسلمانے کہ خویش را دیدہ است) کو اس بات پر یقین کامل ہوتا ہے کہ

(۱) عزت اور ذلت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ (۳ - ۲۶)

آپ کہہ دیجئے کہ مجھے تو یہ تعلیم دی گئی ہے:۔ اے اللہ تو ملک (کائنات) کا مالک ہے تو جسے چاہتا ہے حکومت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے تو عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ذلت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ سب بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے یعنی مدبر الامور اور منتظم کائنات صرف تو ہے۔

(۲) اللہ جسے چاہتا ہے بافراغت رزق دیتا ہے یعنی فارغ البالی اور آسائش دنیوی عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگی روزی دیتا ہے یعنی اسباب معیشت کی فراخی اور تنگی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان لاکھ کوشش کرے مقدر سے زیادہ نہیں مل سکتا۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ (۲۹-۶۲)

اللہ ہی کشادہ کرتا ہے روزی جس کے لئے چاہے، اپنے بندوں میں سے اور کم کرتا ہے (روزی) جس کے لئے چاہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر بیان کیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کے دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے مثلاً

۱-۲۶، ۱۷-۳۰، ۳۰-۳۷، ۳۴-۳۶، ۳۹-۵۲۔

(۳) یہ تمام نظام عالم اس کے قبضۂ قدرت اور حیطۂ اقتدار میں ہے!

(الف) لَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى۔ (۶-۳۵)

اگر اللہ چاہتا تو سب انسانوں کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں چاہا بلکہ یہ آزمانا چاہا کہ کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں لاتا۔

(ب) لَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْمَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ۔ (۵-۴۸)

اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک مذہب پر جمع کر دیتا مگر اس لئے نہیں کیا کہ وہ تمہیں آزمائے اُن چیزوں میں جو اُس نے تمہیں دی ہیں پس تم نیک کاموں کی طرف سبقت کرو

(ج) يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ۔ (۴۲-۴۹، ۵۰)

اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں دونوں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بیشک علیم اور قدیر ہے۔

(۴) اللہ جسے چاہے حکمت دے جسے چاہے اپنی رحمت سے نوازے اور جسکے چاہے درجات بلند کر دے اور جس پر چاہے اپنا فضل کرے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ (۲-۲۶۹)

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (۶-۸۳)

يُدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ (۷۶-۳۱)

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (۵-۵۴)

(۵) دنیا میں جس فرد یا جماعت پر کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے وہ

کے حکم اور اس کی مشیئت سے آتی ہے۔ لہذا بندۂ حق ہر مصیبت پر سر تسلیم خم کرتا ہے اور زبانِ حال سے کہتا ہے۔

ع آنچہ از دوست می رسد نیکو ست

اس لئے وہ واقعات ماضی پر بھی حزن و ملال کا اظہار نہیں کرتا۔

(۱) مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۚ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ (۵۷ — ۲۳)

خشک سالی، قحط، وبا یا سیلاب کی وجہ سے جو مصیبت زمین میں رونما ہوتی ہے اور افلاس، نقصانِ جان و مال، امراض، جدائی کے صدمات، زوالِ عزت و جاہ، حوادثِ روزگار اور ناگہانی واقعات یا غیر متوقع انقلاب کی بنا پر جو مصیبت تمہاری جانوں پر واقع ہوتی ہے، مختصر یہ کہ جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے، خواہ اس کا تعلق تمہاری ذات سے ہو یا کائنات سے، یہ سب امور اور حوادث اپنے ظہور سے مدتوں قبل ایک کتاب میں مندرج (علم الٰہی میں مقدر) ہو چکے ہیں اور یہ بات (یعنی قبلِ تخلیقِ عالم، تمام حوادث اور واقعات کو مقدر کر دینا) ہمارے لئے آسان ہے (کیونکہ ہم عالم الغیب والشہادۃ بھی ہیں اور علیم و حکیم بھی ہیں۔ ہماری ذات کی طرح ہمارا علم بھی ازلی ہے اسلئے ہم پہلے جانتے ہیں پھر پیدا کرتے ہیں) ہم نے یہ بات اسلئے کھول کر بیان کر دی، تاکہ تم غم نہ کرو ان چیزوں پر جو تم سے جاتی رہیں مثلاً دولت، عزت، ثروت، حکومت، جائداد، باغات، محلات، انبارِ زر و سیم وغیرہ وغیرہ اور جو نعم اللہ تمہیں اپنی مشیئت کے مطابق عطا فرمائے ان پر فخر نہ کرو (کہ یہ ہماری دانائی یا ہماری ذاتی قابلیت سے ہمیں حاصل ہوئی ہیں) خلاصۂ کلام اینکہ جس چیز کا تم سے فوت ہو جانا یا زائل ہو جانا مقدر ہے وہ بہر حال جاکے رہیگی کہ اور جس چیز کا ملنا مقدر ہے وہ بہر صورت

تمہیں مل کے رہے گی لہٰذا ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر اپنے جذبات اور اپنی قرابت کو قربان کر۔

(ب) قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ج هُوَ مَوْلٰنَا ج (۹ – ۵۲)

(اگر آپ پر کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے تو منافقین یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو دور اندیشی سے کام لیکر پہلے ہی سے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا تھا، آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ ہم پر ہرگز کوئی مصیبت وارد نہیں ہوگی مگر وہی (مصیبت) جو اللہ نے ہمارے لئے مقدر کر دی ہے، وہی ہمارا کارساز ہے۔

(ج) قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ہ (۳ – ۱۵۴)

(منافقین کہتے ہیں کہ اگر ہمارا مشورہ مان لیا جاتا۔ یعنی کوہ احد کے دامن میں صف آرا ہونے کے بجائے مدینہ ہی میں رہ کر جنگ کی جاتی تو جو لوگ جنگ احد میں شہید ہوئے وہ ہرگز شہید نہ ہوتے) آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے اپنے گھروں میں رہتے تو بھی جن لوگوں کی تقدیر میں قتل ہونا لکھا جا چکا تھا، وہ لوگ یقیناً اپنے گھروں سے نکل کر اپنی قتل گاہوں میں پہونچ جاتے۔

ان نصوص صریحہ کی روشنی میں بندۂ حق ہمیشہ حق تعالیٰ کی مشیئت کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے اور کسی مصیبت یا نقصان پر محزون نہیں ہوتا اور چونکہ وہ کوئی کام حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہیں کرتا اس لئے اسے قیامت میں باز پرس کا بھی کوئی خوف نہیں ہوتا۔

یہ ثابت ہو چکا کہ بندۂ حق خوف اور حزن دونوں سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اب دوسری آیت لکھتا ہوں:۔

(ب) يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ہ (۸۹ – ۳۰)

اے وہ شخص جس نے ہماری مشیئت کا ملہ پہ ایمان لا کر اپنے دل میں اطمینان کی کیفیت پیدا کر لی ہے، اپنے رب کی طرف واپس آجا اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے پس میرے بندوں میں شامل ہو جا (اور زمرۂ عباد اللہ میں شامل ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ) میری جنت میں داخل ہو جا (جو میں نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہے)۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ آیت شریفہ کتنے واضح الفاظ میں مومن (بندۂ حق) کے روحانی عروج کا اعلان کر رہی ہے) اس سے بڑھ کر اور کونسا عروج متصور ہو سکتا ہے کہ حق تو اپنے بندے سے راضی ہو جائے اور اسے اپنی جنت میں داخل کر کے اپنا قرب عطا فرما دے؟

ایک آیت اور درج کئے دیتا ہوں:-

(ج) إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝ (۱۶-۱۲۸)
بیشک اللہ ساتھ ہے اُن لوگوں کے جو متقی ہیں اور محسن ہیں۔

بندۂ حق، متقی بھی ہوتا ہے اور محسن بھی۔ اس لئے اسے اللہ تعالیٰ کی معیّت نصیب ہو جاتی ہے اور یہ حقیقت اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہو جائے تو اس کے عروج میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ جس شخص کو دنیاوی بادشاہوں کی معیت حاصل ہو جاتی ہے وہ بادشاہوں کی سی زندگی بسر کرنے لگتا ہے مثلاً:-

(ا) تمام وہ لوگ جو اس بادشاہ سے ڈرتے ہیں یا اس کی عزت کرتے ہیں اس شخص سے بھی ڈرتے ہیں یا اس کی عزت کرتے ہیں۔

(ب) بادشاہ جس قصر رفیع میں رہتا ہے یہ شخص بھی وہیں رہتا ہے اور جو کچھ وہ کھاتا ہے وہی اس شخص کے بھی حصہ میں آتا ہے۔

اسی پر قیاس کر لیا جائے کہ جس شخص کو حق کی معیت نصیب ہو جائیگی کیا وہ زمان و مکان پر حکمراں نہیں ہو جائے گا؟[1] کیا دریائے نیل اس کی اطاعت نہیں کرے گا؟[2] کیا بادشاہانِ عالم اس کی تحریر پڑھ کر لرزہ براندام نہیں ہو جائیں گے؟[3] جس کے لیے اس کی زبان سے بادشاہ کا لفظ نکل جائیگا کیا وہ بادشاہ نہیں ہو جائے گا؟[4] جس کے سر پر وہ اپنا عمامہ باندھ دیگا کیا وہ تخت و تاج کا مالک نہیں بن جائے گا؟[5]

---

[1] اشارہ ہے حضرت علی مرتضیٰؓ کی طرف۔ ایک مرتبہ ان کی نمازِ عصر قضا ہو گئی۔ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وقتِ عصر واپس آ جائے چنانچہ ان کی دعا مقبول ہوئی اور اُنہوں نے اپنی نماز ادا کی ۱۲

[2] اشارہ ہے حضرت فاروق اعظمؓ کی طرف۔ اُنہوں نے اہلِ مصر کی استدعا پر ایک کاغذ پر یہ لکھا کہ اے دریا! اگر تو اللہ کے حکم سے بہتا ہے تو میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو بدستور بہتا رہ تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ چنانچہ دریا جاری ہو گیا ۱۲

[3] اشارہ ہے حضرت بو علی شاہ قلندرؒ پانی پتی کی طرف۔ حضرت موصوف نے سلطان علاؤالدین خلجی کو لکھا تھا کہ پانی پت کے عامل کو فوراً یہاں سے ہٹا دو ورنہ ہم تمہیں تخت سلطنت سے ہٹا دیں گے اور تمہارے بجائے دوسرے آدمی کو بادشاہ بنا دیں گے۔

باز گیر ایں عاملِ بدگوہرے
ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے

[4] اشارہ ہے سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی طرف۔ ایک دن ان کی مجلس میں ایک شخص آیا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ رخصت ہوا تو دوسرا آدمی آیا۔ اُنہوں نے حاضرین مجلس سے کہا "بادشاہے رفت و بادشاہے آمد" چنانچہ آگے چل کر یہ دونوں شخص بادشاہ ہو گئے (باقی بر صفحہ ۵۴)

بندۂ حق کے صفات بیان کرنے کے بعد پھر اس قوم کے افراد سے خطاب کرتے ہیں:۔۔

اندکے گم شو بقرآں و خبر
باز اے ناداں بخویش اندر نگر

اے سرحدی مسلمان! قرآن اور حدیث کا مطالعہ کر کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے کیا تعلیم دی ہے اور اسکے بعد اپنی حالت زار کو دیکھ کہ تو اس دنیا میں کس قدر آشفتہ حال (آوارہ) اور بیچارہ ہے۔ چونکہ تو نے وحدت ملی کو پارہ پارہ کر دیا ہے اسلئے تو غیر اللہ کا غلام ہو گیا ہے۔ تیری پیشانی پر غلامی کا داغ دیکھ کر میرے دل میں داغ پڑ گئے ہیں۔ اسلئے میں تجھے مرشد رومیؒ کی تعلیمات سے آگاہ کرتا ہوں، شاید تیرے دل میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ مرشد رومیؒ فرماتے ہیں:۔

(۱) اے مسلمان! انسانوں کے بجائے خدا سے رزق طلب کر۔ تو اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ رزق انسانوں کے ہاتھ میں ہے، حالانکہ رازق حقیقی اللہ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے:۔۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳:۔ ۵۔ اشارہ ہے حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ کی طرف ہے جن کا مزار گلبرگہ (دکن) میں ہے۔ ایک دن سلطان فیروز بہمنی ان کی خدمت میں آیا کہ میرے لڑکے کے لئے دعا فرمایئے کہ میرے بعد وہ تخت نشین ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ تیرے بعد تیرا بھائی احمد خاں تخت نشین ہوگا۔ جب سلطان کے جانے بعد احمد خاں حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے اپنا عمامہ اس کے سر پر باندھ دیا اور بادشاہت کی خوشخبری دے دی۔ چنانچہ فیروز کی وفات کے بعد احمد خاں ہی تخت نشین ہوا اور اسکی تخت نشینی کے تین ہفتے بعد حضرت کا وصال ہو گیا ۱۲۔

وَمَن يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ط (۶۵ — ۳)

اور جو شخص اللہ کی نافرمانی سے ڈرے، اللہ اس کے لئے دنیا اور آخرت کے غم سے خلاصی کی صورت پیدا کرے گا اور رزق دے گا اور کو جہاں سے رزق ملنے کا گمان بھی نہ ہوگا۔ اور جو شخص اللہ کے رازق ہونے پر بھروسہ رکھے گا یعنی یہ یقین رکھے گا کہ میرا رازق اللہ ہے نہ کہ زید و عمرو، تو بلاشبہ اللہ اسے کافی ہے۔

اور اگر تو مستی کا طالب ہے تو بھنگ یا شراب سے مستی مت طلب کر کیونکہ جو مستی ان مسکرات سے حاصل ہوتی ہے وہ عارضی بھی ہے اور ضرر رساں بھی۔ بلکہ حق تعالیٰ کی محبت اختیار کر۔ اس محبت سے جو مستی پیدا ہوگی وہ ہمیشہ قائم رہیگی اور اس سے کسی نقصان یا مضرت کا اندیشہ نہیں ہے۔

(۲) مادی اشیاء کے حصول کی طرف مائل مت ہو، مادی لذات کو مقصود مت بنا اور مادیات کی طلب میں اپنی زندگی برباد مت کر کیونکہ دنیا اور اس کی تمام لذات فانی ہیں اور ان کا طالب ہمیشہ ذلیل و خوار رہتا ہے۔

(۳) بخلاف ایں، روحانیت پیدا کر تاکہ ہمیشہ جوان رہے اور تجھ پر تجلیات باری تعالیٰ کا نزول ہو جس کی بدولت تیرا چہرہ پُر نور ہو جائے گا۔

دولتمند افراد اگرچہ بہترین غذائیں کھاتے ہیں مگر مختلف عوارض جسمانی میں مبتلا رہتے ہیں اور ان کے چہروں پر زردی چھائی رہتی ہے۔ برعکس ایں، بندگانِ حق نانِ جویں پر اکتفا کرتے ہیں مگر انکے چہروں پر نور برستا رہتا ہے۔

(۴) عاجزی اور فروتنی اختیار کر۔ اللہ کی زمین پر اس طرح چل جس طرح گھوڑا چلتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھوڑا خود اپنے پاؤں سے چلتا ہے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن تو ہوادار یا پالکی میں چلتا ہے جسے چار آدمی اس طرح اٹھاتے

ہیں جیسے کوئی جنازہ آدمیوں کے کاندھوں پر جا رہا ہو۔

اس کے بعد پھر اقوام سرحد سے خطاب شروع ہوتا ہے، یہ تمام اشعار نصائح سے لبریز ہیں اور ان کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ماسوی اللہ کے بجائے اللہ کو مقصودِ حیات بناؤ۔

کہتے ہیں کہ تقدیر (فلک یا سپہر لاجورد) کا شکوہ مت کرو اور دوسروں سے امداد کی توقع کے بجائے خود اپنی ذات پر بھروسہ رکھو۔

اپنے اندر محبت الٰہی کا رنگ پیدا کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگرچہ بظاہر تم ذرہ کی طرح حقیر اور ضعیف ہو، لیکن محبت الٰہی کی بدولت تم میں اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ کائنات پر حکومت کر سکو گے۔

اس کائنات کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کائنات تمہاری خادم ہے لہذا اس پر حکمران ہو کر اپنے لئے عزت کا مقام حاصل کرو۔ اس کے حصول کی صورت یہ ہے کہ اپنے اندر وحدت کا رنگ پیدا کرو۔ یاد رکھو کہ اس دنیا میں عزت اور حکمرانی، وحدتِ ملی پر موقوف ہے۔ جو قوم اپنے اندر وحدت کا رنگ نہیں پیدا کرتی وہ زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی ع اندریں عالم حیات از وحدت است

یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ حیات، وحدت پر موقوف ہے مگر حیات کا مطلب یہ ہے کہ جو قوم حکمران نہیں ہے (محکوم غیر ہے) وہ دراصل زندہ نہیں ہے۔ اقبالؔ کے فلسفہ میں زندگی سے حیوانوں کی سی زندگی مراد نہیں ہے بلکہ عزت کی زندگی مراد ہے اور یہ زندگی صرف حکومت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ کی رائے میں غلام زندہ نہیں ہے بلکہ مردہ ہے۔ اس زندگی کو زندگی مت سمجھو۔ یہ غلامی کی زندگی بالکل بیکار اور بے قیمت

ہے۔ یاد رکھو زندگی کی بنیاد عشق پر ہے۔ اگر اپنی شناخت درکار ہے تو اپنی آرزو پر غور کرو۔ اگر تمہاری آرزو اشرف اور اعلیٰ ہے تو تم بھی اشرف اور اعلیٰ ہو۔

عشق کی بدولت تمام انسانی قوتیں (چشم و گوش و ہوش) بیدار اور فعّال ہو جاتی ہیں اور انسان اپنی شخصیت سے پورا پورا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

جو شخص عشق سے بے بہرہ ہے وہ دوسروں کا غلام ہو جاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو چیز انسان کو دیگر حیوانات سے متمیز کرتی ہے وہ عشق ہی ہے اگر عشق نہ ہو تو انسان مٹی کا ڈھیر ہے۔

عشق ہی انسان کو اس کی مخفی استعدادوں سے آگاہ کرتا ہے جو شخص عشق الٰہی اختیار نہیں کرتا وہ کبھی اپنی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا۔ عشق ہماری شخصیت سے چنگاری کی طرح سرزد ہوتا ہے اور عاشق کے اندر اس قدر طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ساری کائنات پر چھا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ (پورِ آذر) نے توحید کی اشاعت کیلئے کعبہ تعمیر کیا اور اپنی نگاہ (روحانی طاقت) کے فیض سے اپنے پیروؤں میں یہ طاقت پیدا کر دی کہ انہوں نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

اے مسلمان! اگر تو حضرت ابراہیمؑ کے نقشِ قدم پر چلکر اپنی شخصیت کو مرتبۂ کمال تک پہونچادے تو تیرے اندر بھی یہ طاقت پیدا ہو جائیگی، کہ تو دنیا میں انقلاب برپا کر دے گا، اور تیری شخصیت میں وہی تاثیر پیدا ہو جائیگی، جو اکسیر میں پائی جاتی ہے۔ اس کی بدولت مٹی، سونا بن جاتی ہے، تیری بدولت بُت پرست (مٹی)، خدا پرست (سونا) بن جائیں گے۔

لے بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے (بالِ جبریل)

فصل سوم

مسافر کابل پہونچکر اعلیحضرت شہید

کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے

(۱) اس فصل کے پہلے سات شعروں میں اقبال نے کابل اور ساکنان کابل کا ذکر کیا ہے۔ انداز بیان شاعرانہ ہے، اسلئے ہر شعر میں مبالغہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان اشعار کا مطلب ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

کہتے ہیں کہ شہر کابل نہایت حسین اور دلکش ہے۔ یہاں کے انگوروں میں آب حیات کی تاثیر پائی جاتی ہے۔

کابل جیسا کہ معلوم ہے افغانستان کا دارالحکومت ہے اور ایشیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اشوک کے زمانہ میں بودھ دھرم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ۱۹۳۲ء میں نادر شاہ نے علوم جدیدہ کی ترویج کے لئے یونیورسٹی قائم کی اور ۱۹۳۳ء میں نصاب تعلیم کے سلسلہ میں مشورہ کرنے کے لئے اقبال کو مدعو کیا تھا۔ یہاں کے قالین بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ آبادی اندازاً سوا لاکھ ہے

(۲) اس شہر کی دلکشی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرزا صائب نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا ایک مصرع یہ ہے:۔

مصرع خوشا دشتے کہ چشم از سواد ش سرمہ چیں گردد

خدا کرے یہ شہر ہمیشہ بارونق اور آباد رہے۔

مرزا صائبؔ کی ولادت تبریز میں ہوئی مگر تعلیم اصفہان میں پائی۔ حکیم کاشی اور حکیم شفائی سے شعر و ادب کی تکمیل کی۔ چونکہ دین سے لگاؤ تھا اسلئے عالمِ شباب میں حج کی سعادت حاصل کی۔ واپسی کے بعد ہندوستان کا رُخ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں تمام ایران، مغل بادشاہوں کی علم دوستی کے غلغلہ سے گونج رہا تھا۔ اس کے ایک شعر سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:۔

ہمچو عزمِ سفرِ ہند کہ در ہر دل ہست
رقصِ سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

کابل پہونچکر ظفر خاں صوبہ دار کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ یہ امیر بہت علم دوست اور ادب نواز تھا۔ اس نے صائبؔ کی بہت قدر و منزلت کی۔ ۱۰۳۹ھ میں شاہجہان دکن گیا۔ چونکہ ظفر خاں بھی ساتھ تھا اس لئے صائبؔ کو بھی بادشاہ کی خدمت میں باریابی کا موقع مل گیا۔

۱۰۴۱ء میں شاہجہان کے ساتھ کشمیر گیا۔ ۱۰۴۲ھ میں اس کا باپ اُسے لینے آیا۔ اس لئے اس کے ساتھ وطن واپس چلا گیا۔ شاہ عباس ثانی نے اسے ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی۔

شہرِ کابل کی توصیف کے بعد اقبالؔ کہتے ہیں کہ قصرِ سلطانی میں پہونچکر مجھے نادرؔ سے ملاقات کا موقع ملا۔ میں نے از راہِ نیاز اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ سات شعر شاہ موصوف کی مدح میں لکھے ہیں جن میں کوئی بات تشریح طلب نہیں ہے۔ ان اشعار کے بعد لکھتے ہیں کہ نادر شاہ نے مجھ سے یہ کہا کہ آپ کی اسلام

دوستی (اتش) کی وجہ سے میں آپ کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جسے اسلام سے محبت ہے میری نگاہ میں ہاشم اور محمود سے یعنی حقیقی بھائیوں کی طرح محبوب ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن حکیم کا ایک نسخہ بادشاہ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا اور کہا کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اس سے زیادہ قیمتی کوئی شئی نہیں ہے اس پاک کتاب میں اللہ تعالےٰ نے کامیاب زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ نیز اسمیں زندگی کے ہر شعبہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا پروگرام درج ہے۔ اسی کتاب کی تعلیمات پر عمل کرنے سے حضرت علیؓ میں اسقدر طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ انہوں نے خیبر کا قلعہ فتح کر لیا۔

میری یہ باتیں سن کر بادشاہ پر رقت طاری ہو گئی اور انہوں نے کہا کہ کابل فتح کرنے سے پہلے جب میں اپنے وطن سے دور، یورپ میں زندگی بسر کر رہا تھا تو بہت پریشان تھا۔ دین اور وطن کے غم میں گھلا جا رہا تھا اسوقت قرآن عزیز کے سوا کوئی میرا غمگسار اور ہمدرد نہ تھا۔ اور بلا شبہ اسی کتاب کی برکت سے مجھے کامیابی نصیب ہوئی۔

اس گفتگو کے بعد میں نے شاہِ موصوف کی اقتداء میں عصر کی نماز پڑھی اور اس نماز میں مجھے وہ لذت حاصل ہوئی جس کا بیان لفظوں میں نہیں ہو سکتا صرف اربابِ ذوق اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

فصل چہارم

برمزارِ شہنشاہ بابر خلد آشیانی

قیام کابل کے دوران اقبالؔ کو بابر کے مزار پر جانے کا موقع ملا۔ وہاں پہونچ کر جو جذبات اُن پر طاری ہوئے، ان کو انہوں نے اس غزل کی صورت میں بیان کیا ہے۔

ع بیا کہ سازِ فرنگ از نوا بر افتاد است

اس مصرع میں لفظ "بیا" سے اقبالؔ، عالمِ تصور میں بابر سے خطاب کرتے ہیں کہ اٹھ اور دوبارہ ہندوستان فتح کر۔ مطلب یہ ہے کہ کاش اس زمانہ میں بھی کوئی بابر پیدا ہوجائے اور ہندوستان میں دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم کر دے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت متزلزل ہو چکی ہے اور ان کے عیش کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

دوسرا شعر۔ اے بابر! دنیا اس وقت وطنیت کے بُت کی پوجا کر رہی

لہ بابر ۱۴۸۳ء میں بمقام فرغانہ پیدا ہوا اور ۱۴۹۵ء میں اپنے باپ عمر شیخ مرزا کی وفات کے بعد ریاست فرغانہ کا وارث ہوا۔ ۱۵۰۴ء میں کابل فتح کیا اور ۱۵۱۹ء میں پنجاب فتح کیا ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر آگرہ اور دلی پر قبضہ کیا۔ ۱۵۲۷ء میں رانا سنگرام والی میواڑ کو شکست دی۔ ۱۵۲۸ء میں چندیری (مالوہ) کا قلعہ فتح کیا۔ ۱۵۳۰ء میں وفات پائی۔

ہے مگر میں اسلام (حرم) کی تعلیمات سے وابستہ ہوں کیونکہ ان کی بنیاد پختہ ہے یعنی اسلام ایک ابدی صداقت ہے۔

تیسرا شعر:۔ ترکانِ عثمانی نے دنیا میں دوبارہ سربلندی حاصل کر لی، مگر افسوس کہ تیری نسل (ترکانِ تیموری) کے افراد ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ اسی خیال کو اقبالؔ نے بالِ جبریل میں یوں ادا کیا ہے:۔

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ

نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

چوتھا شعر:۔ اے بابر! تو خوش نصیب ہے کہ بعد وفات تیرا جسم اس سرزمین میں مدفون ہوا جو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہے۔ اس شعر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ کو غلامی سے کسقدر نفرت تھی اور وہ مسلمانانِ ہند کی آزادی کے کسقدر متمنی تھے۔

پانچواں شعر:۔ اسی جذبہ کو بانفاظِ دگر یوں بیان کیا ہے کہ میری نگاہ میں کابل دہلی سے ہزار درجہ بہتر اور برتر ہے کیونکہ

ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

اس بوڑھی عورت نے ہزاروں شوہروں کا منہ دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلی کو متعدد بادشاہوں نے فتح کیا ہے اور مختلف خاندانوں نے اس پر حکومت کی ہے۔

چھٹا شعر:۔ ملتِ اسلامیہ کے زوال سے میری آنکھیں ہر وقت اشک آلود رہتی ہیں مگر میں اپنے اشکوں کو آنکھ سے ٹپکنے نہیں دیتا یعنی غمِ ملت میں ہر وقت خون جگر پیتا رہتا ہوں۔ میں درویش ہوں اور میری دولت یہی اشکِ خونیں ہیں۔ اسلئے میں انکو ضائع نہیں کرتا۔

ساتواں شعر:۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانہ کے مذہبی پیشوا (علماء اور صوفیہ) زبان سے کلمۂ توحید کا ورد کرتے ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جس کی نگاہ تلوار سے بھی زیادہ تیز ہو یعنی جس کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ موجزن ہو۔

فصل پنجم

سفرِ غزنی و زیارتِ مزارِ حکیم سنائیؒ

اس سفر میں اقبال نے غزنی کے سفر اور حکیم سنائیؒ کے مزار کی زیارت کا تذکرہ کیا ہے۔ شرح لکھنے سے پہلے ہم غزنی اور حکیم موصوف کا مختصر حال سپردِ قلم کرتے ہیں۔

غزنی:۔ کابل سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے سلطان محمود کے عہد حکومت میں عظیم الشان شہر تھا اور علم و فن کا مرکز تھا مگر اب اس کی آبادی صرف پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ سلطان محمود، سومنات کا دروازہ فتح کی یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اس وقت سے یہ دروازہ یہیں محفوظ تھا، مگر ۱۸۴۲ء میں جب انگریزوں نے غزنی فتح کیا تو یہ دروازہ اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

حکیم سنائیؒ کے سوانحِ حیات

مجدود نام، ابو المجد کنیت، سنائی تخلص اور غزنی وطن تھا، تاریخِ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ بہرام شاہ کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے۔ توبہ کا واقعہ تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ ایک رات حکیم سنائی شراب خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مجذوب لائے خور نامی وہاں آیا اور اس نے ساقی سے کہا کہ جامِ شراب دو تاکہ "بکوریِ حکیم سنائی" نوش کروں۔ ساقی نے اس کی وجہ دریافت کی تو کہا کہ اس کی نادانی میں شک کیا ہے؟ باوجود علم و فضل اپنی زندگی بادشاہوں کی جھوٹی تعریف لکھنے میں ضائع کر رہا ہے! جب حکیم موصوف نے یہ بات سُنی تو اسی

وقت توبہ کی اور شیخ یوسف ہمدانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلوک طے کیا اور عزلت اختیار کی۔ کچھ عرصہ کے بعد حکیم موصوف کے زہد اور پارسائی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ خود بہرام شاہ نے اپنی بہن ان کے نکاح میں دینی چاہی مگر انہوں نے انکار کیا اور یہ دو شعر لکھ کر بھیج دیئے :-

من نہ مرد زن و زر و جاہم — بخدا گر کنم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم — بسر تو کہ تاج نستانم

تاریخ وفات میں اختلاف ہے لیکن اکثر تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ ۵۳۶ھ میں وفات پائی۔ بوقت وفات یہ شعر وردِ زبان تھا :-

باز گشتم ز آنچہ گفتم ز آنکہ نیست
در سخن معنی و در معنی سخن

سات مثنویاں اور ایک دیوان ان کی یادگار باقی ہے۔ مثنویوں میں حدیقۃ الحقیقہ سب سے زیادہ مشہور ہے بلکہ اسی پر ان کی شہرت کا دار و مدار ہے۔ حدیقہ میں گیارہ ہزار اشعار ہیں اور دس ابواب ہیں۔ پہلے باب میں حسب ذیل عنوانات ہیں:-

فی التوحید، فی الاخلاص، فی التوکل، مجاہدہ، اسبابِ دنیا، صبر، شکر، حضورِ القلب فی الصلوٰۃ، اعجاز القرآن، تلاوۃ القرآن، وغیرہ

حکیم سنائیؒ پہلے فارسی شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کو تصوف کے مسائل سے روشناس کیا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :-

کس نگفت این چنین سخن بجہان
ور کسے گفت گو بیا و بخوان
جز ز قرآن گزشتی و اخبار
نیست کس را ازیں نمط گفتار

اسی اوّلیت کی بناء پر مرشد رومیؒ نے یہ شعر کہا ہے :۔

عطارؒ روح بود و سنائیؒ دو چشم او
ما از پئے سنائیؒ و عطار آمدیم

اس فصل کے پہلے چار اشعار میں اقبالؔ نے یہ لکھا ہے کہ سلطان شہید (نادر شاہ) سے رخصت ہو کر میں غزنی گیا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ آہ! وہ غزنی جو سلطان محمود کے زمانہ میں علم و فن کا مرکز تھا اور یہی شہر سلطان موصوف کا پایہ تخت تھا اور فردوسی جیسا شاعر اس کے دربار سے وابستہ تھا۔ فردوسی کے مختصر حالات درج ذیل ہیں:

اس کا نام ابوالقاسم حسن بن علی تھا۔ غالباً ۹۴۱ء میں بمقام طوس پیدا ہوا۔ شاہ نامہ کا آغاز دقیقی نے کیا تھا مگر اس کی وفات ہو گئی اسلئے فردوسی نے ۳۰ سال کی محنت کے بعد غالباً ۱۰۱۰ء میں اسے پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ چونکہ اس کو حسب توقع انعام نہ ملا اس لئے سلطان سے ناراض ہو کر اپنے وطن کو واپس چلا گیا اور وہیں غالباً ۱۰۲۵ء میں وفات پائی۔

اس کے بعد اقبالؔ لکھتے ہیں کہ حکیم سنائیؒ اسی شہر میں مدفون ہیں جن کے کلام کے مطالعہ سے دل کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

کون سنائی؟ وہ جن کو مرشد رومیؒ نے "حکیم غیب" کا لقب دیا ہے واضح ہو کہ رومیؒ نے ان کی شان میں یہ شعر لکھا ہے :۔

در الٰہی نامہ گوید شرح این
آن حکیم غیب و فخر العارفین

کون سنائی؟ وہ جن کے ذکر سے رومیؒ کا ترک جوش "مکمل" ہوا۔ اس شعر میں رومیؒ کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے

تُرک جوشی کردہ ام من نیم خام
از حکیم غزنوی بشنو تمام

مرشد رومیؒ از راہ انکسار فرماتے ہیں کہ میں چونکہ نیم خام یعنی اسرار تصوف بیان کرنے میں ناقص ہوں اس لئے میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی نیم پختہ یعنی ناقص ہے اس لئے طالبانِ حق کو حکیم سنائیؒ کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہئیے۔ اقبالؒ نے رومیؒ کے اس شعر سے حکیم سنائیؒ کی عظمت پر استشہاد کیا ہے کہ حکیم موصوف اس قدر بلند پایہ ہیں کہ ان کے سامنے رومیؒ بھی، اپنے آپ کو ناقص قرار دے رہے ہیں۔

تُرک جوشی کی ترکیب غور طلب ہے۔ یہ ترکیب "تُرک جوش" سے ماخوذ ہے ترکوں (تاتاریوں) کا طریقہ یہ تھا کہ وہ گوشت کو نیم پختہ کھاتے تھے۔ یہاں سے یہ ترکیب فارسی زبان میں وضع ہوئی کہ ناقص شئی کو "ترک جوش" کہنے لگے

اس کے بعد اقبالؒ اپنا موازنہ حکیم موصوف کے ساتھ کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ میں صفات (پیدا) کے مشاہدہ سے سرور حاصل کرتا ہوں لیکن حکیم سنائیؒ، ذات (پنہاں) کے مشاہدہ میں مست ہیں۔ بالفاظ دگر میری نظر صرف ظاہر (پیدا) پر ہے مگر حکیم موصوف، باطن (پنہانی) کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بہر حال ہم دونوں کی زندگی کا سرمایہ "ذوق حضور" ہے یعنی میں بھی سنائیؒ کی طرح حضوری (دیدار خداوندی) کا طالب ہوں۔

سنائیؒ کا مرتبہ یہ ہے کہ انہوں نے ایمان کی حقیقت واضح کی ہے اور میں نے مومن کی تقدیر (اس کے انتہائی عروج) کو بیان کیا ہے یعنی

ؔ ماخوذ از شرح مثنوی مؤلفہ پروفیسر نکلسن ۱۲

اُنہوں نے یہ بتایا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ میں نے یہ بتایا کہ اگر کسی کو دولتِ ایمان حاصل ہو جائے تو وہ کہاں پہونچ جاتا ہے۔

ہم دونوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قرآنِ حکیم کی حکمت واضح کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ انہوں نے حق یعنی اللہ تعالیٰ کی شان کو بیان کیا ہے۔ (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں حق کی معرفت حاصل تھی) اور میں نے مردانِ حق کی شان واضح کی ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ میں صرف مردانِ حق سے واقف ہوں)۔

حکیم سنائی کا مرتبہ واضح کرنے کے بعد اقبالؔ کہتے ہیں کہ جب میں ان کے مزار پر حاضر ہوا تو مجھ پر رقت طاری ہو گئی اور میں نے عالمِ خیال میں حکیم موصوف کو مخاطب کر کے یہ کہا:-

"آپ روحانی حقائق سے آگاہ ہیں اور دونوں جہان کے حالات آپ پر عیاں ہیں۔ آجکل ہم مسلمان، ذہنی مادیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس لئے خدا پرستوں کو ہر قدم پر مشکلات درپیش ہیں۔ اس کے علاوہ اقوامِ یورپ بھی مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تُلی ہوئی ہیں چنانچہ انکی حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام اسلامی ممالک میں فتنے برپا ہو رہے ہیں۔

لے سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جب اقبالؔ حکیم سنائی کے مزار پر پہونچے تو فاتحہ پڑھنے کے بعد ان پر شدید رقت طاری ہو گئی اور بڑی دیر تک بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ سید صاحب مرحوم کے بیان کی تصدیق اقبالؔ کے اس مصرع سے ہو سکتی ہے

ع تا متاعِ نالۂ اندوختم

چونکہ مسلمانوں کے قلوب عشقِ رسول سے خالی ہو چکے ہیں اس لئے وہ یورپین تہذیب و تمدن کو اپنے مرض کی دوا سمجھ بیٹھے ہیں۔

اندریں حالات میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنی قوم کو اسرارِ غیبیہ سے آگاہ کریں۔ شاید اُن کے اندر دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

نوٹ :- بو کہ آبِ رفتہ باز آید بجوے۔ اس مصرع میں آبِ رفتہ کنایہ ہے عظمتِ ماضیہ سے اور "جو" کنایہ ہے ملّتِ اسلامیہ سے ہے۔

فصل ششم

حکیم سنائی کی رُوح بہشتِ بریں سے جواب دیتی ہے

حکیم موصوف نے جواب دیا کہ :-

(۱) فقر کی بدولت میں رازدانِ خیر و شر بھی ہو گیا اور مجھے زندگی اور نظر بھی حاصل ہو گئی۔ لہٰذا اگر مسلمان ان صفات سے متصف ہونا چاہتے ہیں تو انہیں بھی اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرنی لازم ہے۔

جیسا کہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے اقبالؒ نے فقر کا فلسفہ سب سے پہلے جاوید نامہ میں پیش کیا اس کے بعد اس مختصر کتاب میں کچھ اشارات کئے اور پوری وضاحت "مثنوی پس چہ باید کرد" میں کی ہے۔ میں چونکہ فقر کی پوری تشریح اس مثنوی کی شرح میں درج کروں گا اس لئے اس جگہ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ جب ایک مسلمان عشقِ رسولؐ کی بدولت اپنی خودی کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیتا ہے تو اس میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا فقر نام ہے اپنے آپ کو سرکارِ دو عالم صلعم کے رنگ میں رنگین کر لینے کا۔ اسی کو اصطلاح میں "فنا فی الرسول" کہتے ہیں۔

(۲) سنائی کہتے ہیں کہ فقر کی بدولت انسان "رازدانِ خیر و شر" ہو جاتا ہے۔

اس کے دو معنی ہیں۔ پہلا معنی یہ ہے کہ جب ایک مسلمان فنا فی الرسولؐ ہو جاتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ خیر نام ہے حضور انور صلعم کی اتباع کا اور شر نام ہے حضورؐ کے احکام سے انحراف کا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جب ایک مسلمان کو اپنے نفس کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ (اور یہ معرفت فنا فی الرسول ہو جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے) تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حق تو وجودِ مطلق ہے اور وجودِ مطلق سے خیر ہی صادر ہوتا ہے کیونکہ وہ بذاتِ خود، خیر محض ہے۔ شر جو کچھ نظر آتا ہے یہ امرِ اضافی ہے، یعنی جب ہم قوانینِ الٰہیہ کی نافرمانی کرتے ہیں تو ہمارے فعل سے شر پیدا ہو جاتا ہے مثلاً زید ایک بیکس آدمی کو قتل سے بچانے کے لئے حملہ آور کو قتل کر دیتا ہے تو اس کا یہ فعل خیر ہے لیکن اگر وہ اسی تلوار سے خود کسی بے گناہ کو قتل کر دے تو اس کا یہ فعل شر ہو جائے گا۔ زید بھی وہی ہے اس کی تلوار بھی وہی ہے اور اس کا ہاتھ بھی وہی ہے مگر پہلا فعل خیر ہے، دوسرا شر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خدا نے جو اختیار زید کو عطا کیا ہے اس کے صحیح استعمال سے خیر اور غلط استعمال سے شر پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰی قرآنِ حکیم میں فرماتا ہے:۔

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔ جو پہونچے تجھ کو کوئی بھلائی تو وہ اللہ تعالٰی کی طرف سے ہے اور جو پہونچے تجھ کو کوئی برائی (مصیبت) تو وہ خود تیرے نفس کی طرف سے ہے۔ یعنی تیرے اعمال کا نتیجہ ہے (۴ — ۷۹)۔

ہمت، طاقت، ارادہ اور اختیار کے لحاظ یا صحیح استعمال کا معیار ذاتِ رسالتمآب صلعم ہے یعنی حضور صلعم جائز یا احسن قرار دیں وہ جائز

یا حلال یا حسن ہے اور جس بات کو حضور ناجائز یا حرام یا قبیح قرار دیں، وہ ناجائز حرام یا قبیح ہے۔ اب اگر ایک شخص حضور انور صلعم کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے افعال (اعمال) کا لازمی نتیجہ شر کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اسی لئے اقبال نے یہ لکھا ہے:-

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است (ارمغانِ حجاز)

(ب) اس کے بعد سنائی کہتے ہیں کہ فقر کی بدولت مجھے زندگی اور نظر بھی حاصل ہو گئی۔ یعنی فقر کی بدولت انسان زندہ ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ لاشۂ بیجان تھا، یعنی حیاتیاتی زاویۂ نگاہ سے مُردہ تھا، فقر کی بناء پر اس میں حرکت پیدا ہو گئی! بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فقر کی بدولت انسان زندگی کے معنیٰ سے آگاہ ہو جاتا ہے اور قرآنی زاویۂ نگاہ سے زندگی کا معنیٰ (مفہوم) ہے، دنیا میں معزز، محترم اور سربلند ہو کر رہنا، کسی انسان کے سامنے سرِ نیاز خم نہ کرنا، کسی سے نہ ڈرنا، کسی بھی کسی قسم کی طاقت تسلیم نہ کرنا۔ مختصر یہ کہ غیر اللہ کی غلامی سے نکل کر صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا۔[1]

جس وقت ایک شخص زندگی کے مفہوم سے آگاہ ہو جاتا ہے تو وہ اپنی پوری توجہ زندگی کے مفہوم یا مقصد کے حصول پر مرکوز کر دیتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کو قرآن نے "جہاد فی سبیل اللہ" سے

---

[1] زندگی کا یہی مفہوم سلطان ٹیپوؒ کے ذہن میں تھا جس کی بنا پر انھوں نے دلاوری کو یہ لکھ کر بھیجا تھا "شیر کی حیات یک روزہ گیدڑ کی حیات صد سالہ سے بہتر ہے"

ع یک دم شیری بہ از صد سالِ میش (جاوید نامہ)

تعبیر کیا ہے۔ خلاصۂ کلام اینکہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے صرف مجاہد زندہ ہے اور جو مسلمان مجاہد نہیں ہے وہ قرآن کی رُو سے زندہ نہیں ہے بلکہ مُردہ ہے خواہ وہ دونوں وقت روٹی کیوں نہ کھاتا ہو اور دفتر میں بیٹھ کر نوشت و خواند کیوں نہ کرتا ہو۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ بالفاظِ دگر، فقر کی بدولت ایک انسان غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔

(ج) تیسری بات اُنہوں نے یہ کہی ہے کہ فقر کی بدولت انسان صاحبِ نظر ہو جاتا ہے۔ "صاحبِ نظر" تصوّف کی اصطلاح میں اُس شخص کو کہتے ہیں جس کا قلب مہبط انوارِ الٰہیہ ہو جائے اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو

(۱) اسے بصارت کے علاوہ بصیرت بھی حاصل ہو جاتی ہے یعنی اس کے باطن (قلب) کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں جس کی بدولت وہ ہر شئی کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارکہ میں وہ شخص اللہ کے نور سے دیکھتا ہے (ینظر بنور اللہ)

(۲) اسے اللہ تعالیٰ کی معیّت نصیب ہو جاتی ہے اور جب اسے یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ مخلوقات سے بے نیاز ہو جاتا ہے بلکہ تمام کائنات اس کا طواف کرنے لگتی ہے۔ شاہانِ وقت اُس سے ملنے کی آرزو کرتے ہیں مگر وہ اُن کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اُن کو یہ کہلا بھیجتا ہے[1] کہ فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں اگر بادشاہ مجھ سے ملنے کے لئے ایک دروازے سے آیا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔

---

[1] جب سلطان علاؤ الدین خلجی نے حضرت سلطان المشائخؒ کی خدمت میں یہ کہلا کر بھیجا کہ اگر آپ مجھے حاضرِ خدمت ہونے کی اجازت نہیں دیں گے تو میں کسی دن بلا اجازت حاضر ہو جاؤں گا۔ اس پر آپ نے یہ جواب دیا تھا ۱۲۔

(۳) اس کی ظاہری نگاہ میں یہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جسے ایک نظر دیکھ لیتا ہے یعنی جس پر توجہ کرتا ہے اُسے خدا رسیدہ بنا دیتا ہے۔ بالفاظِ دگر جو شخص اس کی صحبت میں بیٹھ جاتا ہے وہ واصل باللہ ہو جاتا ہے۔

خواجگانِ چشت کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے ان تینوں باتوں کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ صرف ایک واقعہ ذیل میں درج کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ دلی تشریف لائے تو اپنے دوست شیخ الاسلام مولٰنا نجم الدین سے ملنے تشریف لے گئے۔ اُنہوں نے حضرت سے کہا کہ آپ کے مرید (خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ) کی وجہ سے میری شیخ الاسلامی کالعدم ہو گئی ہے۔ ہر شخص انہی کا کلمہ پڑھتا ہے مجھے پوچھتا بھی نہیں۔ یہ سُن کر حضرت نے اپنے مرید سے کہا "بابا قطب الدین! میرے ساتھ اجمیر چلو" چنانچہ وہ تیار ہو گئے۔ جب پیر اور مرید دلی سے رخصت ہوئے تو آگے آگے بادشاہ شمس الدین (التمش) اور پیچھے پیچھے ساری خلقت ان دو بزرگوں کے ساتھ دلی سے نکل کھڑی ہوئی۔ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جس جگہ ان بزرگوں کے قدم پڑتے تھے لوگ اس جگہ کی خاک کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔ جب سلطان الہندؒ نے یہ کیفیت دیکھی تو اپنے مرید سے فرمایا "بابا قطب الدین! مناسب ہے کہ دلی ہی میں رہو کیونکہ مخلوقِ خدا کی دل شکنی مجھے گوارا نہیں ہے"۔

شعر نمبر ۲، ۳۔ ان دو شعروں میں حکیم سنائیؒ نے خود فقر کی وضاحت کی ہے کہ صاحبِ فقر وُہ ہے جو راہ بیں ہوتا ہے یعنی وہ اس طریق سے واقف ہوتا ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہونچ سکتا ہے بلکہ بالفعل پہونچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی خودی اس درجہ منور ہو جاتی ہے

کہ وہ اپنے مقصود (اللہ) کو دیکھ لیتا ہے اور ہر عاقل اس بات کو تسلیم کرے گا کہ اگر ایک شخص اپنے مقصود کو بچشم خود دیکھ لے تو یقیناً اسے حاصل کر لے گا۔

فقر کی بدولت ایک شخص اپنی ذات میں خدا کا جلوہ دیکھ لیتا ہے یعنی اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ میں بذات خود کچھ نہیں ہوں، مگر مظہر ذات باری ہوں۔ باطن میں بھی وہی ہے، ظاہر میں وہی ہے بلکہ ساری کائنات کا ظاہر و باطن وہی ہے۔ اسکے سوا کوئی موجود نہیں ہے گویا وہ اس آیت کی زندہ تفسیر ہوتا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۔

آگاہ ہو جاؤ کہ ہر شئی کی ابتدا بھی وہی ہے اور انتہا بھی وہی ہے یا ہر شئی کے اول میں بھی وہی ہے اور آخر میں بھی وہی ہے، ہر شئی کا ظاہر بھی وہی ہے اور ہر شئی کا باطن بھی وہی ہے اور وہ ہر شئی کی حقیقت کا علم رکھتا ہے۔

اب ناظرین خود انصاف کریں کہ جب ہر شئی کا یا اس کائنات کا اول بھی وہی ہے اور آخر بھی وہی ہے، اس کا ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی ہے تو کائنات کا وجود کہاں ہے؟ اسی لئے عرفا نے کہا ہے۔

"لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ"

جب اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے تو غیر اللہ سے ڈر کیسا؟ اسکی اطاعت بھی چہ؟ اور اس سے کسی قسم کی توقع کیوں رکھی جائے؟ یہی وجہ ہے کہ صاحب فقر، تہِ شمشیر بھی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہی کہتا ہے۔ اسی لئے عرفا نے کہا ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب ہے لَا مَوْجُوْدُ اِلَّا اللّٰہُ۔ مسلمان حقیقی معنی میں مُوَحِّد بنتا ہی اُس وقت ہے جب وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا حقیقی معنیٰ میں کوئی موجود ہی نہیں

ہے۔ اقبال نے یہ کہا ہے کہ

لَاإِلٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں
تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں (جاوید نامہ)

تو ان کی مراد یہی ہے کہ موحد اُس وقت بنو گے جب تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔

چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

چساں مومن کند پوشیدہ را فاش
ز "لَامَوجُودَ اِلَّا اللّٰہ" دریاب (ارمغان حجاز)

یعنی اگر تم "لَامَوجُودَ اِلَّا اللّٰہ" پر عامل ہو جاؤ تو ہر شئی کا باطن تم پر فاش ہو جائے گا۔ بالفاظ دگر، اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ مومن، ذاتِ باری کو جو پوشیدہ ہے کس طرح فاش (ظاہر) کر دیتا ہے، تو لَامَوجُودَ اِلَّا اللّٰہ میں غور کرو۔ یعنی جب مومن یہ کہتا ہے کہ لَامَوجُودَ اِلَّا اللّٰہ تو ہر شئی کا باطن ظاہر ہو جاتا ہے اور ہر شئی کا باطن، اللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جب ہر شئی کے مستقل وجود کی نفی ہو گئی تو اللہ ہی باقی رہ گیا اور اس طرح وہ جو تعینات کے پردوں میں پوشیدہ تھا، ان پردوں کے ہٹ جانے سے ظاہر ہو گیا۔ اسی مضمون کو خواجہ میر دردؔ نے یوں بیان کیا ہے:

پردے کو تعیّن کے درِ دل سے اُٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

اس کے بعد حکیم سنائیؒ مسلمانوں کو عشق رسولؐ کا درس دیتے ہیں یہ درس (پیغام)، اس فصل کے چوتھے شعر سے شروع ہو کر اٹھارہویں شعر پر ختم ہوتا ہے چونکہ حکیم موصوف کی زبان سے اقبال نے خود اپنے پیغام کا خلاصہ

بیان کیا ہے اسلئے میں ہر شعر کا مفہوم واضح کروں گا:۔

(۱) سب سے پہلے سنائیؒ نے بنیادی نکتہ پیش کیا ہے جو یہ ہے کہ اصلی شئی الروح ہے جسم (مادہ) نہیں ہے۔ اور یہی بنیادی فرق ہے اسلام اور مادّیت یا دہریت یا الحاد میں۔ مادّیت کی تعلیم یہ ہے کہ صرف مادہ موجود ہے روح کا مطلق وجود نہیں ہے اس لئے انسان کو اپنی تمام تر توجہ مادّیات یعنی زن، زر اور زمین کے حصول پر مرکوز کرنی چاہیئے۔ بالفاظِ دگر مقصدِ حیات، حصولِ لذائذِ جسمانی ہے۔

اس کے برعکس اسلام یہ کہتا ہے کہ اصل شئی روح (جان) ہے، تن (مادہ) فانی ہے اور اس لئے ہیچ ہے۔ پس مقصدِ حیات استلذاذِ جسمانی نہیں ہے بلکہ تربیت روحانی ہے تاکہ روح اس جسم سے جدا ہونے کے بعد ارتقائی مدارج طے کر سکے۔ اگر دنیاوی زندگی میں روح کی تربیت نہ کی تو مقصدِ حیاتِ ارضی حاصل نہ ہو سکے گا۔

مادہ پرست کی نگاہِ سطحی اور محدود ہوتی ہے اس کی دانست میں موت کے بعد کچھ نہیں ہے۔ لیکن خدا پرست کی نگاہِ عمیق اور لامحدود ہوتی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ روحانی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے مگر صرف وہ روحیں ترقی کر سکیں گی جن کی تربیت اس زندگی میں ہو چکی ہو۔ اس لئے مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر توجہ "جان" کی تربیت پر مبذول کر دے یعنی جسم کو آراستہ کرنے کے بجائے روح کو آراستہ کرے۔

ع فکرِ جاں کن چوں زناں برتن متن

اس مصرع کا پہلا جز اس آیت کا لفظی ترجمہ ہے:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ۔ اے ایمان والو تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا۔

پہلے مصرع میں یہ کہا کہ اپنی روح کی تربیت کا انتظام کرو۔ دوسرے مصرع میں تربیت کا طریقہ بیان کیا کہ مردوں کی طرح جہاد کو شیوۂ زندگی بناؤ۔ بالفاظِ دگر، مصافِ زندگی میں مشکلات کا مقابلہ کرو۔

(۲) یاد رکھو کہ اگر تم اس دنیا میں حکمرانی کے آرزومند ہو تو اپنے دل کو بذریعہ عشقِ رسولؐ زندہ کرلو۔ دلِ زندہ یا دلِ بیدار ایسی عظیم الشان شئی ہے کہ دنیاوی حکومت (سلطنت) اس دل کے ایک قطرۂ خون سے خریدی جاسکتی ہے یعنی سلطنت اور حکومت، عاشقانِ رسولؐ کے قدموں میں سجدہ کرتی ہے۔ اقبالؔ کا مطلب اس سے یہ ہے کہ اے مسلمانو! حصولِ سلطنت کو مقصودِ حیات مت بناؤ۔ تمہارا مقصدِ حیات حصولِ رضائے حق ہے، جس کا ذریعہ عشقِ رسولؐ ہے اور جب حق تعالیٰ تم سے راضی ہو جائیگا۔ تو سلطنت خود بخود تمہارے قدموں میں آجائے گی۔ جس طرح اگر کسی ملک کا بادشاہ یا امر (ڈکٹیٹر) کسی شخص سے راضی ہو جائے تو وہ کون سی دنیاوی نعمت ہے جو اس کو خود بخود حاصل نہیں ہو جائے گی؟

(۳) یہ بہت غور طلب شعر ہے:۔ کہتے ہیں کہ مومن کی زندگی خواب و خورش پر موقوف نہیں ہے وہ عشق کی بدولت زندہ رہتا ہے اسے کھانے پینے اور سونے کی احتیاج نہیں ہوتی۔

عام طور سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ انسان کی زندگی ان ۲ چیزوں پر موقوف ہے (۱) کھانا پینا (۲) سونا۔ چنانچہ ہم سب ان دو چیزوں پر ہی اپنی ساری توجہ مبذول رکھتے ہیں۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ:۔

(۱) ہم لذیذ اور بہترین اور زیادہ سے زیادہ طاقت عطا کرنے والی غذائیں کھاتے ہیں اور اب تو ہر شخص وٹامن کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔

(ب) چونکہ اعلیٰ درجہ کی مقوی اور مرغن غذائیں بہت قیمتی ہوتی ہیں اس لئے ہم رات دن دولت کمانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے اکثر اوقات مذہب، اخلاق اور انسانیت، ضمیر، تینوں چیزوں کو قربان کر دیتے ہیں۔

خلاصۂ کلام اینکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی، مقوی غذاؤں پر موقوف ہے اور یہ غذائیں دولت پر موقوف ہیں اس لئے رفتہ رفتہ دولت ہمارا معبود بن جاتی ہے۔ اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ زندہ رہنے یا تندرست رہنے کے لئے آٹھ گھنٹے سونا بھی بہت ضروری ہے۔ اس لئے ہماری زندگی اگر غور سے دیکھا جائے عبارت ہے کھانے پینے اور سونے سے، اور ہم ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو مر جائیں گے۔

مگر حکیم سنائی اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ مومن کی زندگی خواب و خورش پر موقوف نہیں ہے وہ عشق کی بدولت زندہ رہتا ہے۔ اس دور مادیت میں، جبکہ ہر شخص "ٹانک" کی تلاش میں سرگرداں ہے، اقبال کا یہ اعلان کرنا کس قدر عظیم الشان خدمت ہے تصوف کی، بالفاظِ دگر حقیقی اسلام کی! مادہ پرستوں کی محفل میں بیٹھ کر صاف لفظوں میں مادیت کی تردید کرنا، کتنا عظیم الشان کارنامہ ہے اقبال کا اور کتنا جرأت مندانہ اقدام ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سچے خادم کا جسے اللہ تعالیٰ نے اس دور میں مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے پیدا کیا تھا!

بزرگان دین کے سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو اقبال کے اس نکتۂ عجیبہ کی بآسانی تصدیق ہو سکتی ہے مثلاً حضرت میاں میر لاہوریؒ جن کی وفات جب سے بیعت ہوئی، تیس سال تک مطلق نہیں سوئے اور سلطان المشائخ

حضرت نظام الدین محبوب الٰہی دہلویؒ نے مدت دراز تک جَو کی روٹی کے چند لقموں پر اکتفا کیا۔ اس کے باوجود ان دونوں بزرگوں نے بڑی طویل عمریں پائیں۔

(۴) اب حکیم موصوف ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اُس عشق کا منبع جسکی بدولت مومن زندہ رہتا ہے، سرکارِ دو عالمؐ کی ذاتِ بابرکات ہے یعنی جو شخص حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے وہ بے خواب و خورش زندہ رہ سکتا ہے۔

(۵) حضورؐ سے محبت کا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ مومن (عاشق) کو حقیقی زندگی حاصل ہو جاتی اور آپؐ کی محبت، مومن کے ایمان کی محافظ ہے یعنی ایمان موقوف ہے حضورؐ سے محبت کرنے پر۔ یہ مضمون اس حدیث سے ماخوذ ہے:۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَمِنْ وَّلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ط یعنی اے مسلمانو! تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اُسے اُس کے والدین، اُس کی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

(۶) اے مسلمان! جسم (آب و گل) کی حقیقت سے آگاہی حاصل کر یعنی خوب سمجھ لے کہ تیرا جسم مادی فانی ہے۔ اگر تو نے اپنے دل کو بذریعۂ عشقِ رسولؐ، اکسیر نہ بنایا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موت تجھے فنا کر دے گی۔ اس لئے دل کو اکسیر بنا لے تاکہ اس کی تاثیر سے تیرا جسم بھی غیر فانی ہو جائے۔ بالفاظِ دگر، عاشق حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

(۷) یاد رکھ! دین کی بدولت مومن کا دل ہر قوت کا سرچشمہ بن جاتا ہے یعنی دل کی قوت دین پر موقوف ہے اور دین صحبت پر منحصر ہے۔

(۸) اس شعر میں پہلے شعر کی شرح کرتے ہیں کہ دین، کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کتابوں سے علم حاصل ہو سکتا ہے۔ دین تو بزرگان دین کی صحبت (نظر) سے حاصل ہوتا ہے۔

اس زمانہ میں چونکہ مسلمان مغربی علوم اور مادی تہذیب سے متاثر ہو چکے ہیں اس لئے ان کے دماغوں سے صحبت کی اہمیت اور افادیت اور ضرورت بالکل زائل ہو چکی ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ اس زمانہ میں وہ لوگ مسلمانوں کے رہنما بن گئے ہیں جو خود صحبت بزرگانِ دین سے محروم ہیں اسلئے یہ لوگ مسلمانوں کو ساری باتیں بتاتے ہیں مگر صحبت کی اہمیت سے آگاہ نہیں کرتے کیونکہ ایسا کریں تو ان کی قلعی کھل جائے۔ ان دو باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ عامۃ المسلمین (الا ماشاء اللہ) اس کوچہ سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں حالانکہ اگر وہ اپنی ملی تاریخ کا مطالعہ کریں تو انہیں معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ جب تک ہندوستان میں انگریزی تعلیم عام نہیں ہوئی تھی۔ تمام تعلیم یافتہ مسلمان صحبتِ مرشد کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ اسی لئے علماء کا یہ طریقہ تھا کہ علم دین حاصل کرنے کے بعد کسی شیخ طریقت کی صحبت اختیار کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ:۔

ع علم و حکمت از کتب دیں از نظر

مثال کے طور پر قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اپنے وقت کے بہت بڑے محدث اور مفسر اور فقیہہ تھے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ انہیں "بیہقیٔ وقت" کہا کرتے تھے لیکن بایں ہمہ علم و فضل انہوں نے حضرت جانِ جاناں مظہر شہید نقشبندی دہلویؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلوک طے کیا۔

ہمارے زمانہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا

محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، ان تینوں علما نے شیخ العرب والعجم حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب چشتی مہاجر مکیؒ کی صحبت اُٹھائی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ صحبت کے بغیر دین میں رسوخ حاصل نہیں ہو سکتا۔ منطق، فلسفہ اور کلام سے عقل تیز ہو جاتی ہے مگر دل زندہ نہیں ہو سکتا۔

۱۰۲۹۔ اب حکیم موصوف خود مثال دیتے ہیں کہ بوعلی سینا یعنی فلسفی طبیعات اور دوسرے علوم میں تو ماہر ہوتا ہے مگر وہ امراض قلبی کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے فلاسفہ کے جھوٹے سچے نظریات سے قطع نظر کرو اور اپنے دل کی اصلاح کے لئے عاشقان الٰہی کی صحبت اختیار کرو۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ نے فلسفہ اور الٰہیات میں مقام رفیع حاصل کرنے کے بعد اطمینان قلب حاصل کرنے کے لئے بالآخر اہل دل کی طرف رجوع کیا۔ کیونکہ ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی تھی کہ

ع چارہ سازیہائے دل از اہل دل

یعنی دل، صرف اہل دل کی صحبت میں بیٹھنے سے ہی زندہ ہو سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ چراغ سے چراغ جل سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے چراغ کو دوسرے چراغ کی لو سے مربوط نہیں کریگا۔ اس کا چراغ کبھی روشن نہ ہو سکے گا۔

بوعلی سینا کے مختصر سوانح حیات ذیل میں درج کرتا ہوں:-

دنیائے اسلام کا یہ مشہور و معروف فلسفی ۹۸۰ء میں شہر بخارا (ترکستان) کے نزدیک ایک قصبہ میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ مثلاً دینیات، الٰہیات، فلسفہ، منطق، کلام، ریاضی، ہیئت، طبیعات اور طب وغیرہ سے فارغ ہو گیا۔ اس کی تصانیف میں کتاب الشفاء (۱۸ جلدوں میں)، اشارات، نجات، اور قانون بہت مشہور ہیں۔ ۱۰۳۷ء میں بمقام ہمدان وفات پائی

شعر ۱۱ تا ۱۳ :- ان تین اشعار میں اقبال نے بحر، موج، دریا، جوئے، ساحل اور لطمہ موج کا تلازمہ باندھا ہے:-

بحر کنایہ ہے ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے، موج کنایہ ہے آپ کے کمالات عالیہ سے، جوئے خویش کنایہ ہے ذاتِ سالک سے، دریا را بجوئے خویشتن بستن کنایہ ہے مقام فنا فی الرسول سے، ساحل کنایہ ہے اقرار باللسان سے یعنی زبان سے یہ کہنا کہ میں مسلمان عمل یا محبّ رسول ہوں۔ لطمہ موج کنایہ ہے اُن مجاہدات یا صعوبات سے جو عاشق کو اس راہ میں پیش آتی ہیں۔ خود را بدریا در افگندن کنایہ ہے راہِ سلوک طے کرنے سے۔

کہتے ہیں کہ اے مخاطب! حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کمالاتِ بشری کے اعتبار سے بمنزلہ بحرِ ناپیدا کنار ہے یعنی آپؐ کی ذات اقدس جامع کمالات لامتناہی ہے۔ تیرا فرض یہ ہے کہ اس سمندر (ذات محمدی) کو اپنے اندر جذب کر لے یعنی فنا فی الرسول ہو کر اپنے اندر حضورِ اقدس صلعم کے تمام کمالات ظلّی طور پر پیدا کر لے۔ اس کی مثال درکار ہو تو اُس لوہے پر غور کرو جو آگ میں پڑ کر آگ کے خواص اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔

تو نے مدتوں زبان سے محبت کا دعویٰ کیا ہے مگر اس راہ میں جو مصائب پیش آتے ہیں، اُن سے تو ہنوز بیگانہ ہے۔ اس لئے اب اپنے عمل سے اپنے دعویٰ کا ثبوت دے یعنی حضورِ انور صلعم کی ذات میں فنا ہو جا تاکہ تو از سر نو زندہ ہو جائے یعنی جب تک تو اپنی مرضی کو حضورؐ کی مرضی میں فنا نہیں کر دے گا اس وقت تک تجھے حیات ابدی نصیب نہیں ہو سکتی۔

ان اشعار کا مطلب تو واضح ہو گیا اتنی صراحت اور کر دوں کہ دریا کو کوزے میں بند کر لینا ایک فن ہے اور کوئی فن، صاحبِ فن سے سیکھے بغیر نہیں آتا۔ کیا دنیا میں کوئی شخص ایسا ہے جسے محض طب کی کتابیں پڑھ کر طبابت یا جراحی کا فن آ گیا ہو؟ کیا آج تک کسی شخص نے محض موسیقی کی کتابوں سے راگ راگنیاں گانے میں کمال حاصل کیا ہے؟

پس اگر سرجن بننے کے لئے مدتوں سرجری کالاسز میں علم حاصل کرنے کے بعد آپریشن روم میں کسی ماہرِ فن سے سرجری کا فن سیکھنا ضروری ہے اور اسی طرح موسیقار بننے کے لئے کسی ماہرِ فن کی صحبت میں بیٹھنا ضروری ہے تو دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے لئے کسی ماہرِ فن (شیخِ طریقت) کی صحبت اختیار کرنا بدرجہ اولیٰ ضروری اور لازمی ہے۔

یہ عجیب منطق ہے جو اس زمانہ کے "ترک جوش" قسم کے مذہبی رہنما اور مصلحین قوم پیش کرتے ہیں کہ دیگر تمام فنون کے لئے تو صاحبانِ فن کی صحبت ضروری ہے مگر اصلاحِ نفس اور تزکیۂ قلب اور تجلیۂ روح کے لئے (دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے لئے) کسی ماہرِ فن (مرشدِ کامل) کی صحبت ضروری نہیں ہے۔ صرف کتابیں پڑھ لینے اور اپنا لٹریچر شائع کر دینے سے ایک شخص مسلمانوں کا "امیر" اور قوم کا مصلح بن سکتا ہے! اگر مرشد کی صحبت میں بیٹھنے کے بغیر ہی انسان اپنے نفس کی اصلاح کر سکتا تو بعثتِ انبیا کی کیا ضرورت تھی؟ صرف کتاب آسمان سے نازل ہو جاتی، لوگ اس کو پڑھ کر خود ہی اپنا تزکیہ کر لیا کرتے!

لیکن قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اغراض چہارگانہ میں سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ بنی آدم آپ کی صحبت

ہیں وہ کہ تزکیۂ نفس کے مدارج طے کر سکیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص خود اپنا تزکیۂ نفس نہیں کر سکتا اور جب تک تزکیہ نہ ہو کوئی شخص خدا کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور جب تک معرفت نصیب نہ ہو، مقصدِ حیات حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب میں ان تمام دعاوی کو قرآن سے ثابت کرتا ہوں۔

(ا) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝

اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔ مفسرین نے عبادت سے معرفت مراد لی ہے۔ یعنی غائیت تخلیق انسانی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے۔

(ب) وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۝

اور جو لوگ ہم تک پہنچنے (ہماری معرفت حاصل کرنے) کے لئے کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے ملنے کے راستوں کی طرف ہدایت کر دیتے ہیں یعنی حصول معرفت باری کے لئے مجاہدہ (تزکیہ نفس) شرط ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جدوجہد اور مجاہدہ (تزکیہ) کے بغیر کوئی شخص خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ خدا خود کسی کو اپنی طرف کھینچ لے، یہ اس کی مہربانی ہے مگر عام قاعدہ یہی ہے کہ جب تک تزکیہ نہ ہو، خدا نہیں مل سکتا۔ اس کی مثال درکار ہو تو آئینہ پر غور کر لو۔ جب تک آئینہ پر صیقل نہ ہو اس میں صورت منعکس نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جب تک آئینۂ قلب مصفا نہ ہو اس میں ''عکسِ رخِ یار'' کا جلوہ[1] نظر نہیں آ سکتا۔

---

[1] ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدام ما (حافظ)

مرشد رومیؒ فرماتے ہیں :-

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک

نقشہا بینی بروں از آب و خاک

(ج) ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ٥

اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا جو انہی میں سے ہے (انہی کی طرح بشر ہے) جو ان کو کلام اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے (قلب کو رذائل اخلاق سے پاک کرتا ہے) اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اپنا تزکیہ خود نہیں کر سکتا، اور جب تک تزکیہ نہ ہو کوئی شخص دین کی حقیقت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اقبالؒ نے صاف لفظوں میں یہ تعلیم دی ہے :-

دل ز دیں سرمایۂ قوت است | دیں ہمہ از معجزات صحبت است

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر | علم و حکمت از کتب دیں از نظر

آج خواجگان چشتؒ کے اسمائے گرامی دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ کون مسلمان ہے جو حضرات سید گیسو دراز گلبرگہ (دکن) خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ، سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی دہلویؒ، قطب الاقطاب قطب جمال ہانسویؒ، مخدوم علی احمد صابر کلیریؒ، شیخ شیوخ عالم بابا فرید الدین احمد صفیؒ، قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، سلطان الہند خواجہ خواجگان عالم خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کے نام نامی سے واقف نہیں ہے؟ ان حضرات کے وصال کو صدیاں گزر گئیں مگر آج بھی

ان کی آرام گاہیں مرجع خلائق بنی ہوئی ہیں۔ آج بھی ان میں سے ہر ایک بزرگ کا نام لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمانوں کے لئے باعث آرام جان ہے اور آج بھی ان کا روحانی فیض اسی طرح جاری ہے جس طرح زندگی میں جاری تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات پر موت تو ضرور وارد ہوئی۔

کیونکہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت" نص صریح ہے

لیکن موت ان کو مار نہ سکی، یہ اس لئے کہ یہ حضرات نفس کو تو پہلے ہی مار چکے تھے یعنی فنا فی الرسول ہو چکے تھے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ حضور انور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور بلاشبہ زندہ ہیں تو یہ تمام حضرات بھی بطفیل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں کیونکہ انہوں نے فنا فی الرسول ہو کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات سے حصہ پا لیا ہے۔ فنا فی الرسول کا معنیٰ ہی یہ ہے کہ سالک میں سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام صفات کا عکس جلوہ گر ہو جاتا ہے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما (حافظ)

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے (اقبال)

بندۂ حق ضیغم و آہو ست مرگ
یک مقام از صد مقام اوست مرگ (ایضاً)

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق میں

معشوق کی صفات پیدا کر دیتا ہے۔ عشق نام ہی ہے معشوق کو اپنے اندر جذب کر لینے کے طریق کار کا۔ اب چونکہ سرکار دو جہاں پیشوائے انس و جاں صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو حضورؐ کے عشاق کیسے مر سکتے ہیں؟ خلاصۂ کلام اینکہ موت سے وہ لوگ مرتے ہیں جو عاشق نہیں ہوتے لیکن عشق، انسانی خودی کو پختہ کر دیتا ہے اور

ع خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است (اقبالؒ)

آخری نکتہ بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔
اقبال نے اسی فصل میں یہ شعر لکھا ہے:۔

با خبر شو از مقام آب و گل
پس بزن بر آب و گل اکسیر دل

اس کا مطلب قبل ازیں بیان کر چکا ہوں کہ تیرا جسم جو عناصر اربعہ (آب و خاک و آتش و باد) سے مرکب ہے، فانی ہے۔ اگر تو بذریعہ عشق رسولؐ اپنے دل کو زندہ کر لے یعنی اکسیر بنالے تو اس کی تاثیر سے تیرا جسم بھی غیر فانی ہو جائے گا۔ چونکہ اولیاء اللہ اپنے دل کو عشق رسولؐ کے ذریعہ سے غیر فانی بنا لیتے ہیں اس لئے ان کا جسم بھی غیر فانی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تمام بزرگان دین اپنے کشفِ صحیح کی بنا پر شہادت دیتے ہیں کہ اولیاء اللہؒ کا جسم مرنے کے بعد بھی محفوظ رہتا ہے۔

اس کے بعد حکیم سنائیؒ یہ تلقین کرتے ہیں کہ اے مسلمان! حق تعالیٰ کے احکام کی پابندی کر اور اس کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ اپنی خودی کی مخفی طاقتوں کو آشکار کر تاکہ یہ کائنات تیری مطیع ہو جائے۔

آخر میں حکیم موصوف نے فطرت (روح کائنات) سے اپنا فرضی مکالمہ بیان

کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کل میں نے فطرت کو دیکھا کہ وہ عناصر کائنات سے برسرپیکار ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو کس کی تلاش میں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بحکم خدا میں نیا آدم پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ چنانچہ اس نے مشتِ خاک سے نیا آدم بنایا اور اس کے دل میں جذبۂ عشق ودیعت کیا (گلِ لالہ کا آب و رنگ عطا کیا) یعنی اس کے ضمیر میں توحیدِ الٰہی کا عقیدہ مستحکم کر دیا اور اس سے کہا کہ اب تو اس دنیا میں ایسا انقلاب (بہارِ دیگر) برپا کر سکے گا جو گذشتہ انقلاب سے زیادہ کامیاب ہو گا۔ لیکن یاد رکھ! دشمنانِ دین اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ تو اس انقلاب کے ثمرات سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے۔ اس لیے ان کی کوششوں کو خاک میں ملا دے۔

میری نظر قوم (شاخِ گل) کی باطنی حالت پر مرکوز ہے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ قوم کے نونہالوں (غنچہ ہا) میں انقلاب پیدا کرنے (اسلام کو سربلند کرنے) کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اب کوئی طاقت مسلمانوں کو سربلندی حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی۔ چنانچہ جو شخص "صاحب جستجو" ہے یعنی مسلمانوں کی زندگی کا مطالعہ کر رہا ہے وہ ان کامیابیوں (نغمہ ہا) کا ابھی سے اندازہ کر سکتا ہے جو مسلمانوں کو آئندہ زمانہ میں حاصل ہونے والی ہیں

اس تمثیلی مکالمہ کا مطلب یہ ہے کہ اقبال نے حکیم سنائی کی زبان سے قوم کو اس عروج کا مژدہ سنایا ہے جو بفضلِ خدا آئندہ زمانہ میں حاصل ہونے والا ہے۔ بالفاظ دگر، ان شاء اللہ اسلام ساری دنیا پر غالب آجائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی پسندیدہ دین ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۝

فصل ہفتم

تذکرۂ زیارتِ مزارِ سلطان محمود غزنوی

اس فصل میں اقبال نے سلطان محمود غزنوی کے مزار کی زیارت کا حال بیان کیا ہے۔ ذیل میں سلطان موصوف کے مختصر سوانح حیات درج کرتا ہوں۔

سلطان موصوف ۹۷۰ء میں پیدا ہوا اور اپنے باپ سبکتگین کی وفات کے بعد ۹۹۷ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے ۱۰۰۱ء سے لیکر ۱۰۲۷ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور ہر معرکہ میں کامیابی نے اس کے قدم چومے۔

۱۰۰۹ء میں نگرکوٹ (کانگڑہ) فتح کیا۔ یہ قلعہ اس زمانہ میں ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ ۱۰۱۴ء میں تھانیسر کے میدان میں ہندوؤں کو زبردست شکست دی۔ ۱۰۱۸ء میں متھرا اور ۱۰۱۹ء میں قنوج فتح کیا۔ لیکن سومنات کا معرکہ جو ۱۰۲۵ء میں واقع ہوا، اس کی زندگی کا سب سے بڑا جنگی کارنامہ ہے۔ ہندوستان پر آخری حملہ ۱۰۲۷ء میں کیا۔ ان فتوحات کے علاوہ اس نے خوارزم اور ترکستان کو بھی زیرنگیں کیا اور غیر معمولی کامیابی کے بعد ۱۰۳۰ء میں وفات پائی۔ بغداد کے عباسی خلیفہ نے اسے "امین الملۃ یمین الدولہ" کا خطاب عطا کیا تھا۔ سلطان محمود اپنی فتوحات کے اعتبار سے بلاشبہ دنیا کے سب سے بڑے فوجی قائدین میں سے گزرا ہے۔ اس کی عدیم المثال شجاعت، جنگی مہارت، دوربینی اور حوصلہ مندی محتاجِ بیان نہیں ہے۔

عربی قابلیت کے علاوہ وہ علوم و فنون کا بھی بہت بڑا سرپرست اور قدردان تھا یعنی ہمہ صفت موصوف بادشاہ گزرا ہے۔

چونکہ اس فصل میں کوئی شعر مشکل نہیں ہے اس لئے میں اس کا مطلب مجموعی طور پر لکھے دیتا ہوں :۔

کہتے ہیں کہ جب میں نے اس شہر کی موجودہ حالت پر نظر ڈالی تو بہت غمگین ہوا کیونکہ سلطان موصوف کے عہد میں یہ شہر بہت عظیم الشان تھا اس زمانہ میں اس کی گذشتہ عظمت محض افسانہ ہو کر رہ گئی ہے۔

جب میں سلطان موصوف کے مزار پر پہونچا تو دل نے مجھ سے کہا کہ یہ اسی سلطان کی قبر ہے جس کی شان یہ تھی کہ جب کوئی بچہ بولنے کے قابل ہوتا تھا تو سب سے پہلے اس کی زبان پر اس بادشاہ کا نام آتا تھا۔

اقبال کا یہ شعر

ع آنکہ چوں کودک لب از کوثر بشست

فردوسی کے اس شعر سے ماخوذ ہے :۔

چہ کودک لب از شیر مادر بشست
بگہوارہ محمود گوید نخست

اس کی تلوار دشمنوں کو فنا کرنے میں "برق سوزاں" تھی اور جب وہ یلغار کرتا تھا تو دشت اور شہر (سارے ہندوستان) میں لرزہ پڑ جاتا تھا۔ اس کا جنگی علم گویا اللہ کی قدرت کا ایک نشان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے اس کی قبر پر قرآن خوانی کرتے رہتے ہیں۔

اگلے شعر ع شوخیٔ فکرم مرا از من ربود الخ سے اقبالؔ نے عالم خیال میں اس زمانہ کا نقشہ کھینچا ہے جب سلطان زندہ تھا اور غزنی ایک

عظیم الشان شہر تھا۔ سلطان کے محلات قطار در قطار دور تک پھیلے ہوئے تھے اور اس کی بزم میں فردوسی جیسے شاعر نغمہ سرائی کرتے تھے اور سلطان لشکر کشی میں مصروف رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ میں تصور میں سلطان کی بزم اور اس کی لشکر آرائی کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ ایک مرد شوریدہ سر کی مناجات نے مجھے چونکا دیا۔ واضح ہو کہ یہ مرد شوریدہ سر، اقبال کے تخیل کی پیداوار ہے۔ آئندہ فصل میں انہوں نے اسی کی زبان سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ مرد شوریدہ سر اپنے خدا سے مصروف گفتگو تھا۔ چونکہ وہ میرے ہی خیالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس لئے میں قدرتی طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

فصل ہشتم

مناجات مردِ شوریدہ در ویرانۂ غزنی

مناجات سے پہلے اقبالؔ نے ایک مختصر تمہید باندھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شئی چند روزہ ہے۔ کسی کو ثبات نہیں ہے مثلاً گلِ لالہ پر غور کرو! آفتاب کی شعاعوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے لالہ کا پودا کس قدر جد وجہد کرتا ہے۔ اس کی تفصیل لکھی جائے تو بلا مبالغہ ایک مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔ ماہرین علم نباتات نے اس موضوع پر کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ لیکن جب موسم بہار میں لالہ کا پھول کھلتا ہے تو بہار زبانِ حال سے اس سے کہتی ہے کہ تیری عمر دو دن سے زیادہ نہیں ہے۔ گویا موت زندگی کے ساتھ لگی ہوتی ہے جہاں زندگی ہے وہاں موت بھی ہے غور سے دیکھو تو زندگی، رنج و راحت میں مسلسل جنگ کا نام ہے۔ ہر راحت (نوش) میں کلفت (نیش) پوشیدہ ہے۔ جب تک دوش فنا نہ ہو امروز پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایسی صبح اور ایسی شام سے خدا محفوظ ہی رکھے۔ نہ اس کو قیام ہے نہ اس کو قرار ہے۔

دوسرے بند سے مناجات شروع ہوتی ہے۔ مرد شوریدہ خدا سے کہتا ہے (دراصل اقبالؔ خدا سے کہتے ہیں) کہ اے خدا! اس دنیا میں ہر طرف فتنہ و فساد کی گرم بازاری ہے! نہ خلوت میں دل کو سکون مل سکتا

ہے نہ انجمن میں۔

اے خدا! میں بڑے ادب کے ساتھ تجھ سے پوچھتا ہوں کہ یہ دنیا تیری تقدیر (مشیت) کا نتیجہ ہے یا اسے کسی اور نے پیدا کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ تو ہی اس کا خالق ہے تو یہ کیا بات ہے کہ اس دنیا کے لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ ظاہر میں تو ہر شخص دوسروں سے ہمدردی (صلح و صفا) کا دعویٰ کرتا ہے مگر باطن میں ہر شخص دوسروں کو تباہ کرنے پر آمادہ ہے؟ چونکہ ہر طرف منافقت اور فریب کا بازار گرم ہے اس لئے جو لوگ حق پرست ہیں وہ دنیا والوں کے ظلم و ستم کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ جو شخص صداقت کو شعارِ زندگی بناتا ہے وہ ہر قسم کی آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تیرے بندوں کے لئے تو یہ دنیا سراسر جہنم بن گئی ہے۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ نکوکاروں اور حق پرستوں کو عزت اور سرداری نصیب ہوتی مگر ہو یہ رہا ہے کہ یورپ کے باشندے (لالہ رویانِ فرنگ) تیرے لطف و کرم سے حصہ وافر پا رہے ہیں۔ تیری نگاہِ عنایت اُن لوگوں پر ہے جو ظلم و ستم کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، جو رات دن تیرے بندوں کو اپنا غلام بنا رہے ہیں اور بیگناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہے ہیں۔

اندریں حالات یہ کائنات جو تیری پیدا کردہ ہے۔ ربط و ضبط حاصل کرنے کے لئے کس کی بارگاہ کا رُخ کرے؟ یعنی تیرے بندے کس کے پاس جائیں؟ تو ہی ان کا آقا و مولیٰ ہے مگر تیری عنایت تو بُت پرستوں پر مبذول ہو رہی ہے!

اے خدا! ورا اصل مسلمان (بندۂ حق) اس دنیا میں تیرا نائب تھا وہ تیرے قانون کو دنیا میں نافذ کرکے تیرے بندوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نجات دلا

سکتا تھا مگر وہ "نقرہ و فرزند و زن" دنیا کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔ اس لئے میں تجھ سے ملتجی ہوں کہ اگر ہو سکے تو اس کے دل سے دنیا کی محبت نکال دے (سومنات او شکن)۔

اے خدا! میں حیران ہوں کہ یہ موجودہ زمانہ کا مسلمان کس خدا کا پرستار ہے؟ اگر تیرا بندہ ہوتا یعنی اگر قرآن کا پیرو ہوتا تو پھر اس کی زندگی میں بے جہود و سکون ہرگز نہ ہوتا کیونکہ قرآن تو سراسر جد و جہد، عمل صالح اور سعی پیہم کی تعلیم دیتا ہے جس کا ثبوت صحابۂ کرام رض کی زندگیوں سے بخوبی مل سکتا ہے لیکن موجودہ دور کے مسلمان کی حالت یہ ہے کہ اس کا سینہ سوز و گداز سے بالکل خالی ہے اور اس کی زندگی سراسر جمود اور سکون ہے۔ تو نے اسے اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دے لیکن وہ خود مُردہ ہو گیا ہے۔ اس کا دل یقین سے بیگانہ ہے اور اس کی زندگی ذلت و خواری کی تصویر ہے۔ آج دنیا میں اس کے وجود کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس کی آستین میں بُت پوشیدہ ہیں۔ یعنی وہ غیر اللہ کا پرستار ہے اور کافروں کی طرح موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتا ہے اس لئے مرنے سے ڈرتا ہے۔

اے خدا! اس کے دل کو دوبارہ سوزِ یقین سے گرما دے اور اس کے اندر پھر وہی طلب اور جستجو پیدا کر دے جو اس کے اسلاف کا طغرائے امتیاز تھی۔ (طلب اور جستجو سے مراد ہے حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ)

اے خدا! مسلمان کو پھر عشقِ رسول ص کی نعمت عطا کر (جنون ذو فنون سے مراد ہے ایسا عشق جو اس کو حصولِ مقصد کی راہوں سے آگاہ کر دے)۔

اے خدا! اسے ایسی طاقت عطا کر کہ وہ مشرقی ممالک (مراد ہے

دنیائے اسلام) کو فرنگیوں کے تسلّط سے آزاد کر سکے اور مشرق میں نئے دَور کا آغاز کر سکے۔ اس کو ایسی طاقت عطا کر کہ وہ فراعنۂ وقت کو مغلوب کر سکے اور دشمنانِ دین پر اپنی دھاک بٹھا سکے۔

ع۔ بحرِ احمر را بچوب اور شگاف الخ میں تلمیح ہے حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کی طرف۔ یعنی جب اُنہوں نے اپنا عصا پانی پر مارا تو سمندر پایاب ہو گیا اور وہ اپنے ساتھیوں کو لیکر پار اُتر گئے لیکن فرعون ڈوب گیا۔

فصل نہم

قندھار و زیارت خرقہ مبارک

اس فصل میں اقبالؔ نے اپنے سفر قندھار کا حال بیان کیا ہے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خرقہ مبارک کی زیارت کی اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے۔

اوّلاً پانچ اشعار میں قندھار کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد ایک مناسب حال غزل لکھی ہے، آخر میں خرقہ مبارک کی زیارت کا حال بیان کیا ہے۔

قندھار بہت پرانا شہر ہے۔ روایت یہ ہے کہ سکندر نے اسے آباد کیا تھا۔ اشوکؔ کے زمانہ میں بودھ دھرم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ کابل سے ۲۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے اور افغانستان کا مشہور تجارتی مرکز ہے۔ آبادی ۶۰ ہزار نفوس ہے۔

کہتے ہیں کہ قندھار بہت دلکش اور حسین شہر ہے۔ یہاں کی آب و ہوا پھولوں کی کثرت کی وجہ سے خوشبو دار ہے اور پانی بہت شفاف ہے یہاں کے کوہساروں میں گل لالہ بکثرت اگتا ہے اور یہاں کے انار یعنی ان کے دانے اس قدر سرخ ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے آگ کو منجمد کر دیا ہے۔ (اوّل الذکر نار سے آگ اور آخر الذکر نار سے انار مراد ہے)۔

اس شہر کا وہ کوچہ جس میں خرقہ مبارک محفوظ ہے، میری نگاہ میں کوئے دوست سے کم نہیں ہے۔ اس لئے میں ساربان سے کہتا ہوں کہ مجھے کوئے دوست کی طرف لے چل، اور میں ارباب عشق و محبت کی یاد میں نغمہ سرائی کرتا ہوں تاکہ ناقہ وجد میں آکر تیزی کے ساتھ چل سکے۔

غزل

اقبال نے اس موقعہ پر یہ عاشقانہ غزل اس لئے لکھی ہے کہ وہ خرقہ مبارک کا ذکر کرنے والے ہیں اور یہ خرقہ اس ذات قدسی صفات (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے جو تمام مسلمانوں کی محبوب ہے، لہذا اس غزل کے ذریعہ سے وہ پڑھنے والوں کے دلوں میں آتش شوق بھڑکانا چاہتے ہیں۔

پہلا شعر:- دیر مغاں کنایہ ہے خانقاہ مرشد سے۔ اصطلاح تصوف میں منزل لا سے مقام فنا بھی مراد ہے اور یہ عالم محسوس بھی۔ اور منزل الا سے مقام بقا مراد ہے۔ سالک جب لا الہ کہتا ہے تو وہ اس عالم محسوس (عالم شہادت) کی نفی کر دیتا ہے یعنی کوئی شی بذات خود موجود نہیں ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مجھے عالم شہادت میں بھی ہر طرف خدا ہی خدا نظر آتا تھا (یہی مقام الا ہے) یعنی مقام بقا حاصل ہو گیا تھا اس لئے مجھے (دیر مغاں (خانقاہ) میں کسی صہبا (توجہ مرشد) کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ میں منزل لا ہی میں بادۂ الا سے مست ہو چکا تھا۔ مطلب یہ کہ عموماً سالک کو جو مقام منزل الا کے بعد حاصل ہوتا ہے وہ مجھے منزل لا ہی میں حاصل ہو گیا تھا اس لئے من اندر دیر مغاں، بے گردش صہبا، مست می آیم۔

دوسرا شعر:- میں جانتا ہوں کہ ساقی ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق پلاتا

ہے۔ چونکہ مجھے شراب مست نہیں کر سکتی (اپنے ظرف کی وسعت کی طرف اشارہ ہے) اس لئے اس نے مجھے اپنے عشوہ اور ادا سے مست بنا دیا یعنی میری طرف ایسی محبت بھری نگاہوں سے دیکھا کہ میں بے پیئے مست ہو گیا۔ واضح ہو کہ محبوب کی محبت بھری نگاہوں سے جو کیفیت (مستی) عاشق کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ جام شراب سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔

تیسرا شعر:۔ چونکہ مسلمانوں کے رہنما (پیرانِ حرم) ان کو انگریزوں سے وفاداری کا درس دے رہے ہیں اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ انہیں مرشد رومیؒ کی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے یعنی انہیں عشق رسولؐ کا سبق پڑھایا جائے۔ واضح ہو کہ مرشد رومیؒ نے مثنوی میں مسلمانوں کو عشق رسولؐ ہی کا پیغام دیا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اے مسلمان! اگر تو اللہ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنی چاہتا ہے تو حکما کی صحبت کی بجائے عاشقانِ الٰہی کی صحبت اختیار کر۔ یاد رکھ کہ صد بندگانِ ساحل مست پر ایک بندۂ دریا مست بدرجہا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ بندۂ ساحل مست سے مراد ہے فلسفی یا عالم دین جو عقلی دلائل سے خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور ارباب علم جانتے ہیں کہ عقلی دلائل سے وہ یقین پیدا نہیں ہو سکتا جو انسان کو جہاد یا سرفروشی پر آمادہ کر سکے بندۂ دریا مست سے مراد ہے عارف یا عاشق جس کو دل کے آئینہ میں تصویر یار نظر آجاتی ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ دیکھنے کے بعد یقین کامل پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر شک یا شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

پانچواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح "لالۂ صحرا" کو جنگل ہی کی آب و ہوا راس آتی ہے اسی طرح عاشق کو خلوت ہی میں راحت نصیب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں ان لوگوں کی صحبت (چمن) میں بیٹھا تو میرا دل ان کی باتوں

(بادِ چمن) سے افسردہ اور ملول ہوگیا۔

چھٹا شعر:۔ کل میں نے ایک عاشق (کافر) کو دیکھا کہ وادی بطحا میں بحالتِ مستی اپنے دل سے گفتگو کر رہا تھا جب میں نے اس کی گفتگو سنی تو میں بہت حیران ہوا کہ یہ شخص دیکھنے میں تو دین سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے مگر اس کی باتیں اسلام کے حقائق و معارف سے لبریز ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص عشقِ رسول اختیار کرلے تو اس پر دین کے اسرار عیاں ہو جاتے ہیں۔

ساتواں شعر:۔ یا رب! یہ مقام (جہاں خرقۂ مبارک رکھا ہوا ہے) سینا ہے یا فاران ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ میری خاک (میرے جسم) کا ہر ذرّہ اشتیاقِ دیدار میں آنکھ بن گیا ہے۔

آخری شعر:۔ خرقۂ مبارک کے ذکر کی تمہید ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اقبال نے خرقۂ مبارک کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ اس کے متعلق صرف ایک شعر لکھا ہے اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں چار شعر لکھے ہیں پھر اپنے جذبات قلبی کا تمثیلی رنگ میں اظہار کیا ہے۔

خرقۂ آں "برزخ لا یبغیان"

دیدمش در نکتۂ "لی خرقتان"

"برزخ لا یبغیان" میں تلمیح ہے اس آیت کی طرف:۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (۵۵-۲)

خدا نے چلائے دو دریا ملکر چلنے والے، ان دونوں میں ہے ایک پردہ تاکہ ایک دریا دوسرے دریا پر زیادتی نہ کرے۔

لی خرقتان میں تلمیح ہے اس حدیث کی طرف:۔

لی خرقتانِ اَلْفَقْرُ وَالْجِهَاد یعنی میرے لئے دو خرقے (دو شعار)

ہیں۔ ایک فقر اور دوسرا جہاد۔ مطلب یہ ہے کہ میری زندگی میں دو شانیں ہیں یا میری شخصیت کے دو پہلو (رُخ) ہیں اور یہ دو شانیں میری پوری زندگی کی نمائندہ ہیں۔

پہلی شان کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ سے وابستہ ہیں اور اس دنیا سے بے تعلق ہیں۔ دنیا کی کوئی شئی آپؐ کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی۔ مال و دولت، زن و فرزند، محلات و باغات، حکومت و سلطنت سب آپؐ کی نظر میں ہیچ ہیں۔ آپؐ صرف اللہ کے لئے جیتے ہیں۔ وہی آپؐ کا مقصود ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

آپؐ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور جملہ رسوم دینی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لئے ہے۔

شانِ فقر کا یہی مفہوم ہے کہ صاحبِ فقر دنیا سے ناتا توڑ کر اللہ سے رشتہ جوڑ لیتا ہے۔

دوسری شان کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے قانون کو دنیا میں نافذ کرنے کے لئے ہر وقت مصروف جہاد ہیں اور اس بنا پر آپؐ بظاہر تمام دنیاوی معاملات میں حصہ لیتے ہیں۔ یعنی باطن میں دنیا سے بے تعلق ہیں مگر ظاہر میں اس سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ تعلق ظاہری بھی محض اللہ کے لئے ہے مثلاً اگر آپؐ جہاد کر کے کوئی خطۂ زمین فتح کرتے ہیں تو اپنے لئے نہیں بلکہ اس لئے فتح کرتے ہیں کہ اس میں اللہ کا قانون جاری ہو سکے یا اگر آپؐ صحابہ کرامؓ سے مال و دولت طلب فرماتے ہیں تو اپنے لئے نہیں بلکہ جہاد کی تیاری کے لئے۔ حد یہ ہے کہ اگر آپ کھانا بھی

کھاتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ لذتِ کام و دہن مطلوب ہے بلکہ اس لئے کہ جہاد میں شرکت کے لئے جسم میں طاقت قائم رہے۔ وقس علیٰ ھذا

چنانچہ آپؐ نے بفضلِ خدا سارا عرب مسخر فرما لیا لیکن دنیا جانتی ہے کہ آپؐ نے "بادشاہ" ہو جانے کے بعد بھی اپنے لئے نہ کوئی محل تعمیر کرایا۔ نہ دو وقت شکم سیر ہو کر کھانا کھایا، نہ سونا چاندی اپنے پاس جمع کیا اور نہ راحت کا کوئی سامان مہیا کیا۔ شانِ فقر کا مفہوم یہی ہے کہ ساری دنیا قدموں میں ہو مگر اس کی طرف التفات نہ ہو۔

یہاں اقبالؔ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات کو برزخ سے تعبیر کیا ہے اور یہ لفظ سورۂ رحمٰن کی آیت مذکورہ بالا سے مستعار لیا ہے۔ برزخ کے لغوی معنی ہیں "اَلْحَاجِزُ وَ الْحَدُّ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ" یعنی دو چیزوں میں فصل اور حد۔ یعنی برزخ وہ ہے جو دو چیزوں کے مابین حائل یا فاصل ہو کر انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ یہیں سے اس لفظ کے معنیٰ پردہ، حجاب، آڑ یا روک کے ہو گئے۔

اقبالؔ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برزخ اس لئے لکھا ہے کہ آپؐ، واجب اور ممکن (خالق اور مخلوق) کے درمیان حدِ فاصل ہیں اور ارباب علم سے یہ نکتہ پوشیدہ نہیں ہے کہ حدِ فاصل (برزخ) میں دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں لہٰذا آپؐ میں بھی وجوب اور امکان یہ دونوں شانیں جمع ہو گئی ہیں۔ اس کو ذیل کی مثال سے واضح کرتا ہوں۔

تین نقطے فرض کرو الف ا ب ب اور ج ج اور انہیں برابر برابر رکھو۔ اب نقطہ ب، الف اور ج کے مابین حدِ فاصل ہے اور اس نقطہ کا دایاں پہلو الف سے متصل ہے اور بایاں پہلو جیم سے جو شخص اول الذکر پہلو کو دیکھے گا

اسے نقطۂ ب، الف سے مربوط نظر آئے گا اور جو شخص آخر الذکر پہلو پر نظر کرے گا اسے نقطۂ ب جیم سے وابستہ محسوس ہو گا۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک طرف سے واجب سے مربوط ہے دوسری طرف سے ممکن سے۔ اگر آپ کے بشری پہلو کو دیکھو تو آپ بلا شبہ انسان یا بشر ہیں جس پر "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" شاہد ہے یعنی اے رسول! آپ کہہ دیجئے کہ میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں۔

لیکن آپ کے روحانی پہلو (حقیقت محمدی) کو دیکھو تو آپ حق تعالیٰ سے واصل ہیں کیونکہ آپ "نُورٌ مِّنْ نُّورِ اللّٰهِ" ہیں جس پر "وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" ناطق ہے یعنی اے رسول! جب آپ نے وہ کنکریاں دشمنوں کی طرف پھینکیں تو آپ نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔ اسی مضمون کی دوسری آیت یہ ہے:۔

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (یعنی جب آپ نے صحابہؓ سے بیعت لی تو ان کے ہاتھوں پر آپ کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ) ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔

پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے آپ کے فعل کو اپنا فعل اور دوسری آیت میں آپ کے دستِ مبارک کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ کو اللہ سے وہ رابطہ حاصل ہے جو کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سوا نہ کسی مخلوق کے فعل کو اپنا فعل قرار دیا ہے اور نہ کسی بشر کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے۔ اسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے

ادھر مخلوق میں شامل ادھر اللہ سے واصل
خواص اس برزخ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا (محسن کاکوری مرحوم)

ان تصریحات ضروریہ کے بعد اب شعر کا مطلب لکھتا ہوں:۔ کہتے ہیں کہ جب

میں نے حضورؐ کا خرقۂ مبارک دیکھا تو معاً میرا ذہن حضورؐ کے اس ارشاد کی طرف منتقل ہوا کہ آپؐ فرماتے ہیں کہ میری زندگی (شخصیت) کی دو شانیں ہیں ایک شانِ فقر ہے، دوسری جہاد ہے۔

واضح ہو کہ فقر اور جہاد میں منطقی لزوم پایا جاتا ہے یعنی جس شخص میں شانِ فقر پیدا ہو جائے گی وہ لازمی طور پر جہاد فی سبیل اللہ کرے گا اور جو شخص مجاہد فی سبیل اللہ ہے وہ لازمی طور پر شانِ فقر کا مالک ہوگا فقر کا تقاضا جہاد ہے صاحب فقر اسی طرح جہاد کی طرف مائل ہو جاتا ہے جس طرح بلوغ کے بعد انسان کے اندر نکاح کی طرف میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

(ا) ذکر اور فکر کے امتزاج سے شانِ فقر پیدا ہوتی ہے۔

(ب) فقر انسان کو جہاد فی سبیل اللہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔

(ج) جہاد فی سبیل اللہ، مقصدِ حیاتِ مسلم ہے۔

حضورؐ نے فقر اور جہاد کو اپنی زندگی میں جمع کر کے اسلام کی عملی تفسیر دنیا کے سامنے پیش کر دی یعنی اسلام نام ہے فقر اور جہاد کا۔ اسی لئے اقبال نے آئندہ اشعار میں خود اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ

آپؐ کا دین، جو دراصل آئینِ حیات ہے اس ساری کائنات کی تفسیر ہے یعنی کائنات پیدا ہی اس لئے کی گئی ہے کہ مومن اسے تسخیر کرے اور تسخیر کے بعد اس میں دین اسلام (آئین حیات) نافذ کرے۔ اسلام صرف مذہب نہیں ہے بلکہ وہ پوری زندگی کا دستور العمل (ضابطۂ حیات) بھی ہے یعنی اسلام، دوسرے مذاہبِ عالم کی طرح محض پوجا پاٹ اور چند رسوم کا نام نہیں ہے بلکہ دین یا آئین ہے یعنی حیاتِ اجتماعیہ کا مکمل ضابطہ اور دستور العمل ہے۔

دوسرے مصرع میں یہ نکتۂ عجیبہ بیان کیا ہے :-

ع در جبینِ او خطِ تقدیرِ کل

اس مصرع کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ آپؐ کی پیشانی میں اللہ تعالےٰ نے ساری کائنات کی تقدیر مندرج کر دی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ ساری کائنات کے آقا اور رہنما ہیں۔ کائنات کی تقدیر سے مراد یہ ہے کہ یہ کائنات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کی ہر شئی آپؐ کی اتباع (اطاعت) کرے۔ جس طرح شبنم کی تقدیر افتادگی ہے، دریا کی تقدیر ہر وقت بہنا ہے ہوا کی تقدیر چلنا ہے، آگ کی تقدیر جلانا ہے اسی طرح کائنات کی تقدیر (غایتِ تخلیق) حضورؐ کی اتباع اور اطاعت ہے۔ اس کائنات میں جو شئی آپؐ کی اطاعت نہیں کرے گی وہ عبث اور بیکار قرار پائے گی۔ خدا کی نگاہ میں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی جس طرح آقا کی نظر میں نافرمان خادم کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ بادل کی تقدیر برسنا اور زمین کو سیراب کرنا ہے اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں، اسی طرح جو شخص آپؐ کی اطاعت نہیں کرتا، اس کا وجود، عدم دونوں یکساں ہیں۔

دوسرا شعر:- آپؐ کی بدولت عقل صاحب اسرار ہوئی اور آپؐ ہی کے طفیل سے عشق میں تاثیر پیدا ہوئی یعنی آپؐ کا اتباع کرنے سے انسان کی عقل صاحبِ اسرار ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دگر، انسان صاحب اسرار یا کائنات کے رموز سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ جب تک کوئی شخص آپؐ کی اتباع نہ کرے اس کی عقل کامل نہیں ہو سکتی اور جب تک آپؐ سے محبت نہ کرے اس میں جوہر پیدا نہیں ہو سکتا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انسان میں دو بنیادی قوتیں ہیں، عقل اور عشق، اور یہ دونوں قوتیں آپؐ کی اطاعت ہی سے مرتبۂ کمال کو پہنچ سکتی ہیں

تیسرا شعر:- آپؐ کی ذاتِ پاک، عشق (عاشقوں) کی منزلِ مقصود ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر یہ صفت اس لئے رکھی ہے کہ ہم آپؐ کو اپنا محبوب بنائیں۔ آپؐ ہی محبوبِ حقیقی ہیں۔ جب تک آپؐ کی محبت سارے کی محبتوں پر غالب نہ ہو کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا۔ بلکہ آپؐ کی محبت کی بدولت انسان خود محبوبِ خدا بن جاتا ہے۔ جو شخص آپؐ سے محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ خود اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ عظیم میں وارد ہے:-

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اے رسولؐ! آپؐ مسلمانوں کو آگاہ کر دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنی چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

دوسرے مصرعے میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ تمام انسان بمنزلہ "مشتِ خاک" ہیں یعنی ہیچ اور ناکارہ، بے قدر و قیمت۔ ہاں جب اُن کے اندر آپؐ کی محبت جلوہ گر ہو جاتی ہے تو وہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ بالفاظِ دگر آپؐ کو بنی آدم سے وہی نسبت ہے جو دل کو جسدِ انسانی سے ہے۔ جس طرح دل کے بغیر جسم مُردہ ہے۔ اسی طرح آپؐ کی محبت کے بغیر انسان مُردہ ہے۔ خلاصۂ کلام اینکہ، آپؐ کی ذاتِ بابرکات، مرکزِ حیات ہے۔

چوتھا شعر:- جس طرح حضورؐ کی معراج یہ تھی کہ آپؐ نے خدا کو دیکھا اسی طرح ہماری معراج (انتہائی روحانی بلندی) یہ ہے کہ ہم آپؐ کو دیکھ لیں یعنی آپؐ کی حقیقت (حقیقتِ محمدیؐ) سے آگاہ ہو جائیں۔ اور یہ بات فنافی الرسولؐ ہونے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم فنافی الرسولؐ ہو جائیں۔ (آپؐ کے دیکھنے کا یہی طریقہ ہے) تو ہمیں معراج نصیب ہو سکتی ہے۔

واضح ہو کہ کسی فنی کو دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ناظر خود منظور بن جائے

یعنی جیسے دیکھنا چاہتا ہے خود وہی بن جائے۔ چنانچہ رومیؒ فرماتے ہیں ؎

پس قیامت شو قیامت را ببیں
دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

پس حضورؐ کو دیکھنا چاہتے ہو تو حضور کے تمام کمالات کا عکس اپنے اندر پیدا کر لو۔ اسی کو تصوف کی اصطلاح میں مقام فنا فی الرسولؐ کہتے ہیں۔ فنا سے مراد یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو فنا کر دو اور حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلو۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو تقلید یا اتباعِ رسولؐ کہتے ہیں اتباع کے واسطے سے مومن میں کمالاتِ نبوت منعکس ہو جاتے ہیں۔ جس طرح لوہا اگر کچھ عرصہ تک آگ میں پڑا رہے تو اس میں بھی آگ کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔

دوسرے مصرع میں یہ کہتے ہیں کہ ہماری مسجد اقصیٰ یا ہمارا انتہائی روحانی عروج آپؐ کی ذات میں پوشیدہ ہے یعنی اگر ہم آپؐ تک پہنچ جائیں تو گویا مقصدِ حیات حاصل ہو گیا۔

اس کے بعد اقبال نے اپنے جذبات کا تمثیلی رنگ میں اظہار کیا ہے اس لئے میں ان تمام اشعار کا مطلب مجموعی طور پر لکھتا ہوں :۔

کہتے ہیں کہ آپؐ کے خرقۂ مبارک سے مجھے آپؐ کے جسم اطہر کی خوشبو آئی تو اس خوشبو نے مجھے مست کر دیا اور میرے دل میں عشقِ رسولؐ کا بے پناہ جذبہ موجزن ہو گیا۔

؏ بادہ پر زور و پیمانہ چہ کرد۔ اس مصرع میں "بادہ" سے شوق بے پروا اور "مینا" سے دلِ عاشق مراد ہے۔ کہتے ہیں کہ جوشِ جنوں کی بنا پر میرا دل سینہ میں رقص کرنے لگا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عنقریب میرا دل آنسو بن کر

آنکھوں کی راہ سے ٹپکنے لگے گا۔

میرے دل نے کہا کہ میں جبرائیل اور نورِ مبین ہوں! اقبالؔ دراصل اس پردے میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مومن کامل کا دل، پاکی اور قرب کے لحاظ سے بمنزلہ جبرئیلؑ اور نورِ مبین (قرآن) ہو جاتا ہے۔ جبرئیل اور قرآن، دونوں کو حق تعالیٰ سے ایک خاص نسبت اور قرب حاصل ہے۔ قرآن، اللہ کا کلام ہے اور جبرئیلؑ اس کلام کے حامل ہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا مومن کامل کو بھی بتابعیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکالمات و مخاطبات سے مشرف فرماتا ہے۔ چنانچہ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ، مجددِ الفِ ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلویؒ، ان تینوں بزرگوں نے اپنی تصانیف میں اس بات کی صراحت کی ہے۔ (دیکھو فتوحاتِ مکیہ، مکتوبات اور فیوض الحرمین)۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پہلے اپنے قلب کی یہ حالت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میرا دل اس وقت رومیؒ کے اشعار پڑھ رہا تھا اور کبھی ہنستا تھا، کبھی روتا تھا! میں حیران تھا کہ یہ دیوانہ فرزانہ کون ہے؟ جو حرم میں مجھ سے ایسی رندانہ گفتگو کر رہا ہے اور شراب، مُغ زادہ اور پیمانہ کا تذکرہ سنا رہا ہے! یعنی معرفت کے رموز بیان کر رہا ہے!

میں نے دل سے کہا کہ یہ بے باکانہ گفتگو کیسی ہے! خاموش ہو جا! یہ تو بڑے ادب (خاموشی) کا مقام ہے! اے دل! میں نے اپنے خونِ جگر سے تیری پرورش کی ہے اور بڑے مجاہدوں کے بعد تجھے صاحبِ آہِ سحر (عاشقِ رسولؐ) بنایا ہے۔ اے دل! اس نکتہ کو ملحوظ رکھ کہ مردانِ خدا کا عشق، ضبطِ احوال کا نام ہے یعنی عاشقانِ صادق اپنے حالات کو

پوشیدہ رکھتے ہیں۔ یہ سن کر دل نے کہا کہ اے اقبالؔ! عقل و ہوش تو دل (عاشق) کے لئے باعث آزار ہوتے ہیں یعنی عاشق میں ضبط کی تاب کہاں! عشق کا کام تو مستگی اور وارفتگی ہے۔ یہ کہہ کر میرے دل پر عالم مستی طاری ہو گیا اور وہ محبت کی آگ میں جل کر فنا ہو گیا۔

مطلب یہ ہے کہ اس شاعرانہ انداز میں اقبالؔ نے ان کیفیات کا نقشہ کھینچا ہے جو خرقۂ مبارک کو دیکھ کر ان کے قلب پر طاری ہوئیں۔

فصل دہم

زیارت مزار احمد شاہ بابا (ابدالی)

اس فصل میں اقبال نے احمد شاہ ابدالی کے مزار کی زیارت کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے اسے "مؤسس ملت افغانیہ" قرار دیا ہے کیونکہ اس نے افغانوں کو ایرانی حکومت کی غلامی سے آزاد کر کے ایک مستقل قوم بنا دیا

ابدالی کے سوانح حیات

اس کا نام احمد خاں تھا۔ اس کا باپ زماں خاں، سدوزئی قبیلہ سے تھا۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ ایک شخص ترین نامی تھا جسے اس کے شیخ طریقت حضرت خواجہ ابو احمد ابدال چشتیؒ نے ابدالی کا لقب دیا تھا اس لئے احمد خاں نے بادشاہ ہو کر اپنا نام احمد شاہ ابدالی رکھا۔

سیاسی وجوہ کی بنا پر زمانی خاں ترک وطن کر کے ملتان میں سکونت پذیر ہو گیا یہیں احمد خاں پیدا ہوا مگر ۱۷۳۵ء میں زماں خاں پھر اپنے وطن ہرات واپس چلا گیا، جہاں اس کا بڑا بیٹا ذوالفقار خاں، نادر شاہ کے خلاف برسر پیکار تھا۔ مگر اسے شکست ہوئی لیکن نادر شاہ نے ذوالفقار خاں کو اپنی طرف سے ہرات کا صوبہ دار بنا دیا اور احمد خاں کو اپنے باڈی گارڈ میں ایک ہزار سواروں پر افسر مقرر کر دیا۔

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانوں نے احمد خاں کو اپنا

بادشاہ تسلیم کر لیا اور اس کے روحانی مشیر صابر شاہ نے اُسے دُرِّ دُرّانی بادشاہ کا لقب دیا۔ اسی لئے اسے مورخین احمد شاہ درانی بھی لکھتے ہیں۔

احمد شاہ نے شاہ ولی خاں کو وزیر اور شاہ پسند خاں کو سپہ سالار مقرر کیا۔ مگر اس کے پاس روپیہ بالکل نہ تھا۔ چونکہ اسے خدا نے بادشاہ بنایا تھا۔ اس لئے روپیہ کا انتظام بھی کر دیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ جون ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کا گماشتہ تقی خاں ۳۵ لاکھ روپیہ پشاور سے وصول کر کے قندھار پہنچا۔ اور یہ ساری رقم بلا کوشش احمد شاہ کو مل گئی۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا کسی پر مہربان ہوتا ہے تو سارے انتظامات خود کر دیتا ہے فی الجملہ احمد شاہ نے ۶ ماہ کے قلیل عرصہ میں تمام ممالک فتح کر لیا۔ اور ۱۷۴۸ء سے ۱۷۷۳ء تا دم وفات مسلسل فتوحات حاصل کرتا رہا۔

ہندوستان پر پہلا حملہ:۔ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ نے پہلا حملہ کیا اور پنجاب فتح کر کے معین الملک عرف میر منّو کو اپنا گورنر مقرر کیا۔

دوسرا حملہ:۔ ۱۷۵۰ء میں دوسری بار حملہ آور ہوا۔

تیسرا حملہ:۔ ۱۷۵۲ء میں تیسری مرتبہ پنجاب پر حملہ کیا اور اس مرتبہ پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد کشمیر بھی فتح کیا۔

چوتھا حملہ:۔ ۱۷۵۶ء میں چوتھی مرتبہ حملہ کیا اور دہلی فتح کر کے نجیب خاں کو نجیب الدولہ کا لقب عطا کیا اور متھرا اور آگرہ فتح کرنے بھیجا۔ چلتے وقت نجیب الدولہ کو اپنی طرف سے دلی میں اپنا وکیل اور مختار مطلق مقرر کیا۔ احمد شاہ اس مرتبہ دلّی سے بے شمار دولت اپنے ساتھ لے گیا۔

پانچواں حملہ:۔ چونکہ ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں نے دلّی پر قبضہ کر کے نجیب الدولہ کو برطرف کر دیا اس لئے اُس نے احمد شاہ کو تمام حالات سے مطلع کیا۔

چنانچہ احمد شاہ ۱۷۵۹ء میں پانچویں بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ یہ حملہ سب سے زیادہ مشہور ہے کیونکہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی واقع ہوئی جس میں مرہٹوں کو زبردست شکست ہوئی۔ اس لئے ہم اس حملہ کا حال قدرے تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:

۱۷۵۸ء میں غدار قوم آدینہ بیگ نے مرہٹوں کو پنجاب آنے کی دعوت دی۔ تاکہ افغانوں کو پنجاب سے نکالا جاسکے۔ چنانچہ مرہٹوں نے آدینہ بیگ کی مدد سے پنجاب فتح کر لیا اور دلی پر بھی قابض ہو گئے۔ چونکہ اس کامیابی سے مرہٹے از اٹک (پشاور) تا کٹک (اڑیسہ) سارے ہندوستان کے مالک ہو گئے تھے اور دلی بھی ان کے قبضہ میں آگئی تھی اس لئے وہ سارے ہندوستان پر حکومت کا خواب دیکھنے لگے اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لال قلعہ میں باقاعدہ وشواس راؤ کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا جائے اور مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کر دیا جائے۔

نجیب الدولہ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مشورہ اور ان کے ایما سے احمد شاہ ابدالی کو ان تمام حالات سے مطلع کیا۔ چنانچہ احمد شاہ نے پانچویں مرتبہ لشکر کشی کی۔ پہلے پنجاب سے مرہٹوں کو نکالا۔ اس کے بعد ان سے ایک فیصلہ کن جنگ کا انصرام کیا۔ نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ، حافظ رحمت خان، نواب دوندے خان، نواب علی محمد خان اور دوسرے روہیلہ سرداروں کو احمد شاہ ابدالی کے زیر علم جمع کیا اور اس کے بعد دلی، آگرہ اور دوآبہ سے مرہٹوں کے اقتدار کا خاتمہ کیا، اور اس طرح ۱۷۶۱ء فیصلہ کن جنگ کی بنیاد پڑی۔ ں میں ختم ہو گیا۔

ادھر مرہٹے بھی غافل نہیں تھے۔ پیشوا نے افغانوں کا مقابلہ کرنے

کے لئے پوری تیاری کی اور ایک عظیم الشان لشکر اپنے بیٹے وشواش راؤ کی سرکردگی میں پونا سے دلی بھیجا۔ چونکہ وشواش راؤ ایک ۱۷-۱۸ سالہ ناتجربہ کار نوجوان تھا اس لئے سداشیو راؤ المعروف بہ بھاؤ کو اس کا مشیر خاص بنایا۔

مرہٹوں نے اپنے آپ کو مغلیہ سلطنت کا محافظ مشہور کر کے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ شجاع الدولہ کو لکھا کہ آپ اور ہم دونوں ہندوستانی ہیں اور مغلیہ سلطنت کے ہوا خواہ بلکہ خادم ہیں۔ اس لئے آپ ہمارا ساتھ دیں مگر شجاع الدولہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔

فی الجملہ بھاؤ اپنا لشکر لیکر دکن سے چلا۔ ۲۵ مارچ ۱۷۶۰ء کو برہانپور پہنچا، ۱۶ مئی کو سرونج، ۲ جون کو گوالیار، اور ۸ جولائی کو دھولپور۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شجاع الدولہ اس کا ساتھ نہیں دیگا۔ بہر کیف وہ آگے بڑھا اور ۳ اگست کو لال قلعہ پر قابض ہو گیا۔ ۶ اگست کو اس کے حکم سے دیوان خاص کی چاندی کی چھت اکھاڑی گئی اور اس چاندی سے نو لاکھ روپے ڈھالے گئے۔

۱۰ اکتوبر کو بھاؤ نے شاہجہاں ثانی کو معزول کیا اور اس کی جگہ شاہزادہ عالی گوہر کی بادشاہت کا اعلان کیا اور چونکہ یہ شہزادہ دلی موجود نہ تھا اس لئے اس کے بڑے بیٹے کو جس کا نام مرزا جواں بخت تھا، اس کی جگہ تخت نشین کیا۔ یہ رسمی کارروائی سیاسی مصلحت کی بنا پر کی گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر بھاؤ نے کنج پورہ فتح کیا اور وہاں سے چل کر ۲۹ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت پہنچا جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ مقدر تھا۔ یکم نومبر کو احمد شاہ ابدالی بھی پانی پت پہنچا اور دونوں فوجیں لڑائی کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن دسمبر میں مرہٹوں کے حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ بھاؤ نے

جنوری ۱۷۶۱ء کے پہلے ہفتہ میں احمد شاہ کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔

بادشاہ کے وزیر شاہ ولی خاں نے صلح کا مشورہ دیا مگر نجیب الدولہ نے شدید مخالفت کی اور روہیلہ فوج کے قاضی محمد ادریس نے بادشاہ سے کہا کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔ اس کے بعد اُس نے جہاد کی فضیلت پر خطبہ دیا جس کا یہ اثر ہوا کہ ابدالی کی فوج کے تمام افسروں نے یک زبان ہو کر بادشاہ سے جہاد کی التجا کی۔ چنانچہ بادشاہ نے صلح کا پیغام رد کر دیا۔

چونکہ بھاؤ کی فوج دو ماہ سے فاقے کر رہی تھی اس لئے ۱۳ جنوری کو بھاؤ کے افسروں نے کہا کہ ہرچہ باداباد۔ آج سپاہیوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دیجئے کل ہم لوگ میدان جنگ کی طرف چلیں گے۔

چنانچہ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو دن نکلنے سے پہلے دونوں فوجوں نے میدان جنگ کی طرف کوچ کیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے ابراہیم خاں گارڈی نے ابدالی کے میمنہ پر حملہ کیا، لیکن نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور دوندے خاں نے ابراہیم گارڈی کی تربیت یافتہ پیدل فوج کا بالکل صفایا کر دیا۔

جب بھاؤ نے دیکھا کہ گارڈی کی فوج تباہ ہو چکی ہے تو اُس نے اپنی فوج کے ۱۲ ہزار سواروں کو لے کر ابدالی کے قلب لشکر پر حملہ کیا جس کی کمان شاہ ولی خاں کے ہاتھ میں تھی۔ پہلے حملہ میں ابدالی کی فوج سراسیمہ ہو گئی مگر شاہ ولی خاں نے فوراً ان کے قدم جما دیے اور بادشاہ نے بھی عین وقت پر کمک روانہ کی۔ چنانچہ دس ہزار سواروں نے ایسا حملہ کیا کہ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ تاہم بھاؤ نے ہمت سے کام لیا اور ایک گھنٹہ تک مقابلہ کرتا رہا۔ وشواس راؤ بھی اپنی فوج کو لے کر آگے بڑھا اور بڑی شدت

سے حملہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

جب ابدالی نے دیکھا کہ دشمن کا حوصلہ پست ہو چکا ہے تو اس نے اپنی فوجی قابلیت کے ترکش سے آخری تیر نکالا اور خواص کے دستے کو جو بندوقوں سے مسلح تھے حکم دیا کہ مرہٹوں کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ چنانچہ اس فوج نے چاروں طرف سے مرہٹوں پر آگ برسانی شروع کی۔

دن کے دو بجے وشواس راؤ گولی کھا کر گرا۔ مرہٹہ فوج کی ہمت پست ہو گئی۔ جب بھاؤ کو یہ خبر پہنچی تو اس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ آؤ آخری بار حملہ کریں۔ چنانچہ اس نے ایک گھنٹہ تک عزیمہ مقابلہ کیا۔ دن کے ۴ بجے مرہٹہ فوج کے قلب کا خاتمہ ہو گیا۔ جب دیکھا کہ میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے تو بقیۃ السیف سپاہیوں کے ساتھ وہ بھی بھاگ نکلا مگر افغان سواروں نے جو بھاگنے والوں کا تعاقب کر رہے تھے، اسے ترغیل سے کر قتل کر دیا اور اس کا سر کاٹ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔

جب مرہٹوں کا قلب لشکر اور میسرہ تباہ ہو گیا تو نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں نے ان کے میمنہ پر حملہ کیا۔ نجیب الدولہ کی فوج مرہٹوں کے میمنہ سے ڈیڑھ کوس فاصلہ پر تھی مگر ۸ گھنٹے مسلسل پیشقدمی کر کے نجیب الدولہ سندھیا اور ہلکر کی فوج (مرہٹہ فوج کے دائیں بازو) کے مقابل آگیا تھا۔ یہاں پہونچ کر اس شیر دل روہیلہ نے اپنے ۶ ہزار سواروں کو حکم دیا کہ حافظ رحمت خاں کی ۹ ہزار پیدل فوج کے ساتھ گھوڑوں سے اُتر کر حملہ کرو۔ چنانچہ آگے آگے نجیب الدولہ تھا اور اس کے پیچھے ۱۵ ہزار جانباز سپاہی تھے۔ جب دشمن کے نزدیک پہونچا تو سپاہیوں کو بندوقیں داغنے کا حکم دیا اور عقاب کی طرح مرہٹوں پر جا گرا۔ یہ حملہ اس شدت سے ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں ہلکر اور سندھیا

دونوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔

سب سے پہلے ملہار راؤ ہلکر بھاگا اس کے بعد جنکو جی سندھیا نے اس کی تقلید کی۔ سرداروں کے بھاگ جانے کے بعد فوج کیا مقابلہ کرتی! ایک گھنٹہ کے اندر اندر پورے میمنہ کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد افغانوں نے مرہٹوں کا قتل عام شروع کر دیا۔

دوسرے دن جب مقتولوں کا شمار کیا گیا تو صرف میدان جنگ میں ۲۸ ہزار سے زیادہ مرہٹے مقتول پڑے تھے۔ اسی قدر گرفتار ہوئے جن کو افغانی سپاہیوں نے قتل کر کے مرہٹوں کی طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

زندگی میں سب سے بڑی فتح حاصل کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ کے مزار پر حاضر ہوا اور درگاہ کی مسجد میں دوگانۂ فتح ادا کیا۔ چند روز کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو دہلی پہونچا اور پندرہ ماہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد کچھ عرصہ لال قلعہ میں آرام کیا اور اپریل ۱۷۶۱ء میں نجیب الدولہ کو وکیل مطلق مقرر کر کے وطن واپس چلا گیا۔

چھٹا حملہ ۱۷۶۲ء میں کیا، ساتواں حملہ ۱۷۶۴ء میں، آٹھواں حملہ ۱۷۶۵ء میں، نواں حملہ ۱۷۶۹ء میں اور آخری حملہ ۱۷۷۰ء میں کیا۔ ان حملوں کی تفصیل بخوفِ طوالت قلم انداز کرتا ہوں۔ ابدالی نے ۱۷۷۲ء میں وفات پائی۔

تمام مورخین متفق ہیں کہ ابدالی ایشیا کے عظیم الشان فاتحین میں سے۔ سلطان محمود غزنوی کی طرح اسے بھی کسی میدان میں شکست نہیں ہوئی۔

یہ بات بھی قدرت کے عجائبات میں سے ہے کہ ۱۷۶۱ء میں سارا ہندوستان پنجاب سے لیکر دریائے چنبل تک اس کے قدموں میں تھا مگر اس

نے ہندوستان کے تخت پر جلوس کرنے کے بجائے قندہار کی راہ اختیار کی۔ اقبال نے اس شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

از دل او دستے گہر ریزے کہ داشت
سلطنت با بُرد و بے پروا گذاشت

اس کے بعد اب ہم اس فصل کا مطلب ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

کہتے ہیں کہ یہ اُس بادشاہِ دین پناہ کی تُربت ہے جس نے افغانوں کو ایران کی غلامی سے نجات دے کر ایک مستقل قوم بنا دیا۔ اس کی قبر کا گنبد، آسمان کی نگاہ میں بہت محترم ہے اور آفتاب اس کے طواف کی بدولت روشنی حاصل کرتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ شعر محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی قبر بہت معزز ہے۔

سلطان محمد فاتح کی طرح یہ بادشاہ بھی علوم و فنون خصوصاً شعر و شاعری کا بہت قدر دان تھا اور خود بھی شعر کہتا تھا۔

سلطان محمد فاتح سلاطینِ عثمانیہ میں بہت نامور سلطان گزرا ہے۔ سنہ ١٤٣٠ء میں ادرنہ (ایڈریانوپل) میں پیدا ہوا اور اپنے باپ مراد ثانی کی وفات کے بعد سنہ ١٤٥١ء میں تخت نشین ہوا۔ سنہ ١٤٥٣ء میں اُس نے قسطنطنیہ فتح کر کے مشرقی رومن ایمپائر کا خاتمہ کر دیا اور اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا چونکہ قسطنطنیہ کی فتح مسلمانوں کی ملی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے اس لیئے تاریخ میں اس کا لقب "فاتح" ہو گیا۔

فتح قسطنطنیہ کے بعد ترکوں کی عظمت سارے یورپ میں مُسلّم ہو گئی اور اس کے بعد سلطان نے ملک یونان اور جزیرہ نمائے بلقان کی بہت سی ریاستوں کو فتح کیا اور بحری قوت میں اس قدر اضافہ کیا کہ تمام جنوبی یورپ اس کی طاقت

سے لبرزہ براندام رہتا تھا۔ آخر میں اس نے عراق عجم پر فوجکشی کی مگر اس مہم کو سر کرنے سے پہلے پیام اجل آگیا یعنی ۱۷۷۳ء میں وفات پاگیا۔

اقبال کہتے ہیں کہ سلطان ابدالی اس قدر وسیع القلب تھا کہ اس نے ملک فتح کیئے مگر ان پر قبضہ نہ کیا (اشارہ ہے جنگ پانی پت کی طرف)۔

یہ بادشاہ بہت عقلمند، علم دوست اور پابند مذہب تھا۔ اس کی روح نے مجھ سے اس طرح خطاب کیا:۔

یہاں سے آخر شعر تک اقبال نے عالم خیال میں ابدالی سے گفتگو کی ہے یعنی جو کچھ ابدالی نے اُن سے کہا ہے وہ سب ان کے تخیل کی کارفرمائی ہے۔

کہتے ہیں کہ ابدالی کی روح نے مجھ سے کہا کہ اے اقبال! میں تیرے مقام سے آگاہ ہوں۔ تیرا کلام بنی آدم کے لیے زندگی کا پیغام ہے۔ تیری شاعری مردوں کو زندہ کر سکتی ہے اور دلوں کو منور کر سکتی ہے۔ چونکہ تو بھی دین اسلام کا عاشق ہے اس لیئے میرے پاس بیٹھ! میں تجھ سے رازِ دل بیان کرنا چاہتا ہوں۔

بلاشبہ وہ قوم بہت مبارک ہے جو اپنی خودی کو پختہ کر کے اس دنیا میں ہنگامہ برپا کر دے۔ بندۂ مومن کی شان، ازروئے قرآن، یہی ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دے اور نئی دنیا پیدا کر دے۔

خدا نے تجھے عشق کی دولت سے نوازا ہے اور تو دین اور سیاست کے رموز سے بھی باخبر ہے۔ اس لیئے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو اپنے خیالات (اسرارِ ملکت و دین) بے کم و کاست نادر شاہ کے فرزند کی خدمت میں پیش کر دے۔

فصل یازدہم

خطاب بہ ظاہر شاہ والئی افغانستان

تمہید مصطفےٰ کمال اور امان اللہ خاں کی طرح اقبالؔ کو ظاہر شاہ سے بھی کچھ توقعات تھیں مگر افسوس کہ ان میں سے کسی نے بھی ان کی توقعات کو پورا نہ کیا۔ اگر مرحوم اس زمانہ میں زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر ان کو بہت رنج ہوتا کہ افغانستان نے پاکستان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اس کے باوجود ہمیں حسن ظن سے کام لینا چاہیئے شاید حالات بہتر ہو جائیں۔

یہ اس مختصر کتاب کی طویل ترین فصل ہے اور اس میں پانچ بند ہیں۔

پہلے بند میں بطور تمہید چند اشعار لکھے ہیں۔

دوسرے بند میں چند بیش قیمت نصائح درج کی ہیں۔

تیسرے بند میں افغانوں کو علوم جدیدہ کی تحصیل و ترویج پر راغب کیا ہے۔

چوتھے بند میں "زبور عجم" سے موت و حیات کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

پانچویں بند میں قرآن حکیم کے مطالعہ کی ترغیب دی ہے اور آخری اشعار میں اپنا منصب اور مقام واضح کیا ہے۔

پہلا بند اس بند کے اشعار میں قصیدہ کا رنگ ہے۔ یعنی یہ بند ظاہر شاہ کی مدح میں لکھا ہے۔ آخری شعر میں کہتے ہیں کہ اے بادشاہ! میں تجھے حکمت کے رموز سے آگاہ کرتا

چاہتا ہوں :-

ع اے فقیرے رمز سلطانی نگیر

دوسرا نکتہ اے بادشاہ! اپنے ملک کی حالت پر غور کر۔ اللہ نے تجھے اتنا بڑا ملک دیا ہے۔ تیرا فرض یہ ہے کہ تو یہ غور کرے کہ اس ملک کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔

ع چیست آں چیزے کہ می بایست و نیست

یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ اس میں اقبالؒ نے تمام ضروریاتِ ملکی کی طرف اشارہ کر دیا ہے یعنی بادشاہ کا فرض ہے کہ افغانوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرے اور موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں کے دوش بدوش چلنے کیلئے جن جن باتوں کی ضرورت ہے اُن سب کی طرف توجہ کرے۔

(۲) دوسرا نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ

ہر کہ خود را صاحب امروز کرد
گرد او گردد سپہر گرد گرد

یعنی ہر روز جو عالم وجود میں آتا ہے تو موں کے لئے بمنزلہ آئینہ ہے جس میں وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتی ہیں۔ ہم جیسی تدبیر (کوشش) کریں گے ویسی ہی ہماری تقدیر ہوگی۔ جو شخص امروز کو ضائع کردے گا وہ فردا سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتا جو قوم زمانہ حال میں ترقی کی کوشش نہیں کرے گی اُس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ ہمارا مستقبل کیسا ہے؟ تو امروز کو دیکھو کہ تم آئندہ کے لئے آج کیا تیاری کر رہے ہو؟ فردا (مستقبل) تو امروز و دوش (ماضی و حال) کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر تم آج ترقی کی کوشش کرو گے تو کل غالب ہو

حکمران ہو جاؤ گے۔ جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے اس کی تقدیر میں مستقبل بھی نہیں ہے۔

(۳) مردِ حق (مومن) زمانہ کے لئے بمنزلہ سرمایہ ہے کیونکہ وہ اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا بھی اسی قوم کو سرفرازی عطا کرتا ہے جو اس کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔

مردِ حق (بندۂ صاحب نظر) قوموں کے لئے بمنزلہ رہنما ہوتا ہے کیونکہ وہ اُن کی تقدیر سے آگاہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ جانتا ہے کہ جو قوم اپنا وقت (امروز) عیش و عشرت میں ضائع کر دیتی ہے وہ مستقبل میں دوسروں کی غلام ہو جاتی ہے

(۴) اے بادشاہ! اپنے باپ کی طرح اہل ہنر کی قدر کر! اور صاحبانِ نظر و دانشمند افراد کو اپنا مشیر کار بنا! اپنے مرحوم باپ کی طرح جدوجہد، بیداری ہمت و حوصلہ اور کراری کو شعارِ زندگی بنا!

اے بادشاہ! کیا تو "کراری" کے مفہوم سے آگاہ ہے؟ سُن! یہ جناب علی مرتضیٰؓ کے مقاماتِ عالیہ میں سے ایک مقام ہے یعنی یہ وہ صفت ہے جس نے جناب موصوف کو "شیرِ خدا" بنا دیا۔

کرّار کے لغوی معنیٰ ہیں بار بار پلٹ کر حملہ کرنے والا یعنی وہ شخص جو کثرتِ اعدا سے مطلق نہ گھبرائے اور انتہائی مایوسی کے وقت بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئے۔

واضح ہو کہ کرّاری جناب مرتضیٰؓ کا مخصوص وصف ہے جس طرح صدیقیت حضرت ابوبکرؓ کا، فاروقیت حضرت عمرؓ کا اور بذلِ اموال حضرت عثمانؓ کا مخصوص وصف ہے۔ بعض دیگر صحابہؓ مثلاً حضرات ابو دجانہؓ، سید الشہداء حمزہؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد ابن ابی وقاصؓ اور خالد ابن ولیدؓ بھی شجاعت کے لحاظ سے

مشہور ہو، مگر حضرت علیؓ ان سب میں ممتاز ہیں۔

(۵) اس کے بعد اقبال کہتے ہیں:۔

اُمتاں را در جہانِ بے ثبات

نیست ممکن جز بکراری حیات

یعنی میدانِ جنگ میں اور ہر مصیبت اور خطرہ کے وقت ثابت قدم رہنا اور بار بار حملہ کرنا، یہ صفت، بنیاد ہے قوموں کی زندگی اور سربلندی کی۔ بیشک یہ جہانِ بے ثبات ہے یعنی ہر شخص فانی ہے مگر اس جہانِ بے ثبات میں جو شخص ثبات کا طالب ہو اُسے میدانِ جنگ میں ثباتِ قدم کا اظہار کرنا لازمی ہے۔

اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے اگلے تین شعروں میں اقبال نے مسلمانوں کی تاریخ سے دو مثالیں درج کی ہیں:۔

کہتے ہیں کہ اگر تجھے میرے قول کی تصدیق مطلوب ہے تو آلِ عثمانؓ اور ترکانِ تیموری پر نظر کر۔

(ا) اگرچہ ترکانِ عثمانی نے گذشتہ جنگ عظیم میں اقوام مغرب کے ہاتھوں شکست کھائی مگر چونکہ ان کے اندر کرّاری کی صفت موجود تھی۔ اس لئے ۱۹۲۲ء میں دوبارہ کامیابی حاصل کر لی۔

(ب) لیکن ترکانِ تیموری اس صفت سے محروم ہو چکے تھے اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمان انگریزوں کے غلام ہو گئے، اور موجودہ زمانہ میں ان کی ہمت اس درجہ پست ہو گئی ہے کہ میرا پیغام بھی صدا بصحرا ثابت ہوتا۔

واضح ہو کہ حضرت عالمگیرؒ کے بعد جس قدر بادشاہ تخت نشین ہوئے

بلا استغناء سب کے سب عیاشی اور راحت کوشی میں مبتلا تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی تمام اُمراء اسی لعنت میں گم و فنا ہو گئے۔ مثال کے طور پر صرف جہاندار شاہ کا تذکرہ کافی ہو گا۔ عالمگیرؒ جیسے بادشاہ کا یہ پوتا ۱۱۲۴ھ میں تخت نشین ہوا اور تخت نشینی کے بعد اس نے دلی کی ایک رقاصہ لال کنور کو ملکۂ ہندوستان بنایا اور اس کے رشتہ داروں کو ہفت ہزاری منصب دے کر سیاہ و سفید کا مالک کر دیا۔ اب ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ سلطنت کیسے قائم رہ سکتی ہے جس میں ایسے ذلیل اور بدقماش لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جائے۔ تفصیل کے لئے اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ میں بخوف طوالت اس المناک داستان سے قطع نظر کرتا ہوں۔

(۶)۔ اے بادشاہ! تیری رگوں میں نادر شاہ کا خون ہے اس لئے تو اپنے نامور باپ کے نقش قدم پر چل، اور سردار ہاشم خان، سردار محمود خان اور سردار شاہ ولی خان (برادران نادر شاہ) کو اپنا مشیر سلطنت بنا۔

(۷) اگر تو کوشش کرے تو افغانستان میں انقلاب رونما ہو سکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ قرآن حکیم کو اپنا رہنما بنا کیونکہ

صد جہاں باقی است در قرآن ہنوز
اندر آیاتش یکے خود را بسوز

یعنی قرآن حکیم زندگی کا مکمل دستور العمل ہے اور ہر زمانہ میں بنی آدم کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع بہت بلیغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم میں سربلندی حاصل کرنے کے ایسے پختہ اُصول بیان کئے گئے ہیں کہ جس وقت بھی کوئی قوم ان پر عمل پیرا ہو گی، کامیابی اُس کے قدم چومے گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم عالمگیر ہے اور اس کے پیش کردہ اصول اٹل ہیں۔

مرورِ ایام سے فرسودہ اور بیکار نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی تعلیمات (آیات) میں تدبّر (غور و خوص) کیا جائے اور اس کے بعد ان پر عمل کیا جائے۔ "سوختن" کنایہ ہے عمل کرنے سے۔

لہٰذا اے بادشاہ! پہلے تو خود قرآنی تعلیمات پر عمل کر۔ اس کے بعد اپنی قوم کو اس پر عامل ہونے کی دعوت دے۔ یقیناً تیری قوم کی زندگی میں انقلابِ عظیم رونما ہو جائے گا۔

چونکہ میرے دل میں تیری قوم کا درد ہے اس لئے حق تعالیٰ نے مجھے اُن کی تقدیر سے آگاہ کر دیا ہے یعنی یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے کہ اگر ملّتِ افغانیہ، قرآن عزیز کو اپنا رہنما بنا لے تو دنیا میں سر بلند ہو سکتی ہے۔

(۸) یاد رکھ کہ مسلمان، جسے خدا نے جہاد کے لئے پیدا کیا ہے۔ عقیدۂ توحید (اللہ ہو) کی بدولت زندہ اور پائندہ ہو سکتا ہے اور اگر وہ توحیدِ الٰہی کو اپنا مدارِ کار اور محورِ حیات بنا لے تو یہ ساری کائنات اس کے قدموں میں سجدہ ریز ہو سکتی ہے۔

(۹) یاد رکھ کہ جو شخص ما سوی اللہ سے قطعِ نظر کر لیتا ہے یعنی اللہ کو اپنا مقصودِ حیات بنا لیتا ہے اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ

ع — می تواں سنگ از زجاجِ او شکست

اس کے ہاتھ میں آکر شیشہ (ضعیف شی) اس قدر طاقتور ہو جاتا ہے کہ اس سے پتھر (دشمن قوی) کو توڑ (مغلوب کر) سکتے ہیں۔

(۱۰) حقیقت یہ ہے کہ مردِ حق اس کائنات میں نہیں سما سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ غیر محدود طاقتوں کا مالک ہو جاتا ہے۔ وہ بمنزلۂ دریا ہو جاتا ہے۔ اُسے محدود (ساحل) سمجھنا گویا اس پر اتہام لگانا ہے۔ جب وہ اپنی پوری

شان کے ساتھ میدانِ جہاد میں آتا ہے تو قوموں کی تقدیر کا فیصلہ کر دیتا ہے وہ قوموں کے اعمال کا حساب کرتا ہے اور جو قوم حق تعالیٰ کے احکام کی پابند ہوتی ہے اسے ثواب (عزت) عطا کرتا ہے اور جو قوم نافرمان ثابت ہوتی ہے اسے عذاب (ذلت) میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس شعر کا مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے
كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۝

اے مسلمانو! تم بہترین اُمّت (قوم یا جماعت) ہو جو لوگوں کے حالات کی اصلاح کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ (تمہارا مقام یہ ہے کہ) تم لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور انہیں برائی (بُرے کاموں) سے روکتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ تم اقوامِ عالم کے سردار ہو (ہم نے تمہیں اپنا نائب مقرر کیا ہے)۔ ظاہر ہے کہ سرداری کے لئے طاقت، حکومت اور سطوت لازمی شرط ہے۔ مسلمان، دوسری قوموں کو اُسی وقت حکم دے سکتے ہیں جب وہ خود صاحبِ اقتدار ہوں اور دنیا ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر سکے۔ یعنی اگر مسلمان، اقوامِ عالم کو برائی سے نہ روک سکیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ منشائے ایزدی کی تکمیل یا تعمیل سے قاصر ہیں۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہم دوسروں کو حکم دینے کے بجائے خود دوسروں کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں اور یہ ہماری حالتِ زار نتیجہ ہے قرآن سے روگردانی کا۔ جب تک ہم قرآن کو اپنا رہنما نہیں بنائیں گے دنیا میں سربلند نہیں ہو سکتے۔

تیسرا بند

اس بند میں اقبال نے دنیا میں سربلندی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ چنانچہ ظاہر شاہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

وہ ساز و سامان جس کی بدولت ہم دنیا میں سربلندی حاصل کر سکتے ہیں کتاب اور حکمت ہے۔ یہی وہ دو قوتیں ہیں جن کی بنا پر ملتِ اسلامیہ دنیا میں اعتبار (عزت) حاصل کر سکتی ہے۔

کتاب سے قرآن حکیم اور حکمت سے سائنس اور فلسفہ مراد ہے اور یہ دونوں لفظ اس آیت سے مقتبس ہیں:۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۴-۱۱۳)

اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی۔

حکمت کی فضیلت اس آیت سے ثابت ہے:۔

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (۲-۲۶۹)

اور جسے حکمت دی گئی بلاشبہ اسے خیر کثیر (نعمتِ عظمٰی) عطا کی گئی۔

لفظ حکمت کے مفہوم میں بہت وسعت ہے۔ مفسرین نے اس لفظ سے دانائی بھی مراد لی ہے اور سنتِ نبوی بھی، اور عقل و دانش بھی اور علوم بھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ الخ یعنی علم و حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے اس لئے جہاں کہیں اُسے یہ چیز ملے اس پر اس کا سب سے زیادہ حق ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے لفظ حکمت کے مفہوم کی وسعت ثابت ہو گئی یعنی اس سے عقل و فہم، علم و حکمت، دانائی اور سائنس یا علوم عصریہ، یہ تمام باتیں مراد لی جا سکتی ہیں۔ اقبال نے جیسا کہ اگلے دو شعروں سے ظاہر ہے حکمت سے سائنس مراد لیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:۔

کتاب کی بدولت یا اس پر عمل کر کے ہم عالم ذوق و شوق میں فتوحات (کامیابی) حاصل کر سکتے ہیں یعنی اللہ سے محبت کر کے روحانیت میں بلند

مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

اور حکمت کی بدولت ہم عالم تحت و فوق یعنی مادیات کی دنیا فتح کر سکتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ مادیات کی تسخیر، سائنس ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے اس لئے یہاں حکمت سے سائنس مراد ہے۔

مزید وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن اور سائنس دونوں خدائے لایزال کا انعام ہیں۔ قرآن سے مومن کے اندر شانِ جمال (محبت الٰہی) کا رنگ پیدا ہوتا ہے اور سائنس سے اس میں شانِ جلال (قوت اور حکومت) پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن، انسان کو بنی آدم پر رحمت اور شفقت کرنا سکھاتا ہے اور سائنس، انسان کو تسخیرِ کائنات کا طریقہ بتاتا ہے اور جب تک انسان میں یہ دونوں شانیں جلوہ گر نہ ہوں وہ اپنی شخصیت کو مرتبۂ کمال تک نہیں پہونچا سکتا۔

اس کے بعد اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ حکمتِ اشیا یعنی سائنس، فرنگی زاد (یورپ کا پیدا کردہ) نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد لذتِ ایجاد اور ذوقِ تحقیق پر ہے۔ جس قوم کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جائے وہ سائنس میں ترقی کر سکتی ہے۔

اگر تو غور سے دیکھے یعنی تاریخ کا مطالعہ کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ سائنس (طبیعات، کیمیا، علم الحیوانات وغیرہ) مسلمان کا ایجاد کردہ ہے۔ کسی زمانہ میں یہ گوہر ہمارے پاس تھا، ہم نے کھو دیا، یورپ نے اٹھا لیا۔

جب مسلمانوں نے ہسپانیہ فتح کیا تو قرطبہ اور غرناطہ میں سائنس اور فلسفہ کی عظیم الشان درس گاہیں قائم کیں جن میں فرانس، انگلستان اور اطالیہ کے طالبانِ علم نے مسلمانوں سے یہ علوم حاصل کئے۔ تخم ریزی تو مسلمانوں نے کی

لیکن فصل اہل یورپ نے کاٹی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے قرآن حکیم میں تدبر کیا تو انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس کتاب نے جا بجا مسلمانوں کو فطرت کے مطالعہ کی دعوت دی ہے مثلاً

اَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ٥ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ٥ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ٥ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ٥ (۸۸:۱۷-۲۰)

پس کیا نظر نہیں کرتے اونٹوں کی طرف کہ کیسے بنائے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسا اسے بلند کیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے کھڑے کر دیئے ہیں اور زمین کی طرف کہ کیسی صاف بچھائی ہے؟

ان آیتوں میں اونٹ تمام حیوانات کا نمائندہ ہے گویا اس آیت میں اشارہ ہے علم الحیوانات کی طرف۔ آسمانوں کی بناوٹ کا مطالعہ کرنے میں اشارہ ہے علم الآفاق کی طرف۔ پہاڑوں کی بناوٹ کا مطالعہ کرنے میں اشارہ ہے علم معدنیات اور حجریات کی طرف۔ اور زمین کی بناوٹ کا مطالعہ کرنے میں اشارہ ہے علم الارض کی طرف۔

قرآن حکیم میں اس قسم کی آیات سات سو سے زائد ہیں جن میں انسانوں کو فطرت کے مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کائنات میں جس قدر مخلوقات ہیں سب میں ہماری قدرت کی نشانیاں موجود ہیں مگر ان سے وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو عقل سے کام لیں یعنی غور و خوض کریں اور تدبر، تفکر اور تفقہ کو کام میں لائیں۔

نیز قرآن نے انسانوں کو بار بار اس انداز سے مخاطب کیا ہے کہ اے لوگو! تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے۔

فی الجملہ جب مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ قرآن حکیم، مطالعہ فطرت کا حکم دیتا

ہے اور اس کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ عقل سے کام لو اور غور و فکر و تو مسلمانوں نے عقل سے کام لے کر فطرت کا مطالعہ شروع کر دیا اور کچھ عرصہ کے بعد اس طریقہ کار کا نتیجہ سائنس کی صورت میں ظاہر ہوا یعنی مسلمانوں نے مختلف علوم و فنون مدون کئے۔

مسلمانوں کے عہد سے پہلے دنیا میں استخراجی طریقہ مروج تھا جسے DEDUCTIVE METHOD کہتے ہیں مثلاً

انسان فانی ہے۔

زید، انسان ہے۔

لہٰذا زید فانی ہے۔

لیکن مسلمانوں نے اس طریقہ کے علاوہ استقرائی طریق بھی ایجاد کیا جسے INDUCTIVE METHOD کہتے ہیں مثلاً

زید فانی ہے، خالد فانی ہے، بکر فانی ہے۔ وقس علیٰ ھذا

اس لئے ثابت ہوا کہ انسان فانی ہے۔

بیکن کو اہلِ یورپ، استقرائی طریق کا موجد کہتے ہیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ بیکن سے صدیوں پہلے مسلمان اس طریق کو ایجاد کر چکے تھے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس طریق کی طرف رہنمائی کی ہے کیونکہ وہ بار بار مطالعۂ فطرت یعنی استقرا کی دعوت دیتا ہے۔

یہ شرح مسلمانوں کے علمی کارناموں کی تاریخ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جن حضرات کو تفصیل مطلوب ہو وہ ڈاکٹر ڈریپر کی تصنیف "یورپ کی ذہنی ترقی کی تاریخ" یا بریفالٹ کی "تعمیر انسانیت" کا مطالعہ کر لیں۔

بانداز دیگر بر سرِ مطلب، مسلمانوں کی عہد بعہد ترقی نے دنیا کو فلسفہ اور سائنس کا

درس دیتے رہے یعنی سولہویں صدی تک یورپ مسلمانوں سے جملہ علوم و فنون حاصل کرتا رہا ہے۔

سترہویں صدی سے ایک طرف تو مسلمانوں کا سیاسی زوال شروع ہوگیا دوسری طرف یورپ کی اقوام نے مسلمانوں سے علوم و فنون حاصل کیے مادّی عروج حاصل کرنا شروع کردیا۔

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند

میں اس شرح میں نہ تو مسلمانوں کے زوال کے اسباب سے بحث کرسکتا ہوں اور نہ یورپ کے عروج کی داستان بیان کرسکتا ہوں مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ

(۱) سلاطین اور امرا عیش و عشرت میں منہمک ہوگئے۔

(۲) علما اور حکما میں تقلیدِ کور کا مرض پیدا ہوگیا۔

(۳) سیاسی زوال سے خانہ جنگی، اقتصادی بدحالی، اور انجام کار غلامی مسلّط ہوگئی۔

(۴) غلامی سب سے بڑی لعنت ہے۔ ذوقِ تحقیق کے لئے سکونِ قلب اور فارغ البالی شرطِ اوّلیں ہے اور غلام قوم ان دونوں بلکہ ساری نعمائے محروم ہوجاتی ہے۔

(۵) خواص اور عوام دونوں کی توجہ قرآن کے بجائے فنونِ لطیفہ یعنی شاعری مصوّری اور موسیقی پر مبذول ہوگئی۔ بالفاظِ دگر

آ تجھ کو بتادوں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر،

مسلمانوں کے مقابلہ میں اقوامِ یورپ نے سائنس کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے

اپنی اجتماعی ترقی کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اندر تسخیرِ کائنات کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا۔

مسلمانوں نے تو بحرِ ظلمات میں گھوڑے ہی دوڑائے تھے۔ اہلِ یورپ نے بحرِ ظلمات کو عبور کر کے نئی دنیا دریافت کر لی اور اپنی بحری طاقت کو اس قدر فروغ دیا کہ تجارت کرتے کرتے مشرقی ممالک پر قابض ہو گئے۔ حکومت سے دولت حاصل ہوئی تو عیش و عشرت میں غرق ہونے کے بجائے اپنی زندگی میں توازن قائم کیا یعنی اگر رات کو بزمِ عیش منعقد کی تو دن میں سامانِ حرب تیار کیا۔

انیسویں صدی میں اور خصوصاً عصرِ حاضر میں جس قدر ایجادات سائنس کی بدولت ان اقوام کے ہاتھوں وجود میں آئیں ان کی بدولت آج یہ اقوام ساری دنیا پر حکمران ہیں اور ساری دنیا کے مسلمان یا ان کے غلام ہیں یا دستِ نگر اور محتاج ہیں جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ عرب، عراق اور ایران کے مسلمان اپنے ملکوں کے قدرتی ذخائر سے خود مستفید نہیں ہو سکتے مثلاً تیل کے چشموں سے خود تیل نہیں نکال سکتے۔ یہ کام انگریز اور امریکن کمپنیاں انجام دے رہی ہیں۔
فاعتبروا یا اولی الالباب ۱۲

اقوامِ مغرب سے سائنس اور دیگر علوم و فنون سیکھنے کی ترغیب دینے کے بعد اقبال مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ

ایمن از تہذیبِ لادینی گریز
زانکہ او با اہلِ حق دارد ستیز

یعنی جس طرح تم سے اہلِ یورپ نے علوم و فنون حاصل کئے تھے اسی طرح اب تم ان سے وہ تمام علوم سیکھو جن کی بنا پر وہ عناصرِ کائنات پر حکمرانی کر رہے ہیں مگر ان کی تہذیب سے اجتناب کرو کیونکہ اس کی بنیاد انکارِ خدا پر ہے

اس لئے وہ مسلمانوں کے حق میں سمِ قاتل ہے۔ آئندہ چار شعروں میں تہذیب مغرب پر تنقید کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ

(۱) یہ تہذیب سراسر فتنہ ہے اور اس تہذیب کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ انسانوں (مسلمانوں) کو خدا پرستی سے باز رکھتی ہے۔ خدا کی جگہ وطن قوم یا مملکت کو معبود اور مقصودِ حیات بنا تی ہے۔

(ب) اس تہذیب سے دل کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں یعنی دل مردہ ہو جاتا ہے اور اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا دل زندہ ہو جائے۔ لہٰذا یہ تہذیب مسلمانوں کے حق میں سراسر مضر ہے بلکہ اسلام کی ضد ہے۔

(ج) یہ تہذیب انسانوں کو خدا کی محبت سے بیگانہ بنا دیتی ہے بلکہ روحانیت اور اخلاقِ حسنہ کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس کی بنا پر انسان مادیات میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ تہذیب مسلمان کو کافر بنا دیتی ہے۔

(د) مسلمان کا سرمایۂ حیات محبت (داغ) ہے لیکن یہ تہذیب اسی سرمایہ کو برباد کر دیتی ہے یعنی تہذیب غارتگرِ دین و ایمان ہے۔

مصرع "لالہ می نالد کہ داغ من کجا ست" بہت بلیغ مصرع ہے اس میں لالہ کنایہ ہے مسلمان سے اور داغ کنایہ ہے جذبۂ عشق سے جو مسلمان کا حقیقی سرمایۂ حیات ہے اور یہ تہذیب اسی سرمایہ کو غارت کر دیتی ہے۔

اقبالؔ نے تہذیبِ مغرب کی مذمت میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے تمام تصانیف میں اس کی خرابیوں کو واضح کیا ہے۔ تہذیب مغرب سے مراد اہلِ یورپ کی وضع یا طرزِ زندگی یا لباس نہیں ہے بلکہ وہ رجحانِ طبع یا اندازِ فکر ہے جس کی بنا پر انسان، خدا اور آخرت، وحی اور رسالت، ضمیر اور اخلاقِ حسنہ آدمیت اور ہمدردی، عشق اور روحانیت سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور دنیا اور

اس کی لذتوں کو مقصودِ حیات بنا لیتا ہے۔ اسلام، اس کے برعکس، آخرت کو مقصودِ حیات قرار دیتا ہے۔ اس لئے کوئی مسلمان تہذیب مغرب کو اختیار کرنے کے بعد مسلمان نہیں رہ سکتا۔ خدا پرستی اور مادہ پرستی کسی آدمی میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کو اس تہذیب سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔

چوتھا بند اس بند میں اقبال نے زندگی اور موت کا مفہوم واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے بادشاہ! میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تجھے "ذوقِ حضور" عطا فرمائے، کیونکہ اس کے بغیر زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں، چونکہ یہ نکتہ اہم ہے اس لئے زبورِ عجم سے وہ اشعار تجھے سناتا ہوں جن میں زندگی اور موت کا فلسفہ (مفہوم) بیان کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ تعلیماتِ اسلام کی غایت یہ ہے کہ مسلمان میں "ذوقِ حضور" پیدا ہو جائے۔ "ذوقِ حضور" تصوفِ اسلام کی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ لذت یا کیفیت جو سالک کو حضوری کی بدولت حاصل ہوتی ہے حضور یا حضوری سے مراد ہے سالک کا ہر وقت یہ محسوس کرنا کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں یا خدا میرے ساتھ ہے۔

قرآن حکیم نے "حضور" کے بجائے معیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں معیت کا اثبات کیا ہے:-

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ

اور جہاں کہیں بھی تم ہو وہ (خدا) تمہارے ساتھ ہے۔

چونکہ اس آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے اس لئے اربابِ تصوف نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ اب تمہارا فرض یہ ہے کہ اس

معیتِ حق کا احساس کامل اپنے اندر پیدا کرو یعنی ایسی کوشش کرو کہ اس آیت کی صداقت تم پر آشکارا ہو جائے۔ اس لئے انہوں نے وہ طریقہ بتایا جس پر عمل کرنے سے یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طریقہ کو "تصحیح الخیال" کہتے ہیں اور در حقیقت تصوف اسی تصحیح الخیال کا دوسرا نام ہے۔

ذکر و شغل، نوافل، تہجد، مراقبہ۔ مجاہدہ اور خلوت سب کا مقصد یہی ہے کہ خیال صحیح ہو جائے یعنی یکسوئی پیدا ہو جائے۔ خدا کے سوا کسی دوسرے کا خیال دل میں نہ آنے پائے۔

جب یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے تو نماز میں وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

"اپنے رب کی عبادت اس طرح کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو یہ خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے"۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جب نماز پڑھو تو تمہیں یہ احساس ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو یعنی اس کے سامنے ہو۔ بالفاظ دگر اس کی معیت کا احساس ہو جائے۔ اسی کو حضور بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ حالت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب خیال صحیح ہو جائے اور اسی تصحیح خیال کے لئے مرشد کی صحبت اختیار کی جاتی ہے کیونکہ یہ بات از خود پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس کی مشق و مزاولت نہ کی جائے اور مشق و مزاولت کا طریقہ مرشد کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔

الغرض جب حضور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو انسان ہر قسم کے گناہوں

---

[1] أَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ ١٢

شریعت کی اصطلاح میں اس کیفیت کو "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے اور تصوف اسلام اسی صفت احسان کا دوسرا نام ہے۔ صحابہ کرامؓ جسے احسان کہتے تھے زمانہ مابعد کے مسلمان اسے تصوف کہنے لگے ١٢

سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسی نماز کے لئے قرآن میں آیا ہے:۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ہ

بیشک نماز اگر حضورِ قلب کے ساتھ پڑھی جائے تو انسان کو بے حیائی اور ناپسندیدہ امور اور نافرمانی سے روک دیتی ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انسان کو یہ احساس ہر وقت دامنگیر رہے گا کہ میں خدا کے سامنے ہوں یا خدا مجھے دیکھ رہا ہے یا خدا میرے ساتھ ہے تو وہ گناہ پر قادر نہیں ہو سکتا۔

قرآن و حدیث کی رو سے حقیقی زندگی یہی ہے کہ انسان کو ہر وقت معیت حق کا احساس ہوتا ہے یعنی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب انسان یہ محسوس کرے کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ لہذا جو شخص حضور یا معیت حق سے محروم ہے، قرآن کی رو سے وہ زندہ نہیں ہے بلکہ مردہ ہے۔ یعنی اگرچہ بظاہر وہ انسان ہے مگر دراصل حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ زندگی سے محروم ہے۔

اس کے بعد اقبال نے زبورِ عجم سے اقتباس پیش کیا ہے۔ یہ اشعار انہوں نے "مذہب غلامان" کے ذیل میں لکھے ہیں۔

اس فصل میں انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کا غلام ہو جاتا ہے تو اگرچہ بظاہر وہ زندہ ہوتا ہے مگر درحقیقت مر جاتا ہے۔

زندہ و بے جان چہ راز است ایں نگر
با تو گوئیم معنی ء رنگیں نگر

یعنی انسان جس شخص کا غلام ہوتا ہے وہ شخص اس کا خدا بن جاتا ہے اور اسے زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ غلام بظاہر زندہ ہوتا ہے مگر اس میں روح نہیں

ہوتی۔ اس کی تفصیل انہوں نے آئندہ اشعار میں کی ہے اور یہی اشعار اقبال نے اس جگہ درج کیے ہیں۔ اب ہم ان کی تشریح کرتے ہیں:۔

کہتے ہیں کہ مرنا اور جینا یہ دونوں اعتباری امور ہیں۔ مثلاً مچھلی کے لئے کوہ اور دریا کا کوئی وجود نہیں ہے اور پرندوں کے زاویہ نگاہ سے قعر دریا کا کہیں وجود نہیں ہے۔

اسی طرح بہرے آدمی کی نگاہ میں آواز کا کوئی وجود نہیں ہے اور اندھے آدمی سے پوچھو تو رنگ کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی روح کو اگر معیتِ حق نصیب ہے تو زندہ ہے ورنہ مُردہ ہے یعنی حق تعالیٰ کی نگاہ میں صرف وہ انسان زندہ ہے جسے حضوری کی دولت حاصل ہے۔ صرف حق تعالیٰ حقیقی معنی میں زندہ ہے کیونکہ اسے موت نہیں آسکتی۔ اس لئے حقیقی حیات اُس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو خدا کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ جو شخص حضور (معیت) سے محروم ہے وہ دراصل مُردہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دنیا والے اس کی موت کا ماتم نہیں کرتے یعنی اگرچہ دنیا والوں کی نظر میں وہ شخص زندہ ہے لیکن خدا کی نظر میں مُردہ ہے۔

آخری بند اے بادشاہ! اگر تو ثبات کا طالب ہے یعنی اگر تو حیاتِ ابدی کا آرزومند ہے تو قرآن حکیم کو اپنا رہنما بنا اور اس سے استفادہ کر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم انسانوں کو حقیقی زندگی عطا کر سکتا ہے۔ جو شخص اس کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے، موت سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیں "لا تخف" کا مژدہ سناتا ہے یعنی

جو شخص اس کتاب کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے وہ کائنات میں کسی شئی سے خوف نہیں کھاتا کیونکہ خدا کے سوا کسی میں یہ طاقت ہی نہیں کہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔

"لا تخف" اس آیت سے مقتبس ہے:۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ (۲۰ - ۲۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! پکڑ لے (اس سانپ کو) اور مت ڈر۔

نیز دوسری آیت میں ہے:۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (۲۰ - ۶۸)

ہم نے موسیٰ سے کہا مت ڈر، بلاشبہ تو ہی ان جادوگروں پر غالب رہے گا۔

کہتے ہیں کہ کلمۂ توحید (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) میں یہ تاثیر ہے کہ بادشاہ اور فقیر دونوں کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

اے بادشاہ! جب تک ہمارے ہاتھ میں لا الہ الا اللہ کی تلوار رہی ہم ماسوی اللہ (کائنات) پر غالب رہے۔ اگر ہم یہ تلوار دوبارہ حاصل کر لیں تو ہمارے اندر وہی طاقت پیدا ہو سکتی ہے جو ہمارے اسلاف میں تھی۔

یہاں خطاب ختم ہو گیا۔ اب آخر میں اقبال اپنا منصب اور مقام واضح کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

میرے کلام نے مشرق کو منور کر دیا ہے وہ شخص بہت خوش نصیب ہے جو میرے زمانہ میں ہے اور میرے کلام کا مطالعہ کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں نے اپنی شاعری میں قرآنی حقائق و معارف پیش کئے ہیں اور رمز صبغۃ اللہ کی تشریح کی ہے یعنی مسلمانوں کو وہ طریقہ بتا دیا ہے جس کی

بدولت وہ اپنے آپکو خدا کے رنگ میں رنگین کر سکتے ہیں یعنی اپنے اندر خدائی صفات کا عکس پیدا کر سکتے ہیں۔ جملہ "صِبْغَۃَ اللّٰہِ" اس آیت میں وارد ہوا ہے :-

صِبْغَۃَ اللّٰہِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً (۲-۱۳۸)

(آپ کہہ دیجئے کہ ہم نے قبول کر لیا) رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے ؟ (اللہ کے رنگ سے اللہ کا پسندیدہ دین مراد ہے)۔

میں نے مسلمانوں کو عشقِ رسول صلعم کا پیغام دیا ہے اور عشقِ رسول صلعم مسلمانوں کو اسی طرح زندہ کر سکتا ہے جس طرح نمی (پانی) سے پرانی (سوکھی ہوئی) شاخ ہری ہو جاتی ہے۔

میں نے جس عشق کا پیغام مسلمانوں کو سنایا ہے وہ ان کی زندگی کا ضامن ہے۔ اس عشق کی بدولت عقل انسانی منور ہو جاتی ہے یعنی عقل بذاتِ خود انسان کو خدا تک پہونچانے کے بجائے اس سے دُور کر دیتی ہے کیونکہ عقل کا خاصہ یہ ہے کہ وہ دل میں شکوک پیدا کرتی ہے لیکن اگر عقل کو عشق کے تابع کر دیا جائے تو وہ خدا رسی میں معاونت کر سکتی ہے۔

اقبالؒ نے اس نکتہ کو کہ کوئی شخص محض عقل کی بدولت خدا تک نہیں پہونچ سکتا، اپنی ہر تصنیف میں واضح کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

یعنی فلسفی تشکیک کے غبار میں راہِ راست سے بھٹک گیا مگر صاحبِ عشق اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

اس زمانہ میں میرے سوا کسی شاعر نے دینِ اسلام کے حقائق و معارف

اس قدر وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیئے اور نہ کسی نے مسلمانوں کو میری طرح عشق رسولؐ کا پیغام سنایا۔

میں نے مدتوں خلوت میں دین اسلام کے اسرار و رموز پر غور کیا تب کہیں جاکر میرا مقام مجھ پر واضح ہوا یعنی آیات قرآنی میں تدبر کرنے سے مجھے یہ منصب حاصل ہوا کہ میں قوم کو پیغام دے سکوں۔

میں نے قرآن و حدیث کے مطالعہ سے اپنے اندر عشق رسولؐ کا رنگ پیدا کیا اور اپنی ہستی کو عشق کی آگ میں جلا کر خاک کر دیا تب میرے اندر قوم کو درس عشق دینے کا ولولہ پیدا ہوا۔

خدا نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عشق رسولؐ کی دولت اور نعمت عطا فرمائی (آہ صبحگاہی کنایہ ہے عشق رسولؐ سے) اور اس عشق کی بدولت میری شخصیت جو بذات خود بہت حقیر (کاہ) تھی بہت رفیع اور محترم (کوہ) ہو گئی۔ چونکہ میرا سینہ نور توحید سے منور ہے اس لئے میری شاعری (شراب) میں توحید کا سرور پایا جاتا ہے۔ اسی توحید کی بدولت میرے افکار میں آسمان کی سی بلندی اور سمندر کی سی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

لہٰذا اے مخاطب! تو بھی میری شراب توحید کے دو ایک جام پی لے تاکہ تجھ میں باطل کے فنا کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے۔

ضمیمہ

سیاحت افغانستان کے مختصر حالات

علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم نے واپسی پر اپنے سفر کے حالات رسالہ معارف میں شائع کئے تھے۔ ان میں ضمناً اقبال مرحوم کا تذکرہ بھی کئی جگہ آیا ہے۔ ناظرین کی آگاہی کے لئے اس کا اقتباس ذیل میں درج کرتا ہوں:-

۱- ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال مرحوم اپنے رفقا کی معیت میں پشاور سے روانہ ہوگئے۔ رات کو آٹھ بجے جلال آباد پہونچے۔ دوسرے دن صبح ۸ بجے یہاں سے روانہ ہوکر رات کو آٹھ بجے کابل پہونچے اور شاہی مہمان خانہ میں مقیم ہوگئے دوسرے دن رات کے وقت سید صاحب کابل پہونچے۔

۲- نو بجے شب کو سردار ہاشم خاں صدر اعظم کے یہاں تمام مہمانوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے فلسفہ اور مذہب کے بہت سے نکات بیان فرمائے۔

۳- دوسرے دن جمعہ کا روز تھا۔ اقبال نے اپنے رفقا کے ساتھ جامع مسجد میں نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہوکر انہوں نے سید صاحب سے کہا کہ "آج میں سمجھا کہ دارالحرب میں جمعہ کی نماز کیوں نہیں ہے۔"

۴- واپسی پر مہمان خانہ میں کھانا کھایا اور سہ پہر کو اقبال اور سید صاحب حضرت نورالمشائخ (گلاسے شور بازار) سے ملنے گئے۔

۵۔ ان سے رخصت ہو کر ڈاکٹر صاحب، اللہ نواز خاں وزیر امور نافعہ کے یہاں چائے کی دعوت میں شریک ہوئے۔ چائے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر تقریر کی۔

۶۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب شاہ محمود خاں وزیر جنگ کے ساتھ چائے کی دعوت میں شریک ہوئے۔

۷۔ رات کے وقت انجمن ادبی کابل کی اعزازی دعوت میں شرکت کی۔ پہلے انجمن کے ایک رکن نے سپاسنامہ پڑھا، اس کے بعد افغانستان کے مشہور شاعر عبداللہ خاں صاحب نے "خیر مقدم" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

عزیزاں ز ہندوستان آمدند	در افغانستان میہمان آمدند
در آناں یکے دکتر اقبال ہند	سخن پرور و واقف از حال ہند
ادیب سخن گستر و نکتہ سنج	کہ ہر نکتہ اش ہمچو آمد ز گنج
کلامش چو اوج بلندی گرفت	سخن رتبۂ ارجمندی گرفت
زند طعنہ آہنگ او برق را	کہ خواہاں بود نہضت شرق را
سخن را بیامیخت چوں با علوم	از و زندہ شد طرز مولائے روم

بہ فکرش پے فیلسوفی گرفت
طراز سخن طرز صوفی گرفت

اس نظم کے بعد سید راس مسعود نے جوابی تقریر کی۔ ان کے بعد سید صاحب نے اظہار خیالات کیا۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور اپنے فلسفیانہ رنگ میں حسب ذیل تقریر کی جو بہت موثر ثابت ہوئی:۔

"اگرچہ سر راس مسعود اور سید سلیمان صاحب ندوی کی تقریروں کے بعد اب

کوئی چیز ایسی باقی نہیں ہے جسے میں بیان کروں لیکن انجمن ادبی کابل کے ارکان مجھ سے بھی توقع رکھتے ہوں گے کہ خیر مقدم کے جواب میں میں بھی کچھ عرض کروں۔ میں انجمن کا بہت ممنون ہوں اس نے میرے متعلق نظم و نثر میں بہت اچھے خیالات اور پُر احساس جذبات ظاہر کئے ہیں۔

میں بھی خواہش رکھتا ہوں کہ انجمن کے نوجوان ارکان کے عملی پہلو سے بحث کروں۔ میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری، ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمتگار ہے۔ اسی بنا پر میں آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح۔ شاعر، قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔ اس وقت جبکہ حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ ایک نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے، اُس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کُن ہو جاتا ہے اور جو حُسن، قوت سے خالی ہو وہ محض پیام موت ہے:-

دلبری بے قاہری جادوگری است

دلبری با قاہری پیغمبری است

میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ کو ایک مرکزی نقطہ کی طرف مبذول کر دوں۔ حیات نبوی صلعم کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کے حضور میں عرب کے مشہور شاعر امراء القیس کے کچھ اشعار پڑھے گئے۔ ارشاد ہوا اشعر الشعراء و قائدھم الی النار یعنی تمام شاعروں میں بہترین شاعر

اور ان کو دوزخ کی طرف لے جانے والا۔

اس ارشاد سراسر رشاد سے واضح ہے کہ شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر بُرا اثر مرتب کرتا ہے۔ کسی قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیز بہ محض شکل و صورت نہیں ہے بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ "تخیل" ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے، اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قومیں شعرا کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست کی پامردی سے نشوونما پاکر مر جاتی ہیں۔ پس میری خواہش یہ ہے کہ افغانستان کے شعرا اور انشا پرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں۔ جو قوم ترقی کے راستہ پر چل رہی ہے۔ اس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے۔ پس اس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے افکار کو ادبیات کے ذریعہ سے متشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشے کہ وہ بالآخر اپنی خودی کو پاکر اور قابلیت بہم پہونچا کر پکار اٹھیں :-

دو رستہ تیغم و گردوں بہ نیم ساخت مرا | فسان کشیدہ بروئے زمانہ آختت مرا
من آں جہانِ خیالم کہ فطرتِ ازلی | جہانِ بلبل و گل را شکست و ساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائرِ حرمم | تواں ز گرمیِ آوازِ من شناخت مرا

میں ایک نکتہ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لئے ایک کمروزینی کو پیدا کرے جو اس ملک کے گریبان کو اینگلو سیکسن اقوام کے قبضے سے نجات دلا سکے یا کسی دوسرے دانتے کو پیدا کرے جو نئی جنت پیش کرے یا کسی نئے کولمبس کو پیدا کرے جو ایک نئے براعظم کا پتہ لگائے۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں

تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملی کی زندگی سے آشنا کر سکے اور مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک ایسا مرد مل گیا ہے جس کا وہ عرصہ سے انتظار کر رہا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی شخصیت کو اسی لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ افغانستان کو ایشیا میں ایک نئی قوم بنا کر دنیا سے متعارف کریں۔ اس ملک کے نوجوانوں کو چاہیے کہ اس بزرگ رہنما کو اپنی تعلیم و تربیت کا معلم سمجھیں کیونکہ ان کی زندگی ایثار، اخلاص اور اپنے ملک کے ساتھ صداقت اور اسلام کے ساتھ عشق و محبت سے لبریز ہے۔"

۳۰۔۸ اکتوبر کو ڈاکٹر صاحب غزنی پہونچے۔ چونکہ انہیں حکیم سنائی کے مزار پر حاضر ہونے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا اس لئے ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ پیادہ حکیم موصوف کے مزار کی طرف روانہ ہوئے۔

حکیم سنائی کا مزار ایک چھوٹے سے احاطہ کے اندر ہے۔ ان کی جلالتِ شان سے کون واقف نہیں؟ ہم سب اس منظر سے متاثر تھے۔ مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر صاحب پر تھا۔ وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بیقرار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے۔

اس کے بعد سلطان محمود غزنوی کے مزار پر پہونچے۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب کو لاہور کی مناسبت سے حضرت داتا گنج بخش غزنوی ثم لاہوری کے والد ماجد کے مزار کی تلاش ہوئی۔ ہمارے رفقا میں سے ایک صاحب نے جن کا نام ملا قربان تھا، کہا کہ میں اس مزار سے واقف ہوں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب ان کے ساتھ اس مزار پر گئے۔

۹۔ غزنی سے روانہ ہو کر ہم لوگ قندہار پہونچے۔ چونکہ خرقۂ مبارک کی زیارتگاہ اور احمد شاہ درانی کا مقبرہ مہمان خانہ سے قریب تھا اس لئے ہم لوگ پیدل روانہ ہوئے اور اس عمارت میں پہونچے جہاں آنحضرت صلعم کا ملبوس مبارک رکھا ہوا ہے۔ یہ تبرک احمد شاہ ابدالی کو شاید بخارا سے ہاتھ آیا تھا۔ زیارت کے بعد ہم لوگ احمد شاہ ابدالی کے مزار پر گئے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اسلام کی پچھلی تاریخ میں اس سے بڑا کوئی ہیرو نہیں ہے۔ شاہ موصوف کی قبر کے سرہانے بلندی پر وہ قرآن مجید رکھا ہوا تھا جو خاص اس کی تلاوت کا تھا۔

۱۰۔ قندہار سے روانہ ہو کر ہم لوگ کوئٹہ پہونچے۔ راستہ میں ڈاکٹر صاحب نے روحانیت کے ذاتی مشاہدات اور ایک سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی اور اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے طالبعلمانہ عہد کا ذکر چھیڑا۔ پھر اپنے والد صاحب مرحوم کا تذکرہ کیا کہ وہ ایک صاحب دل صوفی تھے۔ اس ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حیات خفتہ کے تاروں کو جس مضراب نے چھیڑا وہ خود ان کے والد ماجد کی ذات تھی۔

اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد مرحوم کا ایک ایسا فقرہ سنایا جس نے میرے دل پر بے حد اثر کیا۔ فرمایا کہ میں اپنے وطن سیالکوٹ میں نماز فجر کے بعد قرآن حکیم کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ ایک دن نماز کے بعد حسب دستور تلاوت میں مشغول تھا کہ والد مرحوم میرے پاس آئے اور پوچھا کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کیا کرتا ہوں۔ فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ یہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح نازل ہوا ہے جس طرح آنحضرت صلعم کے قلب مبارک پر نازل ہوا تھا

تلاوت کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں نے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟۔ فرمایا جب بی۔ اے پاس کر لوگے تو بتاؤں گا۔ جب میں نے بی۔ اے پاس کر لیا تو اس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر اس مقام کے حصول کی تدبیر پوچھی۔ مرحوم نے مجھے کچھ طریقے اور دعائیں تلقین کیں اور مجھ سے عہد لیا کہ ہمیشہ اپنے قلم اور اپنی زبان سے اسلام کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب کی شاعری اُن کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی۔ ایک عالم ان کے نغموں سے سرشار ہو رہا تھا اور ان کی شاعری مسلمانوں میں قیامت انگیز تاثیر پیدا کر رہی تھی۔ بالآخر باپ اپنے بیٹے کی اس علمی ترقی سے مسرور ہو کر دنیا سے سدھار گئے۔ (اقتباس ختم شد)

سلہ راقم الحروف کو سنہ ۱۹۲۸ء میں حضرت مولانا میر حسن سیالکوٹی مرحوم کی معیت میں ڈاکٹر صاحب کے والد مرحوم سے ملاقات کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز تھی مگر جسمانی صحت قابل رشک تھی اور رخسار ایسے سرخ تھے کہ نوجوانوں کو شرماتے تھے۔ میں نے زبور عجم سے ایک غزل پڑھ کر سنائی اور ڈاکٹر صاحب سے اپنی عقیدت کا ذکر کیا۔ سنکر بہت خوش ہوئے اور مجھے دعائیں دیں۔ غالباً سنہ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔ ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

حصّہ دوم

مثنوی

”پس چہ باید کرد“

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

یہ کتاب علامہ اقبالؒ کی وفات سے دو سال پہلے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن میں مثنوی "مسافر" بھی اس کے ساتھ شامل کر دی گئی۔

اس کتاب کا مرکزی تصور جیسا کہ "خوانندۂ کتاب" کے پہلے مصرع

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق

سے ظاہر ہوتا ہے پیغام عشق ہے، کیونکہ اقبال کی رائے میں مسلمانوں کی سربلندی اسی مسلک پر گامزن ہونے میں منحصر ہے۔ انہیں اس بات پر کامل یقین تھا کہ صدرِ اسلام میں مسلمانوں کو جو غیر معمولی بلکہ محیر العقول کامیابی حاصل ہوئی اس کا باعث محض عشقِ رسول تھا، لہٰذا اس مثنوی کی وساطت سے انہوں نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے اپنی ساری عمر کے غور و فکر کا نچوڑ یا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ الہ آباد کے مشہور خطبہ صدارت کی تمہید میں انہوں نے خود اس بات کی صراحت کی ہے کہ میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسلام کے حقائق و معارف پر غور و فکر میں بسر کیا ہے اور اس کتاب میں انہوں نے اسی غور و فکر کے نتائج نہایت جامعیت اور بلاغت کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔

اسی نکتہ کو مدنظر رکھ کر محترمی سید نواب علی صاحب ایم۔ اے، سابق وزیر تعلیم ریاست جوناگڑھ (کاٹھیاواڑ) نے اس مثنوی پر تبصرہ کے ضمن میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ مثنوی اقبال کی تمام تصانیف میں وہی مرتبہ رکھتی ہے جو دل کو جسم انسانی میں حاصل ہے، اور میں سید صاحب کے اس خیال سے بکلی متفق ہوں۔

اقبال کی نظر میں دین اسلام، مذہب اور سیاست دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسلام کی یہی خصوصیت اسے تمام مذاہب عالم سے متمیز اور ممتاز کرتی ہے کہ اس میں دین اور سیاست کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے روح اور مادہ

دو جداگانہ حقائق نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ بقولِ اقبال

"مادہ بھی روح ہی ہے جو بقید زماں و مکاں اپنی ذات کا تحقق کر رہا ہے"

الغرض چونکہ انسان ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اس لئے اس کی روحانی زندگی اُس کی مادی زندگی سے جدا نہیں ہو سکتی لہٰذا دین اور دنیا یا مذہب یا سیاست میں کسی تفریق کا تصور پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے کہ اسلام بیک وقت ایک اخلاقی نصب العین (مذہب) بھی ہے اور ایک مخصوص قسم کا عمرانی نظام بھی ہے"

چونکہ اس مثنوی میں اقبال نے دین اور سیاست کے اسرار واضح کئے ہیں جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے:-

معنیٔ دین و سیاست باز گوئے
اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوئے

اس لیئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی اقبال کے تمام دینی افکار کا خلاصہ یا نچوڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی کی نوعیت، دوسری تصانیف سے بالکل جدا گانہ ہے۔ اس میں نہ غزلیں ہیں نہ نظمیں، نہ کسی شعر پہ تضمین ہے نہ کسی فلسفی پر تنقید ہے۔ نہ مناظر فطرت کا بیان ہے نہ کسی فرد کی داستان ہے بلکہ دین اور سیاست کے وہ اسرار و رموز واضح کیئے ہیں جن سے آگاہ ہو کر قومیں دنیا میں سربلندی بھی حاصل کر سکتی ہیں اور منشائے ایزدی کی تکمیل بھی کر سکتی ہیں۔ غالباً اس کی وضاحت چنداں ضروری نہیں کہ یہ حقائق تمامتر قرآن حکیم سے ماخوذ اور مقتبس ہیں۔

مضامین مثنوی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

(ا) پہلے حصہ میں تین عنوانات ہیں۔

پہلے عنوان کے ذیل میں انہوں نے اس مثنوی کے پڑھنے والوں سے خطاب کیا ہے۔ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کو عشق کا پیغام دینا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے ایک تمہید باندھی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیر رومیؒ انہیں یہ تلقین کرتے ہیں کہ :-

معنیٔ دین و سیاست باز گوئے　　　اہل حق را زیں دو حکمت باز گوئے

آخر میں انہوں نے مہر عالمتاب سے خطاب کیا ہے۔

(ب) دوسرے حصہ میں چھ عنوانات ہیں جن کے تحت انہوں نے دین کی تفسیر کی ہے

(ج) تیسرے حصہ میں چار عنوانات ہیں، ان کے ذیل میں انہوں نے سیاست حاضرہ کی تشریح کی ہے اور اقوام شرق کو صحیح طریق کار سے آگاہ کیا ہے۔

خطاب بہ مہرِ عالمتاب میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ میں "فکرِ مشرق" کو فرنگ کے تسلط سے آزاد کرنا چاہتا ہوں۔ گویا اس مثنوی کا مقصد یہ ہے کہ اقوامِ مشرق فرنگیوں کے تسلط سے آزاد ہو جائیں، اور چونکہ سیاسی آزادی کا حصول ذہنی غلامی سے آزادی پر موقوف ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :-

ع
پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر

اس لئے وہ سب سے پہلے فکرِ مشرق کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں سہ

فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ ۔۔۔ از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

اس لئے اس حصہ کے آخر میں انہوں نے خود یہ سوال کیا ہے۔

ع
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟

چونکہ یہ مثنوی اسی سوال کا جواب ہے اس لئے انہوں نے مثنوی کا نام ہی "پس چہ باید کرد" رکھ دیا۔ گویا اس مثنوی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انہوں نے اقوامِ مشرق کو اس طریق کار سے آگاہ کیا ہے جس کی بدولت وہ فرنگ کے تسلط سے رہائی حاصل کر سکتی ہیں۔

(ح) یہ کتاب عنوان ۱۲ سے شروع ہو کر عنوان ۱۳ پر ختم ہو جاتی ہے۔ آخری حصہ میں انہوں نے حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنا دردِ دل بیان کیا ہے۔ خلوص، محبت، سوز و گداز اور تاثیر کے اعتبار سے یہ حصہ اقبال کی پوری شاعری میں بے مثال ہے۔

حرفِ آخر

اس مثنوی کی زبان نہایت آسان اور شیریں ہے۔ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کی فراوانی کے باوجود سلاست اور روانی کا رنگ از ابتدا تا انتہا

قائم رہتا ہے۔ دشواری جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ نہایت عمیق افکار بہت جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر یہ خیال رہا ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعہ سے مسلمان اُن کے تمام بنیادی افکار سے آگاہ ہو جائیں۔ اور میں اس کتاب کے بست سالہ مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ جن لوگوں کے پاس اقبال کی تمام تصانیف کے مطالعہ کے لئے وقت نہیں ہے وہ صرف اس کتاب کے مطالعہ سے ان کے تمام بنیادی افکار سے واقف ہو سکتے ہیں۔

یہ کتاب بلاشبہ اس لائق ہے کہ پاکستان کے تمام کالجوں میں بطور نصاب تعلیم داخل کی جائے۔ کاش یہ حقیقت انصاب تعلیم مدوّن کرنے والوں پر بھی منکشف ہو جائے تاکہ اقبال کی یہ آرزو پوری ہو سکے:۔

ع فکر شرق آزاد گردد از فرنگ

فصل اوّل

نخوانندہ کتاب

پہلا شعر:- اس شعر کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ عصر حاضر میں حرم کو خرد کی بغاوت کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے اس لئے میں مملکت عشق سے سپاہِ تازہ مرتب کر کے لا رہا ہوں تاکہ اس بغاوت کا قلع و قمع کیا جا سکے۔

مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی عقل عشق کی گرفت سے آزاد ہو گئی ہے اور چونکہ یہ صورتِ حال قوم کے حق میں انتہائی خطرناک ہے اس لئے میں انہیں از سر نو عشق کا پیغام دینا چاہتا ہوں۔

واضح ہو کہ اقبال کی رائے میں وہ عقل جو عشق کی مطیع نہ ہو انسان کو انجام کار تشکیک اور الحاد میں مبتلا کر دیتی ہے اور جب خدا کی ہستی کا یقین اس کے دل سے محو ہو جاتا ہے تو اوہام باطلہ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:۔

نقشے کہ بستہ ئی ہمہ اوہام باطل است

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

شعر کی وضاحت سے پہلے اس شبہ کا ازالہ ضروری ہے کہ کیا اقبال عقل کو بیکار اور مہمل سمجھتے ہیں۔

واضح ہو کہ وہ عقل کو بیکار یا مہمل نہیں سمجھتے لیکن وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ

مجرد عقل نہ انسان کو خدا تک پہونچا سکتی ہے اور نہ زندگی کی پیچیدہ راہوں میں اس کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل یہ بتا سکتی ہے کہ اس کائنات کا خالق کوئی نہ کوئی ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ یہ کائنات حادث ہے اور ہر حادث اپنے وجود کے لیئے قدیم کا محتاج ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ قدیم (واجب الوجود) کون ہے؟ چونکہ وہ مادیات سے آگے نہیں بڑھ سکتی اس لیئے لامحالہ مادہ ہی کو خالقِ کائنات تسلیم کر لیتی ہے یعنی مجرد عقل کی پیروی انسان کو مادہ پرست بنا دیتی ہے اور یہ مادہ پرستی اسے حیوانات کی صف میں شامل کر دیتی ہے۔

ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا فلسفی کانٹ بھی اسی نتیجہ پر پہونچا۔ چنانچہ وہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "تنقید عقلِ خالص" میں لکھتا ہے کہ عقلِ خالص اثباتِ واجب الوجود سے قاصر ہے۔

عقل بوہلۂ اولیٰ انسان کو مادیت کی جانب مائل کر دیتی ہے۔ مگر اس مسلک سے بھی اسے تسلی نہیں ہوتی کیونکہ وہ خود ہی یہ سوال قائم کرتی ہے کہ مادّہ کیا ہے؟ اور جب وہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ماہیت بھی میری دسترس سے باہر ہے۔ اس لئے وہ تشکیک کے دامن میں پناہ لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ جن حکما نے محض اپنی عقل کی مدد سے حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "لا ادری" یعنی میں نہیں جانتا۔ اسی کو مسلک لاادریت یا تشکیک کہتے ہیں اور ہیوم اس مسلک کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

خدا تو بہر حال عقل کی دسترس سے بالاتر ہے کیونکہ وہ بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ، وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے، وہ بیچاری تو مادہ کی حقیقت دریافت کرنے سے بھی قاصر ہے جو محسوس بھی ہے اور مشہود بھی ہے!

اسی لئے عارف شیرازؒ نے ہمیں یہ مشورہ دیا ہے:۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا!

اسی مضمون کو اکبر الہ آبادی مرحوم نے یوں بیان کیا ہے:۔

انکشافِ رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے

فی الجملہ عقل انسانی، زندگی کی پُر پیچ راہوں میں ہماری رہنمائی نہیں کر سکتی کیونکہ جب انسان بذریعہ عقل زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے تو اکثر و بیشتر موقعوں پر اس کی عقل، جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غلط فیصلے صادر کرتا ہے۔ بظاہر عقل حکمرانی معلوم

ہوتی ہے لیکن اگر انسان غور سے دیکھے تو معلوم ہو گا کہ وہ اپنی زندگی جذبات کے تحت بسر کرتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ عقل کچھ کہتی ہے مگر جذبات، عقل پر غالب آجاتے ہیں اور ان سے مغلوب ہو کر عقل، جذبات کی تائید کرنے لگتی ہے بلکہ ان کے فیصلوں کی صحت اور صداقت پر دلائل مرتب کر دیتی ہے۔ انسان اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں نے یہ فیصلہ عقل کی روشنی میں کیا ہے حالانکہ دراصل وہ فیصلہ جذبات کی شدت کا نتیجہ ہوتا ہے مثلاً ہم جانتے ہیں کہ فلاں قوم حق پر ہے مگر جذبۂ وطنیت ہماری عقل پر غالب آجاتا ہے اور وہ حق سے منحرف ہو کر جذبۂ مذکورہ کی صحت پر دلائل قائم کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم باطل کو حق سمجھ لیتے ہیں، اور جادۂ راستی سے منحرف ہو کر باطل کے پیرو بن جاتے ہیں۔ موجودہ سیاست اسی باطل پرستی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

اس لئے اقبالؔ کی تعلیم یہ ہے کہ عقل کو اس کی حدود سے متجاوز نہ ہونے دو۔ اس سے کام تو بیشک لو مگر اسے رہنما مت بناؤ بلکہ اسے عشق (وحی الٰہی) کے تحت رکھو۔ زندگی کی اساس عقل نہیں بلکہ عشق ہے۔ یورپ کی موجودہ تباہی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس نے عقل کو اپنا رہنما بنا لیا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپین اقوام کا زاویۂ نگاہ ملحدانہ اور مادہ پرستانہ ہو گیا اور اس زاویہ نگاہ نے انسان کو حیوان سے بھی بدتر بنا دیا۔

چونکہ مسلمان اپنے دین کی حقیقت سے بیگانہ ہو چکے ہیں اور یورپ کی مادی ترقی نے ان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے اس لئے وہ اہل یورپ کی تقلید پر کمربستہ ہو گئے ہیں چونکہ اہل یورپ کی زندگی سراسر مادہ پرستانہ ہے اس لئے ان کی تقلید کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمان بھی اسی لعنت میں مبتلا ہو جائیں گے

لہٰذا اقبالؔ ان کو عشق کا درس دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ مسلمان رہ کر دنیا میں ترقی کر سکیں۔

واضح ہو کہ قرآن نے انسان کی زندگی کی بنیاد عشق پر رکھی ہے جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے:۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ

اور جو لوگ مومن ہیں اُن کی شناخت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ کی محبت سب محبتوں پر غالب ہوتی ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ غیر محسوس ہے اس لئے اس نے انسان کو آگاہ فرمایا کہ مجھ سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے:۔

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ

اے رسول! مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ میری اتباع (پیروی) کرو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا۔

چونکہ اتباع، بدون محبت محال ہے اس لئے مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد محبتِ رسولؐ قرار پائی۔ اسی لئے اقبالؔ نے یہ کہا:۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است

مسلم ار عاشق نباشد کافر است

یعنی جو مسلمان، عاشقِ رسولؐ نہیں وہ مسلمان نہیں۔ کافر ہے اسی لئے خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں متنبہ فرما دیا:۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَ مِنْ وَّلَدِہٖ وَمِنَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ٥ (متفق علیہ)

اے مسلمانو! تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کی نگاہوں میں اس کے والدین، اس کی اولاد اور سب انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اس آیت اور اس حدیث کی روشنی میں ہر مسلمان اس حقیقت کو واضح طور پر دیکھ سکتا ہے کہ اسلام نام ہے عشق رسولؐ کا۔ اسی لئے اقبال نے ہمیں اپنی ہر تصنیف میں عشق رسولؐ کا درس دیا ہے۔

اب پڑھیے اس شعر کو:-

سپاہ تازہ بر انگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

خرد بہت اچھی چیز ہے، اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے مگر ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے عشق کے تحت رکھیں، یعنی عقل کی اتباع کے بجائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں۔ اگر ہماری عقل، اتباع رسولؐ سے منحرف ہونے کا مشورہ دے تو اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ مسلمان عقل کا پابند نہیں ہے بلکہ سرکار دو عالم کا غلام ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باوؐ نرسیدی تمام بولہبی است

فی الجملہ یہ شعر وہ کنجی ہے جس کی مدد سے ناظرین اس مثنوی کے تمام حقائق و معارف کے دروازوں کو کھول سکتے ہیں۔ بالفاظ دگر، یہ مثنوی اسی شعر کی تفسیر ہے اور سچ پوچھو تو اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں اسی صداقت عظمیٰ کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

دوسرا شعر: لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ دنیا والے عشق کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عشق اور عقل میں تضاد ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے یعنی عشق وہ قبا ہے جو عقل کی قامت پر بالکل موزوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق اور عقل میں مطابقت ہے اس لئے ایک شخص عقل و خرد کے ساتھ عاشق بھی ہو سکتا ہے۔ عشق کا مطالبہ انسان سے یہ نہیں ہے کہ عقل کو خیرباد کہہ دو بلکہ یہ دونوں خوبیاں ایک شخص میں بیک وقت جمع ہو سکتی ہیں۔ بایں طور کہ عشق، انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اپنی عقل کو میری تابع فرمان بنا دو، تاکہ وہ تمہیں غلط راستوں پر نہ لے جائے۔

ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت کی جاتی ہے:۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں کسی جگہ یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ عاشق (مسلمان) کو لازم ہے کہ اپنی عقل سے دستبردار ہو جائے۔ بخلاف ایں، قرآن اور حدیث دونوں نے عقل کی قدر و قیمت اور فضیلت و اہمیت کو واضح کیا ہے۔

تعقل، تفکر، تدبر اور تفقہ یہ سب عقل کی فعلیت ACTIVITY کی مختلف صورتیں ہیں اور قرآن حکیم نے ان سب سے کام لینے کی ہدایت کی ہے مثلاً

(ا) اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (۱۶-۶۷)

بیشک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں

(ب) اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۱۶-۶۹)

بیشک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

(ج) كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ (۳۸-۲۹)

یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے اور جو بڑی برکت والی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں۔

(۷) قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ۵ (۶ - ۹۸)

ہم نے بلاشبہ آیات کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کیلئے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں
ان آیتوں سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی آیات میں تعقل، تفکر،
تدبر اور تفقہ کا حکم دیا ہے۔ اگر عقل اور عشق میں تضاد ہوتا تو اللہ تعالیٰ
کبھی ایسا حکم نہ دیتا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ قرآن حکیم مومن کی ذات میں عشق اور عقل دونوں کو
جمع کرتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ
فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۵ (۳ - ۱۹۱)

(صاحبانِ عقل و فہم وہ لوگ ہیں) جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے
پہلوؤں پر (یعنی ہر حالت میں) اور فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور
جب وہ ایسا کرتے ہیں تو صدقِ دل سے پکار اٹھتے ہیں کہ (اے ہمارے رب!
تو نے اس کائنات کو عبث پیدا نہیں کیا ۱۲

واضح ہو کہ "ذکر" محبت کا اور "فکر" عقل کی نمائندہ اور مظہر ہے اور
قرآن نے ذکر اور فکر دونوں کو بیک وقت مومنین کی ذات میں جمع کر دیا ہے

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
تَفَکَّرُوْا فِیْ اٰیَاتِ اللّٰهِ وَلَا تَتَفَکَّرُوْا فِی اللّٰهِ

اے مسلمانو! غور و فکر کرو اللہ کی نشانیوں میں مگر اللہ کی ذات میں غور و فکر
مت کرو۔ یعنی کائنات کی بناوٹ اور اشیائے کائنات کے خواص اور ان کی
ترکیب میں حتی المقدور غور و فکر کرو کیونکہ ایسا کرنے سے تمہارے اندر یقینی طور پر
یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس کائنات کو کسی قدیر، علیم اور حکیم ہستی نے بنایا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تم اشیائے کائنات کے خواص سے آگاہ ہو کر ان سے متمتع کر سکو گے۔ اور اس طرح دنیا میں سائنس (حکمت) کی شمع روشن ہوگی اور تم رفتہ رفتہ مظاہر کائنات پر حکمران ہو جاؤ گے۔

مگر اللہ کی ذات میں غور و فکر مت کرنا کیونکہ ذات ایزدی عقل انسانی کی دسترس سے بالاتر ہے جو ناقص بھی ہے اور محدود بھی۔ اگر ایسا کرو گے تو تشکیک یا انکار میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

دوسرا نقصان یہ ہوگا کہ بے سود اور لاطائل منطقی موشگافیوں میں منہمک ہو کر عمل (جہاد فی سبیل اللہ) سے بیگانہ ہو جاؤ گے اور جو قوم عمل یعنی جدوجہد ترک کر دیتی ہے وہ دوسروں کی غلام ہو جاتی ہے۔

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ

(ا) عقل بہت مفید اور کار آمد شئے ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔
(ب) مگر اس کی ایک حد ہے جس سے آگے جانا اس کے بس کی بات نہیں ہے یعنی وہ مادیات میں تو چل سکتی ہے مگر ورا الماوریات نہیں جا سکتی۔ وہ اس حد تک ہماری راہنمائی کر سکتی ہے کہ کائنات اور اشیائے کائنات کی بناوٹ میں فکر کر کے یہ فیصلہ صادر کر دے کہ

نظام عالم بتا رہا ہے کہ ہے اک اس کا بنانے والا (اکبر الہ آبادی)

یعنی کائنات کی ساخت بتا رہی ہے کہ کوئی قدیر، علیم اور حکیم ہستی موجود ہے جس نے اسے بنایا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کائنات کا کوئی خالق ہونا چاہئے۔ لیکن وہ حتمی اور اذعانی طور پر یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ خالق فی الحقیقت موجود ہے۔ اور ارباب علم جانتے ہیں کہ "ہونا چاہئے" اور "فی الحقیقت موجود ہے" میں بہت فرق ہے۔

عقل یہ کہہ کر "کوئی خالق ہونا چاہئیے" خاموش ہو جاتی ہے۔

ع جلوۂ ارض و سما دکھلا کے ہے نیچر بھی چپ (اکبر الہ آبادی)

گویا عقل کا وظیفہ FUNCTION ختم ہو گیا اب عشق کی باری آتی ہے

اور وہ یہ کہتا ہے کہ خالق کائنات فی الحقیقت موجود ہے۔ میں تمہیں اس کا مشاہدہ کرا سکتا ہوں۔

جب بو علی سینا (فلسفی) سلطان ابو سعید ابوالخیرؒ سے مل کر رخصت ہوا تو اس کے جانے کے بعد حضرتؒ نے حاضرین مجلس سے ارشاد فرمایا

"آنچہ آدمی داند ما می بینیم"

عقل کا وظیفہ ہے دانستن

عشق کا کرشمہ ہے دیدن

اب ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ اگر اشیائے کائنات میں غور و فکر کیا جائے تو ہر سلیم الطبع انسان اس نتیجہ پر پہونچ گا کہ

(ا) یہ کائنات قدیم نہیں ہے بلکہ حادث ہے۔

(ب) چونکہ حادث ہے اس لئے کوئی قدیم ہستی ضرور موجود ہے۔

(ج) اور وہ ہستی قدیر و علیم و حکیم ہے۔

مثلاً علم نباتات کی فزیالوجی میں تمام سبز پودوں کے لئے۔ PHOTOSYNTHESIS یا CARBON ASSIMILATION ایک حیاتی وظیفہ VITAL FUNCTION ہے۔ اگر یہ فعل نہ ہو تو سبز پودے زندہ نہیں رہ سکتے

کسی سبز پودے کی ساخت یہ ہے کہ وہ بیشمار خلیات CELLS سے مرکب ہوتا ہے اور ہر خلیت میں مرکزہ NECLEUS کے قریب کلوروفل کے بے شمار دانے سبز ہوتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کی طاقتور خوردبین

ہی کی مدد سے نظر آسکتے ہیں۔ انہی سبز دانوں کی وجہ سے پودوں میں سبز رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اگر کلوروفل نہ ہو تو سبز پتہ کاربن جذب نہیں کر سکتا۔

جب لیبارٹری میں کلوروفل کا کیمیاوی تجربہ کیا گیا تو اس میں لوہا، میگنیز کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی کے اس قدر پیچیدہ مرکبات دریافت ہوئے کہ مدتوں کے مسلسل تجربوں کے بعد ان کی ترکیب سمجھ میں آئی۔

تجربات سے معلوم ہوا کہ سبز پودوں میں PHOTOSYNTHESIS یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے انجذاب کا عمل، کلوروفل کے بغیر ناممکن ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس عمل کے لئے روشنی بھی لازمی ہے۔ اسی لئے اس کو PHOTOSYNTHESIS کا نام دیا گیا۔ رات کے وقت یہ عمل نہیں ہوتا۔ اس وقت اس عمل کے بجائے RESPIRATION ہوتا ہے یعنی پودے پتوں کے ذریعہ سے سانس لیتے ہیں اور اس صورت میں پودوں کے سبز خلیات حیوانات کی طرح آکسیجن جذب کر کے کاربن خارج کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت گھنے درختوں کے نیچے سونا صحت کے لئے مضر ہے کیونکہ کاربن انسان کو بیہوش کر سکتا ہے۔

تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اگر PHOTOSYNTHESIS کا عمل نہ ہو اور سبز پودوں کو مستقل طور سے تاریکی میں رکھ دیا جائے تو ان کا سبز رنگ زردی میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ اس تبدیلی کو ETOLATION کہتے ہیں۔ اس کے بعد نہ پودے میں نشاستہ بنتا ہے نہ شکر۔ اس لئے رفتہ رفتہ پودا کمزور ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

مدتوں سے سائنسدانوں کو یہ سوال پریشان کر رہا ہے کہ پودے کے اس

چھوٹے سے خلیہ میں، جو بذات خود ایک عالم ہے، کون سے کیمیاوی تغیرات رونما ہوتے ہیں جو کاربن ڈائی آکسائڈ جیسی سادہ شئی کو ایک طرف تو شکر اور نشاستہ میں تبدیل کر دیتے ہیں، دوسری طرف کلوروفل کے دانوں میں؟ ہزاروں کوششوں کے باوجود یہ راز اب تک کسی سائنسدان کو معلوم نہ ہو سکا کیونکہ جب کبھی انہوں نے کاربن ڈائی آکسائڈ سے شکر اور نشاستہ بنایا تو سب سے پہلے انہیں کاربن اور پانی کے مرکب کو FORMALDIBYD میں تبدیل کرنا پڑتا ہے، اور یہ ایسا کیمیاوی مرکب ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ مرکب پودوں میں پیدا ہوتا ہے تو عقل اس مفروضہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی کیونکہ یہ مرکب پودوں کے حق میں سمّ قاتل ہے۔ اگر یہ مرکب کسی پتہ پر ڈال دیا جائے تو اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔

آج تک یہ راز کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ فارم ایلڈی ہائڈ کی منزل سے گزرے بغیر خلیات میں کاربن ڈائی آکسائڈ، شکر اور نشاستہ میں کیسے اور کیونکر تبدیل ہو جاتی ہے؟ کوئی سائنسدان آج تک کاربن ڈائی آکسائڈ کو فارم ایلڈی ہائڈ میں تبدیلی کے بغیر، نشاستہ میں تبدیل نہیں کر سکا، تو شعوراً لامحتمل یہ ہے کہ خلیات میں کوئی سی لیبارٹری ایسی موجود ہے جس میں ڈائی آکسائڈ براہ راست شکر اور نشاستہ میں تبدیل ہو جاتا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس طریق عمل میں کبھی کوئی غلطی کیوں نہیں ہوتی؟

ملہ خلیہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آسکتا لیکن اس کی ترکیب یہ ہے کہ اس کے وسط میں NUCLEUS ہوتا ہے اس کے گرداگرد چھوٹا سا جس میں کلوروفل کے دانے منتشر ہوتے ہیں اور اس کے گرداگرد ہوتا ہے اس کے گرداگرد خلیہ کی دیواریں ہوتی ہیں ۱۲

تیسرا سوال یہ ہے کہ تجربہ گاہوں میں مرکبات کی تیاری کے لئے مناسب حال حرارت اور اعتدالِ عناصر اشد ضروری ہے چنانچہ ماہرین فن ان دونوں باتوں کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ اگر حرارت میں کمی یا بیشی ہو جائے یا عناصر میں اعتدال نہ ہو تو مرکب تیار نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ مرکب کی تیاری کیلئے ایک ذی عقل ہستی (MIND) لازمی ہے جو

(الف) ہر مرکب کے لئے مناسب حال حرارت متعین کرے اور اسے برقرار رکھے

(ب) ہر مرکب کے عناصر میں اعتدال پیدا کرے یعنی ان کے اوزان کا تعین کرے۔

(ج) مناسب حال وقفہ یا مدت (DURATION OF REACTION) کو بھی ملحوظ خاطر رکھے۔ یعنی کسی مرکب کو کتنی دیر تک حرارت پہونچائی جائے۔

سوال یہ ہے کہ خلیات کی لیبارٹری میں کون عقلمند مدبر حکیم اور ماہر فن ان باتوں کی نگرانی کرتا ہے؟

اس مثال سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

پہلی بات یہ کہ یہ کائنات قدیم نہیں حادث ہے کیونکہ یہاں ہر شئی میں ہر لحظہ تغیر و نما ہو رہا ہے اور ہر متغیر شئی حادث ہوتی ہے۔

دوسری یہ کہ کوئی قدیر، علیم اور مدبر ہستی اس کائنات کی خالق ہے۔ مادہ میں نہ شعور ہے نہ ادراک بلکہ جدید سائنس کی رو سے وہ خود حادث ہے

تیسری یہ کہ عقل، کائنات کے معمے کو حل نہیں کر سکتی یعنی وہ ناقص ہے اور اس لئے زندگی کے معاملات میں انسان کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتی۔ ذیل میں ہم تیسری بات کی وضاحت کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر تک سائنسدانوں کا یہ خیال تھا کہ مادہ قدیم ہے

اور زندگی یا شعور اسی مادہ سے پیدا ہوا ہے لیکن اب تمام بڑے بڑے سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ زندگی، مادہ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ جداگانہ مستقل وجود رکھتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر J.S.NELDONE نے اپنی تالیف "علم الحیات کی فلسفیانہ بنیاد" میں اس حقیقت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اوسپنسکی نے اپنی کتاب TERTIUM ORGANUM میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ سائنس، زندگی کی ماہیت سمجھانے سے قاصر ہے۔ یہ وہ معما ہے جو عقل کی مدد سے حل نہیں ہو سکتا۔ مادہ پرستوں کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ زندگی، مادہ سے پیدا ہوئی ہے۔

ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

زندگی کاہے کو ہے؟ خواب ہے دیوانے کا (فانی بدایونی)

تھیمپس اپنی تصنیف "مفہوم ارتقاء" میں لکھتا ہے کہ ہمیں اس بات کا مطلق علم نہیں ہے کہ زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی۔ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب سائنس (عقل) کی دسترس سے بالاتر ہے۔

ہیکل اپنی تالیف "معمائے کائنات" میں اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ نیچر کی حقیقت، عقل کی مدد سے دریافت نہیں ہو سکتی۔

اسی حقیقت کو اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے:-

کیا ہے جس نے اس عالم کو پیدا اس کو کیا کہئے

خرد خاموش ہے پر دل یہ کہتا ہے خدا کہئے

خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہے کہ عقل ایک حد تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہے یعنی یہ تو بتا سکتی ہے کہ اس کائنات کو کسی نے پیدا کیا ہے مگر وہ ہے کون؟ یہ بتانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لئے

اقبال یہ کہتے ہیں کہ:-

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

یعنی اپنی عقل کو دل (عشق) کا خادم بناؤ۔ اسی نکتہ کو مرشد رومی نے یوں بیان کیا ہے:-

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

یعنی اگر عقل (علم) کو دل کا خادم بنا لوگے تو وہ تمہاری دوست بن جائے گی ورنہ تمہیں گمراہ کر دے گی۔ لہٰذا عقل اور عشق (خرد اور وجدان) میں کوئی تضاد نہیں ہے (جیسا کہ کوتاہ بیں سائنسدان سمجھتے ہیں) بلکہ

ع جنوں قبا ست کہ موزوں بقامت خرد است

یعنی انسان خرد اور جنوں، دونوں کو بیک وقت اپنی ذات میں جمع کر سکتا ہے۔ عقل کی مدد سے قوانین فطرت کا مطالعہ کرو لیکن خالق فطرت کا صحیح علم صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات (بال جبریل)

تیسرا شعر:- یہ شعر پہلے شعر سے مربوط ہے۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے مسلک عشق اختیار کر لیا تو میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں

ع طوافِ بام و در من سعادتِ خرد است

یعنی عشق کے احکام کی تعمیل خرد کے لئے موجب سعادت ہے۔ بالفاظ دیگر، عقل کی معراج یہ ہے کہ وہ عشق کی مطیع اور فرمانبردار ہو جائے کیونکہ پھر وہ گمراہی سے محفوظ ہو جائے گی مطلب یہ ہے کہ اگر انسان صرف اپنی عقل کی پیروی

کرے گا تو یقیناً تشکیک اور الحاد میں گرفتار ہو جائے گا اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ کبھی منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے گا۔ لیکن اگر وہ عشق کو اپنا رہنما بنائے گا۔ اور عقل کو عشق کی اطاعت کا حکم دے گا تو مقصد حیات حاصل کریگا۔

مقصد حیات یہ ہے کہ انسان اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرے تاکہ تسخیر کائنات کے بعد اس میں قانون حق جاری کر سکے جس کا نتیجہ امن عامہ کی صورت میں ظاہر ہوگا اور یہ بات صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں:۔

اس دنیا میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دکھ سے بچے سکھ سے رہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ جسے دیکھو دکھی نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے عشق کے بجائے عقل کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے:۔

(۱) عقل انسان کو یہ سمجھاتی ہے کہ اس دنیا کا کوئی خالق نہیں ہے اور نہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے، اس لئے جس طرح ممکن ہو اپنے عیش کا سامان بہم پہنچاؤ۔

ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایسا جب انسان اس قانون پر عمل کرتا ہے تو دوسروں کو دکھ پہنچا کر اپنے سکھ کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اور چونکہ ہر شخص اپنا سکھ مد نظر رکھتا ہے اس لئے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر شخص دکھی نظر آتا ہے۔

گوتم بدھ کے سامنے انسانی زندگی کا یہی پہلو تھا جو اس نے یہ کہا سروم دکھم یعنی یہ دنیا سراسر دکھ ہے۔ اس دکھ سے نجات پانے کا طریقہ اس نے یہ بتایا کہ چونکہ زندگی دکھ ہے اس لئے زندگی کا خاتمہ کر دو یعنی

زندگی دکھ نہیں ہے، انسانوں نے اپنی حماقت کی وجہ سے زندگی کو دکھی بنا دیا ہے اس لئے اسلام نے یہ تعلیم دی کہ

(ب) دکھ اس لئے رونما ہوتا ہے کہ انسان خدا کے قانون کے بجائے اپنے قانون کو نافذ کرتا ہے اور چونکہ ہر شخص ایسا کرتا ہے اس لئے تصادم لازمی ہے

(ج) اس دکھ سے نجات پانے کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص دنیا میں خدا کا قانون نافذ کرے۔

(د) خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کسی انسان کو دوسرے پر حکومت کا حق حاصل نہیں ہے کوئی شخص دوسروں کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ سب کو اللہ کی غلامی کرنی چاہیے تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اور صرف اللہ کے قانون کی اطاعت کریں گے۔

(ہ) خدا کا قانون وہ لوگ دنیا میں نافذ کر سکتے ہیں جو اپنے اندر اس کی صفات پیدا کریں یعنی عدل و انصاف، رحم دلی، مہربانی، ہمدردی، غمگساری، جود و کرم، بذل و عطا، ظلم و ستم سے اجتناب، اللہ کے دشمنوں پر تہار لیکن اللہ کے دوستوں پر کریم، بالفاظِ دگر وہ لوگ متقی ہوں۔

(و) خدائی صفات صرف عشق کی بدولت پیدا ہو سکتی ہیں عشق کا خاصہ ہے کہ وہ عاشق میں معشوق کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔

(ز) لہذا مسلکِ عشق پر گامزن ہو کر انسان خدا کا قانون دنیا میں نافذ کر سکتا ہے اور چونکہ خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو اس لئے کوئی شخص کسی دوسرے پر ظلم نہیں کر سکتا۔

(ح) نتیجہ اس کا یہ نکلے گا کہ دنیا میں کوئی شخص دکھی نہیں رہ سکتا۔ موجودہ مصائب کا واحد سبب یہ ہے کہ دنیا عشق کے بجائے عقل کی پیروی کر رہی ہے۔

چوتھا شعر: یہ خیال مت کرو کہ خرد کے لئے کوئی حساب اور میزان نہیں ہے۔ بندۂ مومن کی نگاہ، خرد کے حق میں بمنزلۂ قیامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عقل رہنما ئے کامل یا حاکم علی الاطلاق ALTIMATE AUTHORITY نہیں ہے بلکہ بندۂ مومن (عاشق) کی نگاہ، اس کے حسن و قبح کا معیار ہے یعنی عقل کا وہ فیصلہ صحیح ہے جسے عشق صحیح قرار دے۔ بالفاظِ دگر، قرآن حکیم، عقل کی صحت یا سقم کا معیار ہے۔

آجکل لوگ عقل کو حسن و قبح کا معیار سمجھتے ہیں یعنی جسے عقل صحیح قرار دے وہ بات صحیح ہے۔ اس مطلب یہ ہے کہ دنیا میں عقل سے بالاتر یا برتر کوئی شئی نہیں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ حقیقی اور اصلی معیار عشق ہے جس پر تمام امور کی صحت پرکھی جائے گی۔

عقل کے فیصلوں میں غلطی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے کیونکہ عقل کا دارومدار حواس پر ہے اور حواس اکثر غلطی کرتے ہیں۔ خود سائنس کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ عقل جس بات کو مدتوں تک صحیح سمجھتی رہی وہ آگے چل کر غلط ثابت ہوئی مثلاً انیسویں صدی تک مادہ کو قدیم اور ناقابل فنا یقین کیا جاتا تھا مگر موجودہ صدی میں مادہ حادث اور فنا پذیر ثابت ہو چکا ہے لیکن عشق کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوتے کیونکہ اس کا دارومدار حواس پر نہیں ہے بلکہ وجدان پر ہے اور وجدان میں غلطی نہیں ہو سکتی۔

فلسفی جو کچھ کہتا ہے وہ اپنے قیاس کی بنا پر کہتا ہے اور قیاس میں ہر وقت غلطی کا احتمال رہتا ہے بلکہ عاشق (مومن) جو کچھ کہتا ہے وہ دیدار کی بنا پر کہتا ہے اور دیدار میں غلطی نہیں ہوتی۔ دید اور شنید میں جو فرق ہے اسے ہر شخص بخوبی سمجھتا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

فلسفی بھی کہتا ہے کہ خدا موجود ہے مگر اسے اپنے قول پر یقین حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ محض قیاس کی بنا پر ایسا کہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں نبی بھی یہی کہتا ہے کہ خدا موجود ہے مگر اسے اپنے قول پر حق الیقین حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ دیکھنے کے بعد ایسا کہتا ہے۔

حاصل کلام اینکہ مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی یا دوسروں کی عقل کے فیصلوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں پرکھیں۔ نگاہ بندہ مومن سے مراد وہ بصیرت ہے جو قرآن حکیم کی بدولت پیدا ہوتی ہے اور یہی نگاہ کا معیار حسن و قبح ہے۔ یہ عقل کا امام ہے اور تابع عشق کا ہے۔ اور بات وہی صحیح ہے جسے عاشق یا مرد حق صحیح قرار دے۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

تبصرہ

جس طرح یہ مثنوی اقبال کی تمام تصانیف کا خلاصہ ہے اسی طرح یہ چار شعر اس مثنوی کا خلاصہ ہیں اس لئے میں ناظرین کی توجہ خصوصیت کے ساتھ ان اشعار پر مبذول کرنی چاہتا ہوں۔ ان اشعار کی روح یہ ہے کہ وہ اقبال کہتے ہیں کہ چونکہ اس دور مادیت میں مسلمان مغربی سائنس سے مرعوب ہو کر عقل کی پیروی کرنے لگے ہیں اور اقوام مغرب کی تقلید میں عقل کو رہنما سمجھنے لگے ہیں اس لئے میں انہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ عقل صرف ایک حد تک رہنمائی کر سکتی ہے، کامل رہنما نہیں ہے۔ یہ مقام صرف عشق کو حاصل ہے اس لئے انہیں لازم ہے کہ عشق کو اپنا رہنما بنائیں۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من

عقل بلاشبہ بہت قیمتی شے ہے اور ایک حد تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہے یعنی مادیات میں اس پر اعتماد کر سکتے ہیں مگر اس میں جرأت رندانہ نہیں ہے یہی اس کا سب سے بڑا نقص ہے۔ وہ ہمیں قوانین فطرت سے آگاہ کر سکتی ہے مگر تسخیر کائنات اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمیں جرأت رندانہ درکار ہے اور یہ نعمت صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اقبال نے اپنے کلام میں عقل کی تنقیص نہیں کی ہے صرف یہ کہا ہے کہ عقل، مرشد کامل یا رہنمائے حقیقی نہیں ہے۔ اس میں بہت خوبیاں ہیں مگر ایک بڑا نقص یہ ہے کہ جرأت رندانہ سے محروم ہے۔

عقل ہم عشق است و از ذوق نگہ بیگانہ نیست

لیکن آں بیچارہ را ایں جرأت رندانہ نیست (زبور عجم)

اس لئے مومن کا فرض ہے کہ عقل کے ساتھ ساتھ عشق کو بھی اپنا رہنما بنائے اور ان دونوں کی مدد سے اپنا مقصد حیات حاصل کرے محض عقل انسان کو گمراہ کر دیتی ہے مگر جب وہ عشق کے تابع ہو جاتی ہے تو انسان حقیقی معنی میں کامیاب اور فائز المرام ہو جاتا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں

علم با عشق است از لاہوتیاں

یعنی مجرد عقل انسان کو طاغوت کا پیرو (کافر) بنا دیتی ہے مگر جب وہ عشق کے تابع ہو جاتی ہے تو انسان لاہوتی (مومن) بن جاتا ہے۔

داند آں کو نیک بخت و محرم است

زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است (رومی رح)

جب عقل انسانی تابع عشق ہو جاتی ہے تو عیوب سے پاک ہو کر انسان کے حق میں رحمت بن جاتی ہے لیکن اگر وہ عشق کے حکم سے آزاد ہو جائے تو وہی عقل بنی آدم کے حق میں زحمت ہو جاتی ہے۔ؔ اس کی مثال درکار ہو تو صحابہ کرام کی زندگیوں کا اقوام مغرب کی زندگیوں

ؔ عقل اندر حکم دل یزدانی است

چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

سے مقابلہ کر لیا جائے۔ جب فاروق اعظمؓ نے دمشق فتح کیا تو نصاریٰ کے گرجے میں اس لئے نماز نہیں پڑھی کہ مبادا آئندہ مسلمان اسے مسجد قرار دیکر نصاریٰ کو ان کے معبد سے محروم نہ کردیں۔ اس کے مقابلہ میں جب کچنر (علیہ ما علیہ) نے خرطوم فتح کیا تو مہدی سوڈانی کی قبر کھدوا کر اس بندۂ مومن کی ہڈیاں سر بازار نذر آتش کر دیں!

فاتح دونوں ہیں، مگر طرزِ عمل بالکل مختلف ہے۔ فاروق اعظمؓ کا طریقِ عمل لاہوتی ہے۔ کچنر کا طریق کار طاغوتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اوّل الذکر کی عقل، عشق کی غلام تھی اور آخر الذکر کی عقل، عشق کی غلامی سے آزاد تھی۔

آخری شعر میں اقبال نے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ

نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

یعنی قرآن حکیم عقل کی صحت و سقم اور اس کے حسن و قبح کا معیار ہے ۱۲

فصل دوم

تمہید

خلاصہ تمہید میں اقبال نے چار بند لکھے ہیں اور اپنے خیالات مرشد رومی کی زبان سے ادا کئے ہیں۔ ناظرین کی سہولت کے لئے ذیل میں ہر بند کا خلاصہ درج کرتے ہیں:

پہلے بند میں اقبال مرشد رومی سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ بعد ازاں وہ اقبال سے یہ کہتے ہیں کہ اقوام مشرق، خواب گراں سے بیدار ہو گئی ہیں اس لئے تم ان کو نئی حیات کا درس دو تاکہ وہ فرنگ کی غلامی سے رہائی حاصل کر سکیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے چند حقائق بیان کئے ہیں مثلاً

(ا) مصرع — انساں را زندگی جذب دروں

(ب) مصرع — مومن از عزم و توکل قاہر است

(ج) عصر حاضر، رمز جاں سے آگاہ نہیں ہے اس لئے وہ غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہے۔

(د) چونکہ فلسفی رمز جاں کو نہیں سمجھ سکتا، اس لئے وہ مادیات میں منہمک ہے۔

(ہ) مبارک ہے وہ شخص جو غیر اللہ سے قطع تعلق کرے۔

دوسرے بند میں رومیؒ نے یہ تلقین کی ہے کہ دنیا پرست رموز عشق و

محبت نہیں سمجھ سکتے، اس لئے ان کو مخاطب مت کرو۔

گ بجز بہ شیراں کم بگو اسرارِ خویش

تیسرے بند میں انہوں نے اقبالؔ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ جو لوگ در اصل آزادی کے طلبگار ہیں انہیں دین و سیاست کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کرو۔

چوتھے بند میں مرشد رومیؒ نے مومن کی حقیقت واضح کی ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے لئے جیتا ہے۔ اس کا مقصدِ حیات دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہے۔

مرشد رومیؒ کے مختصر سوانح حیات

مولانا ۶۰۴ھ ۱۲۰۷ء میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے۔ ۶۱۰ھ میں ان کے والدؒ ان کو نیشاپور لے گئے اور حصولِ برکت کی غرض سے ان کو خواجہ فرید الدین عطارؒ کے قدموں میں ڈال دیا۔ انہوں نے سر پر دستِ شفقت رکھا اور دعائیں دیں۔

وطن آنے کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد خواجہ بہاء الدین کا بادشاہِ وقت خوارزم شاہ سے اختلاف ہو گیا جس کی وجہ سے انہوں نے وطن کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دیا اور مختلف شہروں کی سیاحت کے بعد آخر کار قونیہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور ۶۲۹ھ میں وفات پائی۔

والد کی وفات کے بعد مولینا ان کی جگہ مسندِ درس و افتا پر بیٹھے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان کے علم و فضل کی شہرت دور دور پھیل گئی مگر مشیت کو انہیں مرشد رومیؒ بنانا تھا اس لئے ایک واقعہ ایسا رونما ہوا جس نے ان کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اس کی تفصیل اقبالؔ ہی کے الفاظ میں درج کرتا ہے:۔

حضرت شیخ کمال الدین جنیدیؒ نے حضرت شمس تبریزؒ کو حکم دیا کہ مولانا جلال الدین کے درس میں جا کر ان کو "قال" کے صحرا سے نکال کر "حال" کی وادی میں داخل کر دو۔ چنانچہ شمس تبریزیؒ مولینا کے درس میں آئے اور ان سے کہا یہ شور و غوغا یہ قیاس و استدلال، یہ قیل و قال سب بیکار ہے۔ ان باتوں سے منطق اور فلسفہ سے خدا نہیں مل سکتا۔ اس لئے اس راہ کو ترک کر دو۔ مولانا نے یہ سن کر کہا "تم بہت نادان ہو جو علماء پر زبان طعن دراز کر رہے ہو!

پا سے خود بیش از نگہ میدار گمراہ

قیل و قال است ایں، ترا با او سے چہ کار؟

میری فلسفیانہ تقریر تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتی، جاؤ اپنی راہ لو!

قال ما از فہم تو بالاتر است — شیشۂ ادراک را روشنگر است

یہ سن کر شمس تبریزی نے ایک آہ کھینچی جس کے اثر سے کتب میں آگ لگ گئی اور مولانا کی کتابیں جل کر خاک سیاہ ہو گئیں۔ یہ حال دیکھ کر انہوں نے کہا کہ تم نے علم و حکمت کے اس گراں بہا ذخیرے کو کیوں ضائع کر دیا؟

تو مرد عارف نے کہا:۔

گفت شیخ اے مسلم زنار دار — ذوق و حال است ایں ترا با اوسے چہ کار؟

حال ما از فکر تو بالاتر است — شعلہ ما کیمیائے احمر است

(اسرار خودی صفحہ ۷۴ تا ۷۶)

فی الجملہ شمس تبریزیؒ سے مولانا کی ملاقات ۶۴۲ھ (۱۲۴۴ء) میں ہوئی۔ اور یہ سلسلہ ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء) تک جاری رہا۔ ان کی صحبت میں مولانا نے سلوک کے تمام منازل طے کیں اور بقیہ زندگی اسی رنگ میں بسر کی۔

شمس کی شہادت یا غیبوبت کے بعد مولانا نے شیخ صلاح الدین زرکوب کے ساتھ رشتۂ مودت استوار کیا اور ان کی وفات کے بعد مولانا نے اپنے خاص مرید شیخ حسام الدین کو اپنا ہمدم و ہمراز بنایا اور انہی کی استدعا پر اپنی غیر فانی مثنوی لکھنی شروع کی۔ مولانا نے ۶۷۲ھ میں وفات پائی۔

تصانیف
(۱) فیہ ما فیہ۔ یہ کتاب اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے معین الدین پروانہ کے نام لکھے تھے۔

(۲) دیوان۔ یہ دیوان بہت ضخیم ہے۔ اس میں ۲۵۰۰۰ سے زائد غزلیں ہیں۔ چونکہ اس کا نام دیوان شمس تبریز ہے اس لئے لوگ غلطی سے اس کو انہی کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ لیکن در اصل یہ مولانا ہی کا کلام ہے۔

(۳) مثنوی۔ اسی کتاب نے مولانا کے نام کو حیاتِ جاوید بخشی ہے اور فارسی زبان میں اس سے بڑھ کر مقبول کتاب کوئی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب تمام اسلامی علوم مثلاً الٰہیات، اخلاق، اصول دین عقائد، کلام اور تصوف کی سائیکلو پیڈیا ہے۔ ان کے علاوہ اس میں فلسفہ (مابعد الطبیعات) کے تمام بنیادی مسائل بھی مذکور ہیں۔

مثنوی کا اصلی موضوع تصوف ہے یعنی اس کتاب میں مولانا نے شریعت کے اسرار اور طریقت کے رموز بیان کئے ہیں۔ اور تصوف کی بنیادی تعلیم وحدت الوجود ہے۔

رومیؒ وحدت الوجود کے قائل ہیں اور یہ عقیدہ انہوں نے شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ سے سیکھا ہے، اور شیخ اکبر نے یہ تعلیم قرآن و حدیث سے اخذ کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جسے تم کائنات کہتے ہو اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ وجودِ مطلق کا جلوہ ہے۔ وحدت اصل اور حقیقی ہے۔ کثرت محض وہمی

اور اعتباری ہے[1] ملاحظہ ہو:-

گم شدہ اندر یک تن بیش نیست | جز خیالات عدد اندیش نیست (دفتر سوم)

بحر وحدانیست جفت و زوج نیست | گوہر و ماہیش غیر موج نیست (دفتر ششم)

اے محال و اے محال اشراک او | دور از آں دریا موج پاک او "

نیست اندر بحر شرک و پیچ پیچ | لیک با احول چہ گویم ہیچ ہیچ "

چونکہ جفت احولانیم اے شمن | لازم آمد مشرکانہ دم زدن "

اصل بیند دیدہ چوں اکمل بود | فرع بیند چونکہ مرد احول بود (دفتر پنجم)

ایں دوئی اوصاف دیدہ احول است | ورنہ اول آخر، آخر اول است (دفتر ششم)

کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہُ بَاطِلٌ | اِنَّ فَضْلَ اللّٰہِ غَیْمٌ ھَاطِلٌ (دفتر اول)

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ | زندہ معشوق است و عاشق مردۂ "

در من و ما سخت کردستی تو دست | ہست ایں جملہ خرابی از دو ہست "

کل شیٔ ھالکٌ جز وجہ او | چوں نۂ در وجہ او ہستی مجو "

[1] اقبال نے بھی اپنی مایۂ ناز تصنیف "تشکیل جدید" (خطبات مدراس) میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ "یہ کائنات حالات مادی کی حرکت سے لیکر فکر کی حرکت تک تمامہ انائے کبیر (وجود حقیقی) کا جلوۂ ذات ہے"۔

میں نے یہ چند اشعار بطور مثال درج کر دئیے ہیں ورنہ مثنوی کا ہر دفتر وحدت الوجود کی تلقین سے معمور ہے۔ چونکہ اقبالؔ نے اس مسئلہ کے علاوہ اپنے تمام بنیادی تصورات، مثنوی ہی سے اخذ کئے ہیں اس لئے انہوں نے کمال دیانت داری کے ساتھ اپنی ہر تصنیف میں مرشد رومیؒ کے فیضان کا اعتراف کیا ہے اور "ارمغانِ حجاز" میں تو انہوں نے اپنے آپ کو مثیلِ رومیؒ قرار دیا ہے۔

چو رومی در حرم دادم اذان من | از و آموختم اسرارِ جان من
بدورِ فتنۂ عصرِ کہن او | بدورِ فتنۂ عصرِ رواں من

یعنی میں نے رومیؒ کے نقشِ قدم پر چلکر مسلمانوں کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کیا ہے اور روح کے تمام اسرار انہی سے سیکھے ہیں۔ جس طرح انہوں نے اپنے زمانہ میں عقلیت (RATIONALISM) کے خلاف جہاد کیا تھا اور اس کے مقابلہ میں عشق کا پیغام دنیا کو دیا تھا اسی طرح اس زمانہ میں، میں نے اس تحریک کے خلاف جہاد کیا اور دنیا کو عشق کا نغمہ سنایا۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم تمہید کی شرح لکھتے ہیں:۔

کہتے ہیں کہ پیر رومیؒ بلا شبہ مرشد روشن ضمیر اور سلسلۂ عشق کے علمبردار ہیں مثنوی کے مطالعہ سے ان کی بلندیٔ افکار کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کا سینہ نورِ قرآن سے معمور ہے اور ان کے کلام کے مطالعہ کی بدولت میرے قلب میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

جب میں نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا تو عالم خیال میں ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اے اقبالؔ! اقوام مشرق مدتوں کے بعد بیدار ہوئی ہیں (اور ان میں حصول آزادی کا جذبہ پیدا ہوا ہے) یعنی وہ اقوام فرنگ کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے بیتاب ہیں۔

چونکہ اس زمانہ میں تجھ سے بڑھ کر کوئی شخص "دانائے اسرارِ فرنگ" نہیں ہے۔ تو نے اقوام مغرب کی حکمتِ عملی (ڈپلومسی) عیاری اور فریب کاری کا بخوبی مطالعہ کیا ہے اس لئے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو ان کی مکاریوں کا پردہ چاک کر دے اور اقوام مشرق کو ان کے تسلط سے آزاد ہونے کا طریقہ بتا دے

اس کے بعد رومی نے حسب ذیل معارف بیان کئے ہیں:-

(۱) اعتبار زندگی جذبِ درون | کم نظر ایں جذب را گوید جنوں
ہیچ قومے زیر چرخ لاجورد | بے جنونِ ذو فنون کارے نکرد

یعنی سب سے پہلے اقبال نے رومی کی زبانی سے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ قوموں کی زندگی کی بنیاد عقل نہیں ہے بلکہ جذب اندرون (عشق) ہے۔ جو لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں بالفاظ دیگر، عقل کے پرستار ہیں) وہ اس جذب اندرون کو جنون کہتے ہیں یعنی خلاف عقل قرار دیتے ہیں حالانکہ قوموں کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے اُس جنونِ ذو فنون کے بغیر کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔

چونکہ لفظ جنوں مبہم ہے (اس کا عرفی مفہوم مذموم ہے) اس لئے انہوں نے اس کا مفہوم متعین کرنے کے لئے "ذو فنون" کا اضافہ کر دیا ہے یعنی جنون کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جنون تو وہ ہے جس کو دماغی اختلال یا مرض سے تعبیر کرتے ہیں، یہ مذموم ہے اور اقبال کی مراد یہ نہیں ہے۔ دوسرا جنون وہ ہے جس پر ساری دنیا کی عقل نثار کر سکتے ہیں۔ یہ وہ جنون ہے جس کی بدولت کولمبس نے امریکہ دریافت کیا، عربوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے، بابر نے ہندوستان فتح کر لیا، ترکوں نے خشکی میں جہاز چلا دیئے۔ سلطان الہند خواجہ غریب نواز نے اجمیر کو رشد و ہدایت کا مرکز بنا دیا

اور صحابۂ کرامؓ نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیے۔

اب ہم ان دونوں شعروں کی وضاحت کرتے ہیں :-

پہلی بات اقبالؒ نے یہ بیان کی ہے کہ قوموں کی زندگی، جذب دروں پر موقوف ہے یعنی دنیا میں وہی قوم سربلندی حاصل کر سکتی ہے جس کے افراد سربلندی حاصل کرنے کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل انسان کو جان دینے سے باز رکھتی ہے۔ فلسفی یا منطقی بحث کر سکتا ہے تقریریں کر سکتا ہے کتابیں لکھ سکتا ہے مگر میدان جنگ میں جا کر موت سے ہم آغوش نہیں ہو سکتا اور جان دیئے بغیر کوئی قوم سربلندی حاصل نہیں کر سکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جو افراد (قوم) کو جان دینے پر آمادہ کر سکتی ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جب تک ان کے دل میں کامیابی کا بے پناہ جذبہ موجزن نہ ہو، وہ سر سے کفن باندھ کر میدان جنگ میں نہیں جا سکتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جذبۂ دروں (جنون، دیوانگی) کے بغیر آج تک کوئی قوم کوئی قابل فخر کارنامہ انجام نہیں دے سکی۔ اس کی صداقت پر دنیا کی تاریخ شہادت دے سکتی ہے کہ جس قوم نے راحت طلبی کو شعار زندگی بنایا وہ یقینی طور پر دوسروں کی غلام بن گئی بلکہ جس قوم نے میدان جنگ سے جی چرایا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔

اس لئے اگر اقوام مشرق آزادی کی طلبگار ہیں تو انہیں سب سے پہلے اپنے اندر حصول آزادی کا بے پناہ جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔

شاید کسی کو یہ شبہ لاحق ہو کہ اقبالؒ عقل کو بالکل بیکار سمجھتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ عقل کو بیکار نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عقل کا کام

نصب العین کا تعین ہے، مگر اس کا حصول اس کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ عشق پر موقوف ہے۔

دوسرا نکتہ: عشق حقیقی، مومن کے اندر وہ خوبیاں پیدا کر دیتا ہے جن کی بدولت وہ مشکلات پر غالب آتا ہے یعنی عزم اور توکل۔ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو اس میں اور ایک کافر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جذبِ دروں سے آرزو پیدا ہوتی ہے اور آرزو سے ارادہ (عزم) پیدا ہوتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عزم سے مراد ہے آرزو یعنی مومن وہ ہے جس کے دل میں اپنا جہاں آپ پیدا کرنے کی آرزو کارفرما ہو:-

نہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

لہٰذا عزم سے مراد ہے تخلیقِ جہانِ نو کی آرزو۔ یہ صفت اس قدر اہم ہے کہ خدا نے اقبال سے یہ کہا:-

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

اب اس شعر کو دوبارہ پڑھیے:-

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر، کافر است

ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ عزم سے مراد نئی دنیا پیدا کرنے کی آرزو ہے۔

مومن کی دوسری صفت توکل ہے۔ توکل کا معنی ہے۔

(۱) عزم کر کے میدانِ عمل میں کود پڑنا:-

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اس سے معلوم ہوا کہ عزم دراصل جذب دروں (عشق) کی شکل بیرونی کا نام ہے (ب) اور کامیابی کے لئے اللہ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرنا (یا نتیجہ خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دینا) اس لئے ہر وقت اس کو یاد کرتے رہنا اور یہ کہنا کہ اے خدا! میں کامیابی کے لئے تیرے فضل و کرم کا محتاج ہوں۔ اگر تو نہ چاہے تو میں محض اپنی کوشش سے کبھی ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔

عزم وہ صفت ہے جس کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔ لیکن توکل وہ صفت ہے جس کی وجہ سے اس کا تعلق خدا کی ذات سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جب انسان عزم کرتا ہے تو وہ اپنی ذات پر بھروسہ کرتا ہے مگر جب وہ توکل کرتا ہے تو خدا کی ذات پر بھروسہ کرتا ہے۔ بالفاظ دگر مومن کا عزم اپنی ذات پر اعتماد (اعتماد علی النفس) کا نام ہے اور اس کا توکل خدا پر اعتماد (اعتماد علی اللہ) کا نام ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اعتماد علی اللہ اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب اعتماد علی النفس پہلے سے موجود ہو۔ اگر ایک انسان اپنی "خودی" پر اعتماد نہیں رکھتا یعنی جدوجہد نہیں کرتا تو محض اعتماد علی اللہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا کیونکہ خدا کا فضل صرف مجاہدین پر نازل ہوتا ہے، قاعدین (بیٹھے رہنے والے) اس نعمت سے محروم رہتے ہیں

اس حقیقت کو حسب ذیل آیات سے مبرہن کرتا ہوں:

(۱) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا (ظفر علی خاں مرحوم)

(ب) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ط

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں انہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ امید کریں اللہ کی رحمت کی۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ اسلام، انسان کے اندر یہ دونوں خوبیاں پیدا کر دیتا ہے یعنی مومن وہ ہے جو

(ا) یہ یقین رکھتا ہے کہ میں دنیا میں خدا کا نائب (خلیفہ) ہوں اور چونکہ نیابت کے لئے اقتدار شرط ہے اس لئے مجھ میں تسخیر کائنات کی صلاحیت موجود ہے یہ یقین اس کے اندر بے پناہ طاقت پیدا کر دیتا ہے۔

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

یعنی اس یقین کی بدولت اس کے اندر اعتماد علی النفس پیدا ہو جاتا ہے۔

(ب) یہ یقین رکھتا ہے کہ طاقت، قوت اور کامیابی کا سرچشمہ در اصل اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اگر میں ایمان لا کر اس کی راہ میں جہاد کروں گا تو وہ مجھ پر رحمت نازل فرمائے گا۔ اسی یقین کا دوسرا (اصطلاحی) نام توکل (اعتماد علی اللہ) ہے۔

گویا اسلام کی رو سے مومن کی پوری زندگی عزم اور توکل کے محور پر گردش کرتی ہے اسی لئے اقبال نے یہ بلیغ مصرع موزوں کیا کہ

ع مومن از عزم و توکل قاہر است

یعنی انہی دو صفتوں کی بدولت اس کے اندر قہاری (تسخیر کائنات) کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نکتۂ عجیبہ اقبال نے اس آیت سے اخذ کیا ہے:۔

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴿۳ - ۱۵۹﴾

پس جب آپ پختہ ارادہ کرلیں تو اس کے بعد اللہ (کی رحمت) پر توکل (اعتماد) کیجیے

اب دوسرے مصرع کے مفہوم کو واضح کرتا ہوں۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ

ع
گر تدارد ایں دو جوہر کافر است

یعنی اگر ایک شخص میں جو ایمان کا مدعی ہو، یہ دو "جوہر" نہ ہوں تو در اصل وہ کافر ہے۔ بظاہر یہ بہت بڑا دعویٰ ہے جو اقبالؔ نے کیا ہے اور بادی النظر میں شاعرانہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن بنظر تعمق دیکھا جائے تو بالکل صحیح ہے اسی لئے اقبالؔ نے ان دو صفات کے لئے "جوہر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

جوہر کہتے ہیں روح ESSENCE یا قوام شئی کو یعنی وہ اصل جس پر کسی شئی کی ہستی موقوف ہو۔ جوہر کسی شئی کے خلاصہ کو بھی کہتے ہیں یعنی عزم و توکل اسلامی زندگی کی روح بھی ہے اور تعلیمات اسلام کا خلاصہ بھی ہے۔ ذیل میں اس اجمال کی تفصیل ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے:۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ الایمان بین الجبر والاختیار

اسی حدیث کو اقبالؔ نے گلشن راز جدید میں یوں بیان کیا ہے:۔

چنیں فرمودہ سلطانِ بدر است
کہ ایماں درمیانِ جبر و قدر است

یعنی مومن وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھے کہ میں مجبور بھی ہوں، مختار بھی ہوں۔ (۱) مجبور اس لئے ہوں کہ میں از خود موجود نہیں ہوا ہوں بلکہ مخلوق ہوں یعنی اللہ تعالیٰ نے جو خالق کائنات ہے، مجھے اپنی مشیت کے مطابق پیدا کیا ہے جب چاہا اس وقت پیدا کیا، جہاں چاہا وہاں پیدا کیا، جیسا چاہا ویسا پیدا کیا۔ عزت ذلت، صحت مرض، رزق، عمر، نفع نقصان سب اس کے ہاتھ میں ہے۔

نہ میں نظامِ کائنات میں کوئی تبدیلی کر سکتا ہوں اور نہ قوانینِ فطرت میں ردوبدل کر سکتا ہوں۔ نہ یہاں آنا میرے اختیار میں تھا اور نہ یہاں سے جانے میں میری مرضی کو کوئی دخل ہوگا۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

(ب) مختار اس لئے ہوں کہ میرے خالق نے مجھے محدود دائرہ میں اختیار عطا کیا ہے مثلاً یہ تو میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں اپنے جسم میں دو کی جگہ چار یا آٹھ آنکھیں پیدا کر لوں، آنکھیں تو دو ہی رہیں گی لیکن یہ اختیار مجھے ضرور حاصل ہے کہ ان دو آنکھوں سے دیکھوں یا نہ دیکھوں۔ ایک جامع مثال لکھ دوں جو کرنٹ (برقی رو) میرے کمرے میں آرہی ہے، اس پر مجھے کوئی اختیار نہیں ہے لیکن یہ بات میرے اختیار میں ہے کہ اپنے کمرے کو منور کر دوں یا نہ کروں اس مثال پر غور کرنے سے جبر و اختیار کا مسئلہ بآسانی اور بخوبی حل ہو سکتا ہے کرنٹ کو روح تصور کر لو، کمرے کو جسم۔ روح پر کسی انسان کو اختیار نہیں۔ وہ تو "مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" ہے۔ مگر اس پر اختیار ہے کہ اس کی بدولت جدوجہد کرے یا نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو جو طاقتیں، قوتیں، صلاحیتیں، خوبیاں اور قابلیتیں دی ہیں ان میں وہ کوئی کمی بیشی یا تبدیلی نہیں کر سکتا لیکن اسے یہ اختیار ضرور ہے کہ وہ ان کو اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرے یا نہ کرے۔

اب اگر ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ میں تو بالکل مجبور ہوں، مجھ میں اختیار کی صفت بالکل نہیں اس لئے میں کسی بات کا عزم نہیں کر سکتا، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا کیونکہ اگر واقعی خدا نے اسے مجبورِ محض ہی پیدا کیا ہے

تو پھر شریعت کیوں نازل کی؟ اسے ذمہ دار کیوں بنایا؟ بالفاظِ دگر وہ شریعت کا انکار کر رہا ہے بلکہ اعوذ باللہ وہ خدا کو موردِ الزام بنا رہا ہے کہ خود ہی اُسے مجبور بنایا اور پھر خود اس سے جہاد کا مطالبہ کیا۔ خلاصۂ کلام اینکہ جبرِ خالص کا عقیدہ انسان کو کافر بنا دیتا ہے۔

اس کے برعکس اگر وہ یہ کہتا ہے کہ میں مختارِ مطلق ہوں۔ خدا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں دے سکتا لہٰذا مجھے توکل کی ضرورت نہیں ہے تو اس نے خدا کو معطل قرار دے دیا اور یہ عقیدہ بھی اسے اسلام سے خارج کر دے گا کیونکہ جب خدا، نظامِ کائنات میں دخیل ہی نہیں تو اس کا وجود اور عدم (عملی اعتبار سے) دونوں برابر ہیں۔ جو شخص اپنے کو مختارِ مطلق سمجھتا ہے وہ رحمتِ الٰہی کا امیدوار نہیں ہو سکتا۔ خلاصۂ کلام اینکہ جبر کا عقیدہ شریعت کو مہمل اور بے سود بنا دیتا ہے اور قدر کا عقیدہ خدا کو زندگی سے خارج کر دیتا ہے یعنی جبری عزم نہیں کر سکتا اور قدری توکل سے بیگانہ ہو جاتا ہے اسی لیئے اقبال نے یہ کہا کہ

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد این دو جوہر کافر است

اب یقیناً یہ نکتہ واضح ہو گیا ہو گا کہ عزم اور توکل، مسلمان کی زندگی کے لیئے منزلۂ سنگِ بنیاد ہیں اور سب جانتے ہیں کہ اگر بنیاد متزلزل ہو جائے تو عمارت لامحالہ منہدم ہو جائے گی۔

اس کے بعد اقبال یہ کہتے ہیں کہ

ع خیر را او باز می داند ز شر

یعنی مومن کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ خیر و شر میں امتیاز کر سکتا ہے

وہ جانتا ہے کہ کون سا فعل خیر (اچھا) ہے اور کون سا فعل بُرا (شر) ہے

واضح ہو کہ جبر و قدر کی طرح، خیر و شر کی بحث بھی قدیم زمانہ سے فلسفہ میں معرکہ آرا رہی ہے اور آج تک اس مسئلہ کا کوئی تسلی بخش حل، عقل کی مدد سے دریافت نہیں ہو سکا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل درحقیقت، جذبات کی کنیز ہے۔ بظاہر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انسان پر عقل حکمران ہے لیکن دراصل وہ جذبات کا خادم ہے اور عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس جذبہ کی صحت پر دلائل قائم کرے جس کے تحت ایک شخص کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے اکثر ماہرین نفسیات اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

(الف) انسان اپنی زندگی جذبات کے تحت بسر کرتا ہے۔

(ب) عقل فضول سازی جذبات کی صحت پر دلائل مہیا کرتی ہے اور اس کو یقین دلا دیتی ہے کہ تم جو کچھ کرنے والے ہو وہ بالکل درست اور ٹھیک ہے یہی وجہ ہے کہ جو بات ایک شخص کی نگاہ میں خیر ہے دوسرا اسے شر سمجھتا ہے اور اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک عقل انسانی، خیر و شر کا کوئی مستقل معیار معین نہیں کر سکی ہے۔ یہیں سے وحی کی ضرورت ثابت ہوتی ہے یعنی خالق خیر و شر ہی بتا سکتا ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے مومن چونکہ وحی الٰہی پر ایمان رکھتا ہے اس لئے وہ جانتا ہے کہ کون سا فعل میرے حق میں مفید ہے اور کون سا فعل، مضر ہے۔

مومن کی تیسری صفت اقبالؔ نے یہ بیان کی ہے کہ اس کی نگاہ (قوت ارادی) دنیا میں انقلاب برپا کر دیتی ہے اور جب وہ آمادۂ انقلاب ہوتا ہے تو اس کی راہ میں جس قدر دشواریاں حائل ہوتی ہیں سب کو دور کر دیتا ہے یعنی

کوہسار از ضربت او ریزہ ریز

اس کے بعد رومیؒ، اقبالؔ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

ع در چمن زی مثلِ بو مستور و فاش

یعنی دنیا میں خوشبو کی طرح زندگی بسر کرو۔ وہ اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ (مستور) ہے مگر اپنی تاثیر (فعلیت) کے اعتبار سے ظاہر (فاش) ہے۔ اسی طرح مومن کو چاہیئے کہ دنیا والوں سے بے تعلق (مستور) رہے مگر افادہ (نفع رسانی) میں سرگرم رہے۔ اہلِ دنیا کو اپنی ذات سے نفع پہنچائے مگر خود ان کو مقصودِ حیات نہ بنائے۔ اسی نکتہ کو دوسرے مصرع میں یوں ادا کیا ہے:۔

در میانِ رنگ، پاک از رنگ باش

رنگ کنایہ ہے دنیا سے یعنی دنیا میں رہو مگر دنیا سے تعلق (محبت) مت رکھو۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اس شعر میں تصوف کا خلاصہ یا اس کی روح نظم کر دی ہے۔ تصوف کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان باہمہ ہونے کے باوجود بے ہمہ ہو کر زندگی بسر کرے، لیکن جب تک ایک شخص مسلک تصوف اختیار نہ کرے اس میں یہ صفت کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی۔

مثلاً سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الہٰی دہلویؒ کی مبارک زندگی کا مطالعہ کرو۔ حضرت کے دسترخوان پر روزانہ کئی ہزار آدمی کھانا کھاتے تھے۔ ہر وقت سا جمعہ کا میلہ لگا رہتا تھا لیکن آنجناب، مال و دولت کی اس قدر فراوانی کے باوجود، نانِ جویں پر اکتفا فرماتے تھے اور کسی شخص سے کسی بات کے طالب نہیں تھے یعنی حقیقی معنی میں باہمہ اور بے ہمہ کا مصداق تھے۔ اقبالؔ نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:۔

زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است

اے کہ در قافلہ ہے بے ہمہ شو با ہمہ رو

بے ہمہ ہونا کیا ہے؟ انسانوں کو حاجت روا نہ سمجھنا اس لئے کسی انسان سے دل نہ لگانا، کسی سے کوئی توقع نہ رکھنا۔

با ہمہ ہونا کیا ہے؟ انسانوں کو فائدہ پہنچانا۔ اُن کے دُکھ درد میں شریک ہونا

یہ صفت کہ انسان دنیا میں رہے مگر اس سے دل نہ لگائے۔ صرف صحبت مرشد سے پیدا ہو سکتی ہے۔ دین کی تعلیم بھی یہی ہے اور دین بقول اکبرؔ بزرگوں کی نظر سے پیدا ہوتا ہے:۔

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا

دیں ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اقبالؔ بھی یہی کہتے ہیں:۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر

علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

وائے افسوس کہ اس زمانہ کے مدعیانِ اصلاح قوم مسلمانوں کو بزرگوں کی نظر سے استفادہ کی تلقین کی بجائے اپنا "لٹریچر" پڑھنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ لٹریچر کے مطالعہ سے علم تو بیشک آسکتا ہے مگر تزکیۂ نفس یعنی شانِ بے ہمگی و باہمگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

دین کی روح سے آگاہ کرنے کے بعد مرشد رومیؒ یہ کہتے ہیں کہ مومن کی شناخت یہ ہے کہ وہ با ہمہ اور بے ہمہ ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ کے لوگ روحانیت اور مسلک عشق (رمز جاں) سے آگاہ نہیں ہیں۔ ان کا دین حُبّ اللہ نہیں ہے بلکہ حُبِّ غیر اللہ ہے یعنی چونکہ وہ دین کی روح سے آگاہ نہیں ہیں اس لئے انہوں نے اللہ کے بجائے غیر اللہ کو اپنا مقصود بنا لیا ہے۔ اس زمانہ کے لوگ چونکہ مسلکِ عشق کے بجائے عقل (فلسفہ) کے پیرو

ہیں جس لیئے ان کا مطمح نظر، دنیا (آب و گل) ہے۔ چونکہ انہوں نے دل کی قندیل سے اپنی آنکھوں کو منور نہیں کیا اس لیئے انہیں ہر طرف مظاہر کائنات (کبود و سرخ و زرد) ہی نظر آتے ہیں۔ ان مظاہر کے پس پشت جو حقیقت کارفرما ہے اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

واضح ہو کہ عقل کی بدولت ہمیں مظاہر PHENOMENA کا علم حاصل ہو سکتا ہے، حقیقت NOUMENA کا علم عقل کی دسترس سے بالاتر ہے۔ کانٹ نے اسی نکتہ کو اپنی کتاب "تنقید عقل خالص" میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ حقیقت کا علم (عرفان) عشق کی مدد سے ہو سکتا ہے۔ اسی لیے رومیؒ اور اقبالؒ نے ہمیں اس زمانہ میں ۔۔۔ اس دورِ مادیت میں عشق کا پیغام دیا ہے۔ اسی لیئے اقبالؒ کہتے ہیں :-

اے خوشا آں مرد کہ دل با کس نداد
بند غیر اللہ را از پا کشاد

یعنی اقبالؒ کی رائے میں خوش نصیب وہ ہے جو دنیا (غیر اللہ) کی محبت اپنے دل سے نکال دے اور اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود، مطلوب اور مقصود بنائے

واضح ہو کہ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے کہ انسان، دنیا میں زندگی بسر کرنے کے باوجود دنیا سے دل نہ لگائے بلکہ اس کے بجائے اللہ سے لو لگائے

اس اعتبار سے اگر دنیا کے مذاہب پر نظر کی جائے تو تمام مذاہب کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں:-

قسم اول:- وہ مذاہب جو دنیا کو مقصودِ حیات بنانے کی تلقین کرتے ہیں مثلاً مادیت، چارواک مت، سانکھیہ درشن، لاادریت، عقلیت، سیکولرازم پازیٹو ازم، اپی کیورین ازم، نیچرل ازم اور اشتراکیت۔ ذیل میں ان مذاہب کی

نہایت مختصر طور پر تشریح کی جاتی ہے۔

(۱) مادیت (MATERIALISM) اس مسلک کا بانی حکیم دیمقراطیس یونانی ہے جو چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ مادہ ازلی اور ابدی ہے۔ یہ کائنات سالمات مادی کے امتزاج باہمی کا نتیجہ ہے نہ خدا ہے نہ روح، اور نہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کی رو سے انسان کا مقصودِ حیات اس دنیا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا

(۲) چارواک مت۔ جو تعلیم دیمقراطیس نے یونان میں دی تھی، وہی تعلیم چارواک نے غالباً اسی زمانہ میں ہندوستان میں دی۔ وہ کہتا ہے کہ مادہ ازلی اور ابدی ہے۔ اور اس میں تفکر کی طاقت بھی موجود ہے۔ موت زندگی کے خاتمہ کا نام ہے۔ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے اس لئے دولت اور لذت کوشی مقصدِ حیات ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھو تاریخ فلسفہ ہند صت۲۷۸ تا صت۲۸۲ مولفہ ڈاکٹر سر رادھا کرشنن)

(۳) سانکھیہ درشن۔ اس مدرسۂ فکر (درشن) کا بانی کپل ہے۔ چونکہ ہندوؤں نے فن تاریخ کی طرف مطلق توجہ نہیں کی اس لئے اس کا زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا قیاس یہ ہے کہ وہ گوتم بدھ سے پہلے گزرا ہے۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ روح اور مادہ (پرش اور پرکرتی) دونوں ازلی اور ابدی ہیں۔ ان کے تعامل سے یہ دنیا بنی ہے۔ خدا کا وجود نہیں ہے کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے یہی دنیا انسان کا مقصودِ حیات ہے۔

(۴) اپی کیوریئنزم (EPICUREANISM) اس کا بانی ابیقورس ہے جو ۳۴۱ ق م میں بمقام ATHENS (یونان) پیدا ہوا تھا۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ لذت کوشی (PLEASURE) خیر اعلیٰ بھی ہے اور مقصدِ حیات بھی۔

(۵) لاادریت (SPEKTICISM) کا بانی (PYRRHO) ہے جو ابیقورس کا ہمعصر

بھی ہے اور وہم وطن بھی۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو کسی بات کا یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ صداقت کا حصول عقل (قوت مدرکہ) کی دسترس سے بالاتر ہے۔ اس لئے ہم نہ خدا کا اقرار کر سکتے ہیں نہ انکار۔

موجودہ زمانہ میں اس مسلک کو AGNOSTICISM کہتے ہیں اور اس پر عامل ہو کر انسان اسی دنیا کو مقصودِ حیات بنا لیتا ہے۔

(۶) عقلیت (RATIONALISM) کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل کی رو سے نہ خدا کا وجود ثابت ہو سکتا ہے اور نہ حیات بعد الموت کا یقین پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا، وحی و الہام، نبوت، حشر و نشر سب خلاف عقل باتیں ہیں اس لئے لائق ترک ہیں۔

(۷) سیکولرازم (SECULARISM) کا بانی ہولی اوک (HOLYCAKE) ہے (۱۸۱۷ء تا ۱۹۰۶ء) جس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ مملکت (ریاست)، حکومت سیاست، اخلاق اور نظام تعلیم وغیرہ کو مذہب کے اقرار و انکار سے آزاد (بے تعلق) رکھنا چاہئے۔

(۸) پازیٹیوزم (POSITIVISM) کا بانی فرانسیسی حکیم آگسٹے کامٹ تھا۔ (۱۷۹۸ء تا ۱۸۵۷ء) جس نے خدا کے بجائے انسانیت کو بنی آدم کا معبود قرار دیا۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ یقینی (POSITIVE) علم صرف حواس کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے چونکہ خدا اور روح دونوں ہمارے علم کی دسترس سے باہر ہیں، اس لئے ہمیں ان کے وجود کا یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۹) نیچرلزم (مذہب فطرت) مادیت کا دوسرا نام ہے۔

(۱۰) اشتراکیت۔ اس مسلک کا اصلی بانی حکیم مزدک ایرانی تھا مگر موجودہ زمانہ میں کارل مارکس نے مزدکیت کو فلسفۂ مادیت پر مبنی کر کے اشتراکیت کے نام سے پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

رنگ و بو از تن نگیر و جان پاک
جز بہ تن کارے ندارد اشتراک (جاوید نامہ)

چونکہ یہ تمام مذاہب، دہریت یا (ATHEISM) یا انکار خدا کی مختلف شکلیں ہیں اس لئے ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ دنیا (موجودہ مادی زندگی) ہی انسان کا مقصود ہے۔

یا بہ انجیش کوش کہ عالم دیگر است ؎

قسم دوم:۔ دوسری قسم میں وہ مذاہب شامل ہیں جنہوں نے ترکِ دنیا (تیاگ) کی تعلیم دی ہے۔ یعنی یہ مذاہب پہلی قسم کے مذاہب کی ضد ہیں مثلاً ہندو دہرم، جین دہرم، بودھ دہرم، ناسٹی سزم (GNOSTICISM) اسے نزم (ESSENISM) نیوپلیٹانزم (NEOPLATONISM) اور مسیحیت۔

(۱) ہندو دہرم اور جین دہرم کی تعلیم یہ ہے کہ روح انسانی، مادہ (جسم) کی قید میں گرفتار ہے اس سے مکتی (نجات) کی صورت یہ ہے کہ دنیا سے قطع تعلق کیا جائے۔

(ب) بودھ دہرم کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی دُکھ ہے اور دُکھ سے نجات کی صورت یہ ہے کہ ترکِ دنیا کو دستورِ حیات بنایا جائے۔

(ج) ناسٹی سزم -NOSTICISM کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ مادہ ناپاک یا منبع شر (EVIL) ہے اس سے قطع تعلق کئے بغیر روحانی ترقی ناممکن ہے۔ اس لئے راہبانہ زندگی اختیار کرنی چاہیئے۔

(د) اسے نزم (ESSENISM) کی تعلیم بھی یہی ہے۔

(ہ) نیوپلیٹانزم (NEOPLATONISM) نے بھی راہبانیت کی تعلیم دی۔

(و) مسیحیت چونکہ مذاہب مذکورہ بالا سے متاثر ہوئی اس لئے اس نے بھی

رہبانیت (ترک دنیا) کو بہترین طرزِ حیات قرار دیا۔

قسم سوم:- اسلام دنیا کا پہلا اور آخری دین ہے جس نے ان تمام مذاہب کی تنقید و تردید کی اور یہ تعلیم دی کہ نہ تو مادہ ناپاک یا منبع شر ہے، نہ دنیا جیلخانہ ہے، نہ زندگی دکھ ہے بلکہ زندگی اچھی چیز ہے اس لئے دنیا میں جو اسے مسخر کرو، اس میں خدا کا قانون جاری کرو، خدا کی نعمتوں سے استفادہ کرو مگر اس دنیا سے دل مت لگاؤ، اسے مقصودِ حیات مت بناؤ۔ اسی لئے حضورِ انور صلعم کا ارشاد ہے:-

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ

دوسرا بند اس کے بعد رومی نے اقبال کو یہ نصیحت کی ہے:-

دنیا پرست لوگ مسلکِ عشق (سرِّ شیریں) کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں ہو سکتے، جس طرح گائے بیل وغیرہ، شیر کی زندگی کے رموز کو نہیں سمجھ سکتے۔ حق مشہور ہے ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔

اس لئے تم اپنا پیغامِ عشق صرف ان لوگوں کو سناؤ جو اس کے اہل ہوں "ناقصوں کے آگے رونا اپنے نین کھونا ہے"

کم ظرف اور پست ہمت آدمی (مرتبہ سفلہ خواہ کتنا ہی دولتمند (بادشاہِ روم و روس) کیوں نہ ہو، صاحبِ ہمت کا ساتھ نہیں دے سکتا یعنی مسلکِ عشق پر صرف عالی ظرف اور حوصلہ مند انسان گامزن ہو سکتا ہے۔

ع یوسفِ ما را اگر گرگے برد

یوسف کنایہ ہے سرِّ شیریں یا رموزِ عاشقی سے

گرگے برد کنایہ ہے ضائع ہو جانے سے

مطلب یہ ہے کہ نااہلوں کو رموزِ عشق تلقین کرنے سے یہ بہتر ہے کہ

انہیں اپنے سینہ ہی میں مستور رکھا جائے۔
دنیا پرست لوگ، عشق (تخیل) اور عقل (قیاس) دونوں سے بیگانہ ہوتے ہیں
بھلا طالب دنیا (بوریا باف) رموزِ عشق (اطلس) کی کیا قدر کر سکتا ہے۔

ع چہ داند بوزنہ لذاتِ ادرک

ایک عجمی نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ طالبانِ دنیا کی حالت یہ ہے کہ
عاشق کا نالہ ان کے کانوں کے لئے ایسا ہی بے معنیٰ اور بے کار ہے جیسے
کافروں کے کانوں میں اذان کی آواز۔

واضح ہو کہ یہ مقولہ شعر نہیں ہے بلکہ نثر ہے جسے اقبالؔ نے شعر کی صورت
میں درج کر دیا ہے۔ مقصد اس سے محض اثر آفرینی ہے۔

تیسرا بند اس بند میں مرشد رومیؒ اقبالؔ کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ
(ا) مسلمانوں کو دین اور سیاست کے حقیقی مفہوم سے
آگاہ کرو۔

(ب) تبلیغ حق یا اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک
مبلغ کی راہ میں بڑی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ جو شخص دنیا پرستوں کو حق پرستی
کی طرف بلاتا ہے اسے ہر قدم پر مخالفت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے،
لہٰذا ایک داعی الی الحق کو "جفائے مرد ماںؔ" برداشت کرنے اور غم کھانے
کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

اسی لئے اقبالؔ نے مثنوی (دفتر سوم) سے یہ شعر نقل کیا ہے جو اس
جگہ بہت موزوں ہے۔

ؔ جب حضرت چراغ دہلی نے اپنے مرشد حضرت محبوب الٰہی سے خلوت گزینی کی اجازت
طلب کی تو انہوں نے فرمایا تمہیں جا اقامت اختیار باید کرد (جفائے مردماں باید کشید)

غم خورد ناں غم افزایاں مخور
زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر

یعنی اے اقبال! راست گوئی کی پاداش میں غم خوری کا شیوہ اختیار کر مگر دنیا پرستوں کا احسان مت لینا۔ یاد رکھ! عاشق (عاقل) ہمیشہ غم کھاتا ہے (مصائب برداشت کرتا ہے) اور دنیا پرست (کودک) عیش کرتے ہیں۔ شکر خوردن کنایہ ہے لطف اندوزی اور راحت کوشی سے۔

(ج) عاشق (وہ شخص جو پیغام حق پہنچاتا ہے) علائق دنیوی سے حتی المقدور کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ خرقہ بھی اس کی نگاہ میں "بار" ہوتا ہے۔

ع چوں صبا جز بوئے گل ساماں مگیر

یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ شعر کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ صبا کی طرح بوئے گل کے علاوہ کسی سامان (شی) کی احتیاج مت رکھو لیکن بوئے گل صبا سے جدا نہیں ہوتی۔ جز اسے مستقل سامان قرار دیا جائے یعنی صبا کے پاس کوئی سامان نہیں ہوتا، اس لئے مطلب اس مصرع کا یہ ہے کہ سالک کو بھی مادیات (سامان) سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

(د) قلزمی؟ با دشت و در بیہم ستیز
شبنمی؟ خود را بہ گلبرگے بریز

اس شعر میں قلزم کنایہ ہے قوت و عظمت سے اور شبنم کنایہ ہے ضعف و ناتوانائی سے۔ واضح ہو کہ انسان کی یہی دو حالتیں ہیں یا وہ طاقتور ہوتا ہے یا کمزور۔ رومی فرماتے ہیں کہ

اگر تو طاقتور (قلزم) ہے تو باطل (کفر) کا مقابلہ کر۔
اگر تو کمزور (شبنم) ہے تو دوسروں کی خدمت کر (ان کو نفع پہنچا)۔

سمندر صاحب قوت ہے اس لئے دشت و دریہ پر برسر پیکار رہتا ہے۔
اسی طرح تو اگر صاحب قوت ہے تو باطل کے خلاف صف آرائی کر۔
شبنم ضعیف ہے طاقت پیکار نہیں رکھتی مگر غنچوں کو نفع پہنچاتی ہے۔
اسی طرح اگر تو ضعیف ہے تو بنی آدم کو راحت پہنچانے کی کوشش کر۔
یہ سچ ہے کہ کمزور آدمی جنگ نہیں کر سکتا مگر دوسروں کی خدمت ضرور کر سکتا ہے۔

چوتھا بند | اس بند میں اقبال نے رومیؒ کی زبان سے مومن کی حقیقت واضح کی ہے۔

مہرِ حق سے مراد ہے حق تعالیٰ کی صفت جود و کرم جس کے اظہار کے لئے اس نے یہ کائنات پیدا کی ہے۔

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

یہ نکتہ کہ حق تعالیٰ سراپا جود و کرم ہے مردِ حق (مومن) سے پوشیدہ نہیں ہے یعنی مومن جانتا ہے کہ میرا مقصدِ حیات، خدمتِ خلق ہے۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

روحِ مومن کو سمجھنا چاہیئے ہو تو قطرۂ شبنم پر غور کرو۔
(ا) اس میں ذوقِ نمود کارفرما ہوتا ہے۔
(ب) وہ اپنے حصولِ مقصد کے لئے دوسروں کا دست نگر نہیں ہوتا۔
(ج) وہ اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت خود اپنی بصیرت کی تکمیل کرتا ہے۔
(د) تکمیل کے بعد خلوتِ افلاک سے باہر نکلتا ہے۔

(۵) اپنے آپ کو بارش کے قطرے کی طرح صدف میں پنہاں نہیں کرتا۔
(۶) بلکہ وقتِ سحر کا منتظر رہتا ہے۔
(۷) اور عین وقت پر غنچۂ نورسیدہ کو شگفتہ کر دیتا ہے۔
(۸) گویا اس طرح اپنا مقصدِ تخلیق حاصل کر لیتا ہے۔

بس یہی حال مومن کا ہے:۔
(ا) وہ بھی اپنی "خودی" کا اثبات اور اظہار کرنا چاہتا ہے۔

شعر زیستن این گونہ تقدیر خودی است

(ب) وہ بھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔

خود فرود آ از شتر مثل عمرؓ
الحذر از منتِ غیر، الحذر

(ج) وہ بھی ذاتی جد و جہد (مجاہدہ) سے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچاتا ہے۔
(د) بعد ازیں خانقاہ سے باہر نکلتا ہے۔
(ہ) حجرہ نشینی اور خلوت گزینی کے بجائے خدمتِ خلق کو مقصدِ حیات بناتا ہے۔
(و) حالات اور ماحول کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالتا ہے
(ز) بنی آدم کے قلوب میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔
(ح) اور اس طرح اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔

خلاصۂ کلام اینکہ مومن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کی بہبود کے لئے زندہ رہتا ہے یہی مومن کی شناخت ہے اور یہی اس کا فرضِ منصبی ہے۔ اگر مثال درکار ہو تو بزرگانِ دین، علی الخصوص حضرات خواجگانِ چشت کی مبارک زندگیوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔ یہ شرح تمام بزرگوں کے حالات کی تو

متحمل نہیں ہو سکتی، اس لئے ناظرین کی آگاہی کے لئے اس سلسلہ کے صرف
ایک بزرگ یعنی شیخ العرب والعجم حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب
مہاجر مکی رح کا اسم گرامی ہی کافی ہے جن کے دامن تربیت سے فیض حاصل
کر کے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی،
مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رح، اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح
نے ہزاروں انسانوں کو خادمانِ اسلام بنا دیا۔ آج ہندوستان اور پاکستان
میں ان حضرات کے ہزاروں خلفاء دین اسلام کی خدمت میں سرگرم ہیں اور یہ
سب اسی مرد مومن کا روحانی فیض ہے جسے دنیا شیخ العرب والعجم کے
لقب سے پکارتی ہے۔ کثّر اللہ تعالیٰ امثالہٗ۔

فصل سوم

خطاب بہ مہر عالمتاب

تمہید اس فصل میں اقبال نے خلافِ معمول آفتاب سے خطاب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوام مشرق، آفتاب کو زندگی کا سرچشمہ خیال کرتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان اور ایران میں تو یہ خیال پرستش کی حد تک پہنچ گیا۔ چونکہ اقبال نے بھی اس مثنوی میں ان اقوام کو حیات تازہ کا پیغام دیا ہے اس لئے شاعرانہ انداز میں آفتاب کو مخاطب بنایا ہے۔

پہلے سات شعروں میں آفتاب کی فیض رسانی کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر پانچ شعروں میں اُس سے خطاب کیا ہے اور اس کی وجہ بیان کی ہے:۔

ع تا بروں آرم شب افکارِ شرق

اس کے بعد طالبانِ حق کو اس نکتہ سے آگاہ کیا ہے کہ

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس

حریت از عفت فکر است و بس

آخری پانچ شعروں میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ تطہیر فکر کے بغیر کوئی قوم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ اب ہم اس فصل کی شرح کرتے ہیں:۔

اشعار ۱ تا ۷ کہتے ہیں کہ اے آفتاب! تیرے فیض سے ہر ذرہ منور ہو جاتا ہے۔ کائنات میں تیری ہی بدولت زندگی کا رنگ، سوز و سرور پایا جاتا ہے۔ ہر پوشیدہ چیز تیرے ہی دم سے ظاہر ہوتی ہے۔ اگر تیری شعاعیں اثر انداز نہ ہوں تو بطن زمین سے کوئی شے نمودار نہیں ہو سکتی۔ تیری زریں گیتی (جرم آفتاب مراد ہے) اس فضائے منور (جو بسبب تیرے ہے) میں دست کلیم (ید بیضا) سے بھی زیادہ تابناک نظر آتی ہے۔

چاند میں تیرے پرتو ہی سے نور آتا ہے اور تیری شعاعیں لعل و یاقوت کو (جو پہاڑوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں) آب و رنگ عطا کرتی ہیں۔ لالہ و نرگس میں جس قدر دلکشی ہے یہ سب تیرا ہی فیضان ہے۔ میں تجھے خوش آمدید کہتا ہوں اور صدق دل سے تیرا خیر مقدم کرتا ہوں!

اشعار ۸ تا ۱۲ تو سراپا نور (فروغ صبح) ہے اور تیرے سامنے میں تیرہ خاک (پایان روز) ہوں۔ (پایان روز کنایہ ہے تاریکی شام سے)۔ میں تجھ سے ملتجی ہوں کہ میرے دل کو بھی منور کر دے بلکہ میرے وجود کو سراپا نور کر دے اور مجھے اپنی تجلیات میں مستور کر دے تاکہ میں اپنے کلام سے اقوام مشرق کے غلط (تاریک) عقائد و افکار کو صحیح افکار میں تبدیل کر سکوں یعنی ان کے خیالات باطلہ کی اصلاح کر سکوں اور احرار کے سینہ کو منور کر دوں۔ (شب کنایہ ہے تاریکی سے اور تاریکی کنایہ ہے غلط افکار سے)۔ نیز اپنے کلام سے خام طبع (ناقص العقل) افراد کو دانشمند (پختہ) بنا دوں، اور دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ

فکر شرق آزاد گردد از فرنگ

اقوام مشرق، فرنگ کے افکار و مقاصد سے متاثر ہو گئی ہیں۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ان کے افکار کی قید سے آزاد ہو جائیں تاکہ ان کی غلامی سے نکلنے کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اقوام مشرق میرے پیغام (سرود) پر عمل پیرا ہو جائیں کیونکہ ان کی نجات، فرنگ کی اتباع میں نہیں ہے بلکہ میرے پیغام پر عمل کرنے میں ہے۔

اس لئے اقبال ہم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:-

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس

حریت از عفت فکر است و بس

اس شعر میں اقبال نے اپنے پیغام کی روح پیش کر دی ہے اور بلا مبالغہ یہ شعر اس مثنوی کے ان اشعار میں سے ہے جن کی بدولت اس چھوٹی سی کتاب کو اقبال کی تمام تصانیف میں ایک خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔

اس شعر کے دو مصرعوں میں انہوں نے دو بنیادی صداقتوں کو واضح کیا ہے

پہلی یہ کہ زندگی، گرمیٔ ذکر پر موقوف ہے۔

دوسری یہ کہ حریت، عفت فکر پر منحصر ہے۔

پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ

یہاں زندگی سے حیوانوں کی زندگی مراد نہیں ہے بلکہ حقیقی زندگی مراد ہے یعنی دنیا میں عزت اور اقتدار کی زندگی بسر کرنا اور یہ بات حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں زندہ قوم وہ ہے جو دوسروں کی غلام نہ ہو۔

ذکر سے اقبال کی مراد ہے عمل یا جدوجہد اور یہ بات عشق کے بغیر ممکن نہیں جب تک کسی قوم کو کسی نصب العین (IDEAL) سے عشق نہ ہو وہ اس کے حصول کے لئے جدوجہد نہیں کر سکتی۔ مصرع کا مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو!

اگر وہ دنیا میں حکمرانی کے آرزومند ہو تو مسلکِ عشق اختیار کرو جس طرح حیوانی اعتبار سے زندہ رہنے کے لئے خون کی گرمی شرطِ اولیں ہے اسی طرح باعزت زندگی عشق کی گرمی پر موقوف ہے۔

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ

حریت سے مراد محض سیاسی حریت نہیں ہے بلکہ یہاں اس لفظ سے حقیقی آزادی مراد ہے اور اس کا سرچشمہ حریت فکر و ضمیر ہے۔ یعنی حقیقی معنی میں صرف وہ قوم آزاد ہے جو ذہنی، عقلی اور علمی اعتبار سے آزاد ہو۔

اگر کوئی قوم سیاسی اعتبار سے تو آزاد ہو مگر ذہنی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی غلام ہو تو اقبال کی رائے میں وہ قوم دراصل آزاد نہیں ہے۔

یا اگر وہ قوم غلط عقائد میں گرفتار ہو مثلاً مشرک یا ملحد ہو تو بھی وہ حقیقی آزادی سے محروم ہے۔

اگر مثال درکار ہو تو پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی کا مطالعہ کافی ہوگا۔ ہم لوگ بظاہر آزاد ہیں مگر ذہنی اعتبار سے فرنگیوں کے غلام ہیں اور علمی اعتبار سے عقائد باطلہ میں گرفتار ہیں۔ اس لئے اقبال یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر حقیقی معنی میں حریت کے طلبگار ہو تو اپنے ذہنوں کو غلط افکار کی زنجیروں سے آزاد کرو۔ اس کے بغیر تم آزاد نہیں ہو سکتے۔

عفتِ فکر سے مراد ہے فکر کا اوہام باطلہ اور عقائدِ فاسدہ سے محفوظ (پاک) رہنا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ

عزت کی زندگی، عشق کی گرمی پر موقوف ہے۔

حقیقی آزادی، فکر کی پاکی پر منحصر ہے۔

تبصرہ | غور کیجئے! اس دنیا میں انسان اس کے علاوہ اور کیا چاہتا ہے کہ

(ا) وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ یہ بات اسی وقت ممکن ہے۔ جب وہ حکمراں ہو۔ غلام قوم کا کوئی فرد، اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا غلامی دراصل بدترین قسم کی ذلت ہے اور ذلت دراصل موت ہے۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ اگر زندگی کے طالب ہو تو مسلک عشق اختیار کرو۔ زندگی عشق سے حاصل ہوتی ہے۔

(ب) اور اسے آزادی کی نعمت نصیب ہو۔ لیکن دراصل آزاد وہ ہے جس کی فکر (عقل) آزاد ہو۔ اگر فکر (ذہن) غلام ہے تو انسان حکمران ہونے کے باوجود درحقیقت غلام ہے۔

ذکر (عشق جدوجہد) کی بدولت ایک قوم عزت اور اقتدار تو حاصل کر سکتی ہے مگر جب تک اس کی فکر کا سرچشمہ، عقائد باطلہ کی کدورتا سے پاک نہ ہو وہ حقیقی معنی میں آزادی کی نعمت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ سیاسی اعتبار سے آزاد ہو جائے گی مگر ذہنی اعتبار سے بدستور غلام رہے گی۔

اس لئے اسلام (قرآن) نے انسان کو وہ طریقہ بتایا ہے جس کی بدولت وہ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ ذہنی آزادی کی نعمت سے بھی ہمکنار ہو سکتی ہے اور وہ طریقہ اختلاطِ ذکر و فکر ہے۔

ذاکر سے سیاسی آزادی حاصل ہو سکتی ہے اور فکر سے ذہنی آزادی۔ اور آزادی کی ان دونوں قسموں کے امتزاج سے ہی انسان اپنی تخلیق کا مقصد حاصل کر سکتا ہے۔

جاوید نامہ میں اقبال نے اس نکتہ کو یوں بیان کیا ہے:۔

جز بقرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است
فقرِ قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

یعنی اگر حقیقی معنی میں حریت (حکومت) کے طالب ہو تو ذکر اور فکر دونوں کو اپنی ذات میں جمع کرو اور ان کے امتزاج کا دوسرا نام "فقر" ہے یعنی اپنے اندر شان فقر پیدا کرو۔

قرآن کی رو سے آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی قوم سیاسی اعتبار سے آزاد ہو جائے بلکہ اس کا ذہن بھی غلط عقائد کی غلامی سے آزاد ہو یعنی جسم اور روح دونوں آزاد ہوں۔

قرآن، انسان کی روح اور اس کے جسم دونوں کو آزادی عطا کرتا ہے اور یہ نعمت قرآن کے علاوہ اور کسی نظام حیات یا مدرسۂ فکر یا مذہب سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے تو اقبال نے یہ کہا:

جز بقرآن ضیغمی روباہی است

یعنی حکومت (ضیغمی) کی ہر وہ قسم جس کا منبع قرآن نہ ہو در اصل روباہی (عیاری) ہے (حقیقی حکومت جس میں حکمران قوم کا جسم اور روح دونوں آزاد ہوں)۔ صرف قرآن حکیم کے پیش کردہ پروگرام پر عامل ہو کر نصیب ہو سکتی ہے۔

قرآن حکیم فرماتا ہے کہ آزادی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ایک قوم محض سیاسی اعتبار سے آزاد ہو جائے۔ حقیقی آزادی یہ ہے کہ وہ قوم غیر اللہ کی غلامی سے بھی آزاد ہو۔

یوں کہنے کو امریکہ اور روس دونوں آزاد ہیں لیکن قرآن کے نقطۂ نگاہ سے دونوں شدید ترین قسم کی غلامی میں مبتلا ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی فکر کا سرچشمہ سراپا عقل اور کثافت ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی اعتبار سے آزاد ہونے کے باوجود یہ دونوں قومیں سیم و زر کی غلام ہیں بلکہ ہوا و ہوس کی غلام ہیں۔ اگر یہ قومیں قرآنی نقطۂ نگاہ سے آزاد ہوتیں۔ اگر ان کو حقیقی حریت حاصل

ہوتی تو ان کے افراد ضرور مطمئن ہوتے، انہیں یقینی طور پر اطمینانِ قلب حاصل ہوتا، مگر ان کی ساری زندگی شاہد ہے کہ وہ اطمینانِ قلب سے قطعاً محروم ہیں۔ ان کی پوری زندگی، ڈپلومیسی کے محور پر گردش کر رہی ہے اور ڈپلومیسی دراصل عیاری، مکاری، دروغ بافی، فریب کاری، دغابازی اور بے ایمانی کا دوسرا نام ہے اور ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ جس قوم کی زندگی ان صفاتِ ذمیمہ اور اخلاقِ رذیلہ پر مبنی ہو اس قوم کو کبھی اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔

آخری بات یہ ہے کہ جب تک عفتِ فکر حاصل نہ ہو، انسان غیر اللہ کی غلامی سے نہیں نکل سکتا اور عفتِ فکر اس وقت اور صرف اس وقت نصیب ہو سکتی ہے جب انسان حقیقی معنیٰ میں موحّد بن جائے۔

تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

نوٹ: میں نے اس شعر کی تشریح میں، ذکر اور فکر کی وضاحت اس لئے نہیں کی کہ اس کا موقع فقر کی شرح میں آنے والا ہے۔

اب میں اس فصل کے آخری پانچ شعروں کا مطلب ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں کہتے ہیں کہ جب کسی قوم کے افکار و خیالات غلط (خراب) ہو جاتے ہیں تو کھری چاندی بھی اس کے ہاتھ میں آکر کھوٹی ہو جاتی ہے یعنی وہ دنیا کی کسی اچھی یا مفید بات سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتی۔

مثلاً اگر اس قوم کے پاس دولت ہے تو وہ اسے مفید کاموں میں خرچ

کرنے کے بجائے عیاشی، بدکاری اور عیش و عشرت میں خرچ کرے گی۔

اگر اس کے پاس طاقت ہے تو وہ اس کو دشمنوں کے مقابلہ میں استعمال کرنے کے بجائے اپنوں (بھائیوں) ہی کے خلاف استعمال کرے گی۔ اگر تفصیل کا شوق ہو تو مسلمانانِ پاکستان کی زندگی کا مطالعہ کافی ہوگا۔

اُس قوم کا دل مُردہ ہو جاتا ہے یعنی وہ قوم روحانیت، پاکیزگی، تقوٰی اور طہارت سے بیگانہ ہو جاتی ہے اور اس کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ اچھائی کو بُرائی اور بُرائی کو اچھائی یقین کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ مسلمان، اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں روپیہ خرچ نہیں کرتے لیکن ہر بُرے کام کے لئے دل و جان سے روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کے ملکوں میں، شراب خانے بھی ہیں۔ کلب بھی، ہوٹل بھی ہیں، رقص گاہیں بھی... لیکن اگر نہیں ہے تو تبلیغ و اشاعت اسلام کا نظام۔

کبھی کسی نے سُنا کہ ترکی، مصر، مراقش، طرابلس، شام، فلسطین، عراق، افغانستان، ترکستان، پاکستان یا سعودی عرب سے مبلغین اسلام کی کوئی جماعت یورپ یا امریکہ گئی ہو؟

کیا ان ممالک میں سے کسی ایک ملک میں بھی حکومت یا عوام نے تبلیغ اسلام کا کوئی ادارہ قائم کیا ہے؟

کیا ان "اسلامی" ملکوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے کوئی قدم اٹھایا ہے؟

کیا ان ملکوں کے مسلمانوں نے غیر مسلموں کو قرآن حکیم کے پیغام سے روشناس کرنے کے لئے کوئی جدوجہد کی ہے؟

عیسائیوں نے دنیا کی سات سو پچاس زبانوں میں بائبل کا ترجمہ کر دیا ہے۔

مسلمانوں نے قرآن حکیم کا ترجمہ کتنی زبانوں میں کیا؟

ہندوستان میں انگریزی حکومت کی ابتدا ۱۷۷۰ء سے ہوئی اور صرف بیس سال کے بعد اس حکومت نے بنگال میں مسیحیت کی تبلیغ کا انتظام قائم کر دیا جس کے زیرِ اہتمام پادری ولیم کیری نے ۱۷۹۴ء میں بنگلہ زبان میں بائبل کا ترجمہ شروع کر دیا اور آج ہندو پاکستان کی تمام زبانوں میں (جن کی تعداد ۲۲۵ کے قریب ہے) بائبل یا عہد جدید یا اناجیل اربعہ کے تراجم دستیاب ہو سکتے ہیں۔

برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۶۰ء سے برابر ہندوستان میں ہر سال ہر اُس شخص کو جو بی۔ اے پاس کرے، بائبل کا ایک نسخہ بلا قیمت دیا جاتا ہے۔ خود اندازہ کر لیجئے! سو سال میں کتنے نسخے اس طرح ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں کو مفت دیئے گئے ہوں گے!

۱۹۲۵ء میں عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے تھے ان کی رو سے ہندوستان میں

(۱) تبلیغی کالجوں کی تعداد ۷۰ تھی۔

ان میں سے ایک درسگاہ موسومہ "ہینری مارٹن اسکول آف اسلامک اسٹڈیز" میں صرف وہ مبلغ تیار کئے جاتے ہیں جو مسلمانوں میں مسیحیت کی تبلیغ کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں۔

(ب) دیہات میں مسیحیت کی مناد کی کرنے والے یعنی ادنیٰ درجے کے مبلغین تیار کرنے والے ادارے ۱۸۰ تھے۔

نوٹ: تبلیغی کالجوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص لئے جاتے ہیں، دو سے تین سال تک باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ ادارہ تدریب المبلغین میں معمولی لیاقت کے آدمیوں کو ایک سال ٹریننگ دی جاتی ہے۔

(ج) کمپیچن آشرم ۳۱ بھتے۔

ان آشرموں میں زیادہ تر ان لوگوں کو رکھا جاتا ہے جو عیسائیت قبول کرنے کے بعد "بے گھر" ہو جاتے ہیں۔

(ح) دارالخواتین ۳۵ بھتے۔

ان میں وہ عورتیں رہتی ہیں جو عیسائی ہو کر "بے ٹھکانے" ہو گئی ہوں۔ مثلاً وہ عورتیں جو مشن ہسپتالوں میں جسمانی امراض کے ازالہ کے لئے جاتی ہیں اور روحانی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں!

(ط) یتیم خانے ۱۲۹ بھتے۔

(ی) تبلیغی رسائل و جرائد ۳۱۱ بھتے۔

(ک) پادریوں کے لئے راحت گاہیں صحت بخش، پرفضا مقامات پر ۲۵ تھیں۔ تاکہ وہ گرمیوں کا زمانہ ان HILL STATIONS پر گزار سکیں۔

(م) دارالاطفال BABY FOLDS ۱۵ بھتے۔

ان اداروں کے علاوہ ہوسٹل، نرسنگ ہوم، وائی ایم سی اے، وائی ڈبلیو سی اے، کانورٹ ہوم، WIDOWS HOME ودونہ ہوم آپاہج خانے دارالمبروص، تبلیغی ہسپتال MISSION HOSPITALS جو تبلیغ کے بہت مؤثر مرکز ہیں۔ ریڈنگ روم، اسٹڈی سینٹر، صنعتی ادارے اور چھاپے خانے تمام بڑے شہروں میں قائم ہیں، اور اسکولوں اور کالجوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ نیز یہ واضح رہے کہ یہ صرف پراٹسٹنٹ فرقہ کے عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کا ایک ناقص جائزہ ہے۔ رومن کیتھولک عیسائیوں کی تبلیغی جدوجہد کا دائرہ اوّل الذکر سے بہت وسیع ہے

اب ذرا مسلمانوں کی غفلت شعاری کا مرثیہ پڑھ لیجئے:۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا آغاز ۱۱۹۴ء سے ہوا اور ۱۲۰۶ء سے ان کی حکومت پنجاب، دلی، آگرہ، اجمیر، دوآبہ اور وسط ہند میں باضابطہ قائم ہو گئی (اگر وارن ہیسٹنگز پہلا گورنر جنرل تھا تو قطب الدین ایبک پہلا خود مختار مطلق العنان بادشاہ تھا۔)

اور ۱۸۰۳ء تک قائم رہی۔ گویا قدرت نے کم و بیش چھ سو سال تک اس بدنصیب کوتاہ اندیش اور عیش پسند قوم کو غیر مسلموں پر حکمرانی کا موقع دیا مگر اس قوم نے اس طویل مدت میں تبلیغ اسلام کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔

سلطان فیروز تغلق، سلطان سکندر لودی، سلطان سکندر بت شکن، سلطان محمود بیگڑہ، سلطان عالمگیر اور سلطان ٹیپو شہید کے علاوہ اور کسی بادشاہ نے تبلیغ اسلام کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔

چھ سو سال تک دلی اور آگرہ میں مسلمانوں کی مرکزی حکومت قائم رہی۔ غلام خلجی، تغلق، سید، لودی اور مغل خاندانوں نے مسلسل حکومت کی۔ اس کے علاوہ پنجاب، کشمیر، سندھ، گجرات، مالوہ، خاندیش گولکنڈہ، بیجاپور، بیدر، احمد نگر، بنگال، جونپور اور اودھ میں مختلف زمانوں میں مستقل حکومتیں قائم ہوئیں، مگر کسی حکومت کو تبلیغ اسلام کی توفیق نہ ہوئی۔

اس سے ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ تمام سلاطین ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے یا خونریزیوں ہی میں مصروف رہے۔ بقول اقبال

در نگاہِ او کج آید مستقیم

ہر بری بات انہیں اچھی نظر آتی رہی اور وہ اس کی سرپرستی کرتے رہے چنانچہ اُن کے محلات، اُن کے دربار اور اُن کے مراکز حکومت ہر قسم کی برائیوں کے مربی اور سرپرست بلکہ منبع اور معدن بن گئے تھے۔

سلطان حسین شرقی والیٔ جونپور رقص و سرود کا سب سے بڑا مربی تھا۔ اور اُس نے گانے میں اس درجہ کمال حاصل کیا تھا کہ ایک نئی راگنی ایجاد کی جسے جونپوری کی ٹوڑی۔ کہتے ہیں۔

باز بہادر، مالوہ کا آخری بادشاہ، موسیقی کا بہت بڑا قدردان تھا اور خود بھی اس فن شریف میں کمال رکھتا تھا۔ اس کی محبوبہ رانی روپ متی بھی رقص و سرود میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔

یہی حال قطب شاہ کا تھا۔ اس کی محبوبہ بھاگ متی مالوہ کی روپ متی کا جواب با صواب تھی!

واجد علی شاہ کے ذوق رقص و سرود کا تو ذکر ہی فضول ہے۔

غیاث الدین سلطان مالوہ نے اپنے محل میں صرف پندرہ ہزار عورتیں جمع کی تھیں۔ خلاصۂ کلام اکثر سلاطین ہند نے اپنی توجہ زیادہ تر عورت، شراب اور موسیقی پر مبذول کی۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد حکومت میں عیاشی اور لذت کوشی کا یہ رنگ اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گیا۔

۱۷۵۳ء سے قدرت نے مسلمانوں سے ان کی مجرمانہ غفلت کا انتقام لینا شروع کیا۔ پہلے مرہٹوں نے آفت مچائی، پھر سکھوں نے اینٹ سے اینٹ بجائی رہی سہی کسر انگریزوں نے پوری کر دی۔

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دلی فتح کر کے محمد شاہ رنگیلے کے اندھے پوتے شاہ عالم ثانی کو انگریزوں کا نمک خوار بنا دیا اور ۱۸۵۷ء میں شاہان بے تخت و تاج کا یہ سلسلہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

حیف ہے وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

ہندوستان کے مسلمان بادشاہ غیر مسلموں کو تو کیا مسلمان بناتے۔ انہوں نے خود مسلمانوں کو اسلام سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔

شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ (وفات بعہد اکبر مرزند) کے زمانہ سے پہلے سارے ہندوستان میں حدیث کا درس ناپید تھا۔ قرآن سے واقف ہونا تو بڑی بات ہے، کوئی مسلمان حدیث سے بھی آگاہ نہ تھا۔ وہ صرف فقہ پڑھ کر عالم دین بن جاتے تھے!

شاہ ولی اللہ مجدد دہلویؒ (وفات ۱۱۷۶ھ کے زمانہ سے پہلے سارے ہندوستان میں قرآن عظیم کا کوئی ترجمہ دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ ہندی میں تو ترجمہ کیا ہوتا۔ مسلمانوں نے فارسی میں یا بھاشا میں ترجمہ کی ضرورت بھی محسوس نہ کی چونکہ اندیشۂ قوم خراب ہو چکا تھا، اس لئے اس کی نگاہ میں قرآن سمجھنے یا تدبر کرنے کی کتاب ہی نہ تھی۔ بلکہ اس سے حسب ذیل کام لئے جاتے تھے۔

(ا) مرنے والے کے سرہانے بیٹھ کر ایک خاص سورت اُسے سُنادی جاتی تھی۔[1]

(ب) یا حصولِ ثواب کے لئے بغیر سمجھے اس کی تلاوت کی جاتی تھی۔

(ج) یا اس کی بعض آیات دفعِ امراض کے لئے زعفران میں گھول کر پی جاتی تھیں۔

اب ناظرین خود فیصلہ کریں کہ ان کاموں کے لئے ترجمہ کی کیا ضرورت ہے چونکہ یہ مرثیہ کوشش اختصار کے باوجود کافی طویل ہو گیا ہے اس لئے صرف ایک "رقت کا بند" سُنا کر اسے ختم کئے دیتا ہوں۔

---

[1] بہ بندِ صوفی و ملا اسیری — حیات از حکمت قرآن نگیری
بآیاتش ترا کارے جز این نیست — کہ از یٰسین او، آساں بمیری

ہندوستان میں جس قدر تبلیغ ہوئی یہ سب صوفیائے کرام علی الخصوص حضرات خواجگان چشت کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگر مسلمان بادشاہ بھی اُن کے نقش قدم پر چلتے یا کم از کم تبلیغ اسلام کا باقاعدہ اور باضابطہ محکمہ ہی قائم کر دیتے تو چھ سو سال میں سارے ہندو مسلمان ہو جاتے اور آج ۱۹۵۷ء میں سارا ہندوستان کوہ ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک پاکستان ہوتا!

بازآ ادم بہر سرِ شرح! اقبال کہتے ہیں کہ جب کسی قوم کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ کجی (عیب یا بُرائی) کو راستی (خوبی یا اچھائی) سمجھنے لگتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

چشم او اندر سکوں بیند حیات

یعنی حیات تو در اصل جد و جہد (حرکت) کا نام ہے مگر وہ اپنی حماقت کی وجہ سے بے عملی (سکون) کو مدارِ حیات یقین کر لیتی ہے۔ اسی لئے وہ میدان جنگ میں جانے سے جی چراتی ہے اور موت سے ڈرنے لگتی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ جاٹوں، مرہٹوں، اور سکھوں نے دلّی اور اس کے گرد و نواح میں قیامت صغریٰ برپا کر رکھی تھی ان کا خون، پانی سے بھی ارزاں ہو گیا تھا۔ آگرہ، دہلی، سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ علی گڑھ، کرنال، پانی پت، سرہند، لاہور، قصور اور ملتان تمام بڑے بڑے شہروں میں مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔ آگرہ میں جاٹ گردی، دلی میں مرہٹہ گردی اور باقی شہروں میں سکھ گردی کے ہولناک مناظر سے تاریخوں کے صفحات بھرے پڑے ہیں جن کی تفصیل بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں مگر یہی وہ زمانہ ہے جب سکھ سرداروں لاہور، قصور اور ملتان کی مسجدوں کو سور کے

خون سے رنگین کر رہے تھے لیکن مسلمان "حرب و ضرب کائنات" سے "بر کراں" ہو کر موسیقی اور شاعری کی محفلیں سجا رہے تھے اور واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے آسمان سر پر اُٹھا رہے تھے! سکھ اور مرہٹے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ کر رہے تھے مگر مسلمان شعرا نخلِ شاعری کی آبیاری کر رہے تھے اور مسلمان موسیقاری نئی راگنیاں ایجاد کر رہے تھے۔ ہماری تاریخ اس تلخ صداقت پر شاہد ہے کہ بہترین شعرا اور بہترین موسیقی دان اسی خون آشام صدی میں پیدا ہوئے۔

ہندی موسیقی کی وہ دلکش طرز جسے "خیال" کہتے ہیں اسی زمانہ میں ایجاد ہوئی شاہ سدارنگ، شاہ ادارنگ، بلاس خاں (جس نے بلاس خانی ٹوڈی ایجاد کی) بہادر خاں (جس نے بہادری ٹوڈی مرتب کی) پیار خاں (جس نے آڑی کانی کی گت باندھی) اور دوسرے نامور کلاونت اسی پُر آشوب عہد میں پیدا ہوئے۔ تنت کاروں کے نام بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

شعرا میں میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ، قائم چاندپوری وغیرہ یہ سب حضرات اسی منحوس صدی میں پیدا ہوئے تھے۔

ہم سدارنگ اور سوداؔ کو معاف کر سکتے ہیں کہ ان کا پیشہ ہی موسیقی اور شاعری تھا لیکن بدبخت شاہ عالم ثانی کی داڑھی نُطفِ سزاوار صد نکوہش و لعنت ہے کہ مرہٹوں کی غلامی سے نکلنے کی کوشش کے بجائے اس نے اپنی فرصت کے اوقات اُن گالیوں کو نظم کرنے میں صرف کیے جن کو عرف عام میں "سیٹھنے" کہتے ہیں اور اس زمانہ میں شادی کے موقعوں پر، ڈومنیاں گا گا کر سمدھی اور سمدھن کو سنایا کرتی تھیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس شرح کے صفحات کو فحاشی کے ان نادر الوجود

نمونوں سے ملوث نہیں کرسکتا۔ یہ بات بھی دل پر جبر کرکے محض اس لئے لکھی ہے کہ ناظرین کو اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کا مذاق اس درجہ مبتذل ہو گیا تھا کہ "گالیاں" ان کی تہذیب کا جزو لاینفک بن گئی تھیں۔

اب پڑھیے اس شعر کو:-

میرِ اندر سینہ اش قلبِ سلیم
در نگاہِ او کج آید مستقیم

سچ ہے جب دل مردہ ہو جاتا ہے تو گالیاں شربت کے گھونٹ معلوم ہوتی ہیں!

میں نے شاہ عالم ثانی کو بہت سخت الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری دانست میں دلّی کے بادشاہوں میں اس سے زیادہ قابلِ نفرت کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر اس کے اندر ذرّہ بھر بھی دینی حمیّت یا سوجھ بوجھ ہوتی تو وہ افغانوں کو اپنا دست و بازو بنا کر مرہٹوں کی غلامی سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس بدبخت نے بالکل برعکس طرزِ عمل اختیار کیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:-

اس عہد میں نواب نجیب الدولہ مرحوم شمالی ہندوستان میں واحد مردِ مومن تھا جس کے دل میں اپنی قوم کا درد تھا (یہ جذبہ حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ کے فیضِ صحبت سے پیدا ہوا تھا)، وہ دیکھ رہا تھا کہ اگر مرہٹوں

---

[1] جنوبی ہندوستان میں سلطان ٹیپو شہید وہ تنہا مردِ مومن تھا جس کا دل جذبۂ ملّی سے سرشار تھا، اور اسی جذبہ نے اسے ۱۷۹۹ء میں مقامِ شہادت پر فائز کیا۔

رفت سلطان زیں سرائے ہفت روز
نوبتِ او در دکن باقی ہنوز (جاوید نامہ)

کا استیصال نہ کیا گیا تو وہ بہت جلد سارے ہندوستان کو فتح کر لیں گے۔ اس لئے اس نے احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کے استیصال پر آمادہ کیا۔ وہ جس طرح تلوار کا دھنی تھا اسی طرح سیاسی قابلیت بھی رکھتا تھا چنانچہ اسی بنا پر اس نے دشمنِ ملّت شجاع الدولہ کو مرہٹوں کے بجائے مسلمانوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔

قصہ کوتاہ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان میں مسلمان اور مرہٹے باہم صف آرا ہوئے۔ ابدالی کی قشونِ قاہرہ کے دوش بدوش نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں نے بھی اپنی مردانگی اور سپہ گری کے جوہر دکھائے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مرہٹوں کو ایسی شکست فاش نصیب ہوئی کہ اگر ابدالی قندھار واپس جانے کے بجائے تختِ دہلی پر جلوس کرتا تو ہندوستان کی تاریخ ہی بدل جاتی۔

چونکہ مشیتِ ایزدی کو یہ منظور تھا کہ دلّی کے تخت پر ملّتِ اسلامیہ کے سب سے بڑے دشمن ـــ انگریزوں ـــ کا قبضہ ہو جائے اس لئے ابدالی نے نجیب الدولہ کو میر بخشی اور مختارِ مطلق بنا کر اپنے وطن کی راہ لی۔ نجیب الدولہ نے تا دمِ وفات (۱۷۷۰ء) دلی میں آمرِ مطلق کی حیثیت سے حکومت کی۔ بقول جادو ناتھ سرکار "نجیب الدولہ ہندوستان میں تمام افغانوں کا سردار اور تمام سُنّی مسلمانوں کا محافظ اور نظام الملک آصف جاہ کے بعد اپنے عہد کا سب سے بڑا ہندی سپہ سالار (جنرل) تھا"۔

نجیب الدولہ کی وفات کے بعد شاہ عالم ثانی نے سلطنت مغلیہ اور مسلمانوں کے دشمنوں ـــ مرہٹوں ـــ کو اپنی مدد کے لئے بلایا اور ان کی امداد کی بدولت جنوری ۱۷۷۲ء میں تختِ دہلی پر قابض ہو گیا۔ چونکہ مرہٹوں کو قدرت نے

یہ موقع عطا کیا تھا اس لیئے انہوں نے اس احمق اور بزدل بادشاہ کو نجیب الدولہ مرحوم کے جانشین ضابطہ خان کے خلاف فوجکشی پہ آمادہ کیا تاکہ اس طرح پانی پت کی شکست کا انتقام لیا جا سکے۔ چونکہ بادشاہ کا وزیر نجف خاں بھی افغانوں کا دشمن تھا اس لیئے اس نے مرہٹوں کی اس تجویز کو بسر و چشم قبول کیا اور شاہی فوج یعنی مرہٹوں نے نجیب آباد کے قلعہ موسومہ پتھر گڑھ کا محاصرہ کر کے پندرہ دن بعد محصورین کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا۔ اور آتشِ انتقام فرو کرنے کے لیئے افغان خواتین کی آبرو ریزی کی! میں ان خواتین کی بے عزتی اور رسوائی کا ذمہ دار شاہ عالم کو قرار دیتا ہوں۔ اگر اس میں کچھ بھی غیرت، حمیّت اور سمجھ ہوتی تو وہ اپنے برادرانِ دینی کو برباد کرنے کے بجائے دین اور سلطنت کے دشمنوں — جاٹوں — کی سرکوبی کرتا، مگر

چوں شود اندیشۂ قومے خراب ناسرہ گردد بدستش سیم ناب

میرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم در نگاہِ او کج آید، مستقیم

میں نے تاریخ ہند سے یہ چند واقعات اس لیئے درج کیئے ہیں کہ ناظرین پر اقبالؔ کے ان شعروں کا مطلب بخوبی واضح ہو جائے۔

آخر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ جب کسی قوم کی یہ حالت ہو جائے کہ وہ نیک و بد میں امتیاز نہ کر سکے بلکہ بدی کو نیکی اور برائی کو اچھائی سمجھنے لگے تو اس کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کی فکر کی تطہیر کی جائے یعنی اس کی ذہنیت کو خیالات فاسدہ اور عقائد باطلہ سے پاک کیا جائے۔ اس کے بعد صحیح (اسلامی) عقائد کی تلقین کی جائے۔

واضح ہو کہ تعمیر فکر سے پہلے تطہیر فکر، سنّت نبوی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے عربوں کے غلط عقائد کا ازالہ فرمایا، اس کے بعد

انہیں صحیح عقائد سے روشناس فرما کر حق و صداقت کا علمبردار بنایا۔[۱]

---

[۱] اقبال نے یہ نکتہ کہ تعمیر فکر سے پہلے تطہیر فکر لازمی ہے قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے:۔

"یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ٥

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان فرمایا کہ خود ان کی قوم میں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ ان کو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ فرماتے ہیں اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔ (۲-۱۴۶)

اس آیت شریفہ میں تلاوت اور تزکیہ سے تطہیر فکر اور تعلیم کتاب و حکمت سے تعمیر فکر مراد ہے ۱۲

فصل چہارم

حکمتِ کلیمی

تمہید اس فصل میں اقبالؒ نے ابتدائی سولہ اشعار میں انبیائے کرام کے طریق کار اور ان کی خصوصیاتِ تعلیم کا بیان کیا ہے اور آخری سولہ اشعار میں مسلمانوں سے خطاب کیا ہے کہ اگر مقصدِ حیات حاصل کرنا چاہتے ہو تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرو۔

اس فصل کا عنوان ہے "حکمتِ کلیمی" جس سے مراد ہے تعلیم نبوی۔ اقبالؒ نے تعلیم نبوی کی آسان ترکیب کے بجائے حکمتِ کلیمی کی ترکیب استعمال کی ہے کیونکہ اس میں بلاغت اور معنویت کی شان پائی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے

(ا) "حکمت" قرآنی اصطلاح ہے اور اس کے معنی میں بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اس لفظ سے حکمت، دانائی، دانشمندی، سمجھ بوجھ، عقل، فہم، تفقہ فی الدین، ادراک، تدبّر، مصلحت، بصیرت، محاسن اخلاق، اخلاقی احکام اور سنّت نبویؐ، یہ تمام باتیں مراد لی ہیں۔ کتاب اللہ نے یہ لفظ اُن قطعی اور یقینی علوم کے لئے استعمال کیا ہے جو بواسطۂ انبیاؑ انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ بالفاظ دگر "حکمت" منہاج نبوت کا دوسرا نام ہے۔ قرآن حکیم کی رُو سے حکمت کا اطلاق صرف علوم انبیاء پر ہوتا ہے کیونکہ یقینی علم وہی ہے جو مشکوٰۃ نبوت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض

ظن و تخمین ہے۔

بیشک عرفِ عام میں فلاسفہ (حکماء) کے نتائج افکار کو بھی حکمت کہتے ہیں مگر قرآن حکیم، انسانی افکار کو حکمت کا لقب عطا نہیں کرتا کیونکہ وہ مفید ظن تو ہو سکتے ہیں مگر مفیدِ یقین نہیں ہو سکتے۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمت کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے یعنی اگر کوئی شخص حقیقی معنوں میں حکمت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے فلاسفہ کے بجائے انبیاء کی شاگردی اختیار کرنی چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۝ (۱۷-۳۹)

یہ مذکورہ بالا نصائح منجملہ ان باتوں کے ہیں جو وحی کیں آپؐ کی طرف آپؐ کے رب نے حکمت میں سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حقیقی حکمت کا منبع ذاتِ باری ہے اور وہی بذریعۂ وحی، انسانوں کو اس نعمتِ عظمیٰ بلکہ "خیر کثیر" سے سرفراز فرماتا ہے۔ چونکہ وحی الٰہی قطعی، یقینی، حتمی اور (دعا فی) ہے اس لئے جو علم اس سے حاصل ہوگا وہ بھی یقینی ہوگا اور قرآن اسی علم کو حکمت قرار دیتا ہے اور اسی حکمت کی شان ان الفاظ میں واضح کرتا ہے:-

يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت عطا کی گئی بلاشبہ اسے خیر کثیر عطا کی گئی۔ (۲-۲۶۹)

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت و رسالت میں سے چوتھا فرض تعلیم حکمت قرار دیا ہے۔

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ

اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۶۲-۲)

اللہ وہ ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو

(۱) ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ (تلاوتِ آیات)

(۲) اور انہیں رزائل اخلاق اور غلط عقائد سے پاک کرتا ہے۔ (تزکیۂ نفوس)

(۳) انہیں الکتاب (قرآنی احکام) سکھاتا ہے۔ (تعلیم کتاب)

(۴) اور حکمت سکھاتا ہے۔ (تعلیم حکمت)

خلاصۂ کلام اینکہ "حکمت" سے وہ علوم مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ انبیاءؑ کو عطا فرماتے ہیں تاکہ وہ ان کی مدد سے قرآن کا پیغام کافروں تک پہنچا سکیں، اس کی صداقتوں کی تبلیغ کر سکیں، ان صداقتوں کی عظمت دلوں میں پیدا کر سکیں، اور براہین سے کام لیکر ان کو کفر کے مقابلہ میں غالب کر سکیں، اگر ضرورت لاحق ہو تو کفار سے مناظرہ بھی کر سکیں، اور ہر مستفسر کے سوال کا جواب دے سکیں اور قرآن شریف کے اسرار و حکم کو دلنشیں پیرایہ میں بیان کر سکیں، موقع اور محل کے مطابق گفتگو کر سکیں اور اپنے طرزِ عمل سے قلوب کو اپنی طرف مائل کر سکیں۔

جب کوئی شخص مرشدِ کامل کی صحبت میں بیٹھ کر اپنا تزکیہ کر لیتا ہے یعنی بواسطۂ شیخ، فنا فی الرسول ہو جاتا ہے تو قدرتی طور پر ان علوم کا عکس اس کے دل میں جلوہ گر ہو جاتا ہے چنانچہ مرشد رومیؒ فرماتے ہیں:-

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک | نقشہا بینی بروں از آب و خاک
بینی اندر خود علوم انبیاء | بے کتاب و بے معید و اوستا

یعنی جب دل کا آئینہ پاک اور صاف ہو جاتا ہے (یا اس وقت ہوتا ہے جب

غیر اللہ کی محبت دل سے نکل جائے اور محبت اس وقت نکلتی ہے جب یہ یقین ہو جائے کہ ماسوی اللہ کے کوئی حقیقت ہی نہیں ہے اور لا موجود الا اللہ کا مطلب یہی ہے) تو عالم ملکوت اور عالم ماہوت کے رموز و اسرار اور حقائق و معارف، سالک پر واضح ہونے لگتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس کے اندر انبیاءؑ کے علوم جلوہ گر ہونے لگتے ہیں۔ دوسرا مصرع بہت غور طلب ہے۔ مرشد رومیؒ فرماتے ہیں کہ سالک نہ تو کسی مدرسہ یا کالج میں جاتا ہے نہ کسی استاد سے کوئی کتاب پڑھتا ہے اور نہ کسی مستعد طالبعلم سے اسباق کی تکرار کرتا ہے۔ اس کے باوجود تمام علوم و فنون میں ماہر ہو جاتا ہے:

ہمارے زمانہ میں شیخ العرب والعجم حضرت اقدس مرشدی و سیدی حاجی امداد اللہ صاحب چشتی صابری مہاجر مکی المتوفی ۱۳۱۷ھ کی شخصیت مبارکہ اس شعر کی صداقت پر ایک روشن دلیل ہے۔

حضرت کے خلیفۂ اعظم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے ایک مرتبہ بسبیل تذکرہ کہا "اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس قدر علم عطا فرمایا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو دس کافیہ لکھ دیں لیکن خدا کی شان دیکھو ہم نے اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کی جس کی ظاہری تعلیم "کافیہ"[1] سے آگے نہیں ہے۔"

اسی طرح ایک مرتبہ حجۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے ایک عالم نے پوچھا کہ "حضرت! آپ کے مرشد حاجی امداد اللہ

---

[1] کافیہ علم نحو کی وہ مشہور ابتدائی کتاب ہے جو صدیوں سے عراق، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کے عربی مدارس میں داخل نصاب ہے۔ کافیہ کے بعد منطق، معانی، فلسفہ، کلام، ریاضی، تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب قبلہ صرف عربی گرامر پڑھے ہوئے تھے۔ علوم عقلیہ یا نقلیہ آپ نے نہیں

صاحب نے کس درسگاہ سے علوم کی سند حاصل کی ہے؟ سننے میں یہ آیا ہے کہ وہ مستند عالم نہیں ہیں۔" یہ سن کر مولانا مرحوم نے یہ فرمایا "سبحان اللہ! ہمارے حاجی صاحب عالم ہی نہیں ہیں بلکہ عالم گر بھی ہیں جسے شک ہو وہ مجھے دیکھ لے۔"

دوسری مثال:۔ حضرت سید احمد صاحب رائے بریلوی (شہادت ۱۲۴۶ھ) نے کافیہ بھی نہیں پڑھا تھا مگر مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی جیسے علماء ان کے کفش برداروں میں تھے۔ کثر اللہ تعالیٰ امثالھم

لفظ حکمت کی تشریح کے بعد اب ہم لفظ "کلیم" کی معنویت واضح کرتے ہیں۔ اقبال نے لفظ "نبوی" کے بجائے لفظ "کلیمی" کو اس لئے ترجیح دی کہ آئندہ فصل کا عنوان "حکمتِ فرعونی" ہے اور فرعون کے مقابلہ میں "کلیم" کا لفظ موزوں تر ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نبی کا معنیٰ ہے خبر دینے والا، مگر کلیم کا معنیٰ ہے "اللہ سے کلام کرنے والا" لہٰذا کلیم کا مرتبہ نبی سے بلند تر ہے۔ ہر کلیم نبی ہے مگر ہر نبی کلیم نہیں۔ یہ لفظ صرف حضرت موسیٰؑ سے مخصوص ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ لفظ کلیم کو مسلمانوں کے لٹریچر میں خاص شہرت اور عظمت حاصل ہو گئی ہے۔ شعراء نے اس لفظ پر اس قدر طبع آزمائی کی ہے کہ اب یہ لفظ سلسلہ رشد و ہدایت کا نمائندہ بن گیا ہے مثلاً

چپ ہو کلیم کس لئے، طور کا ماجرا کہو
یہ تو بتاؤ کیا ہوا جلوۂ یار دیکھ کر

فی الجملہ حکمتِ کلیمی سے مراد ہے انبیاءؑ کا طریق کار اور ان کی تعلیمات کا انداز۔ اب ہم اس فصل کی شرح لکھتے ہیں:۔

(۱) تا نبوتِ حکمِ حق الخ اس مصرع میں نبوت سے صاحبِ نبوت یا نبی مراد ہے، اور تمام کمالاتِ نبوت چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات میں پائے جاتے ہیں اس لئے یہاں دربردہ آپؐ ہی مراد ہیں۔

اگر اس معنی پر قرینہ درکار ہو تو اس شعر پر غور کرو:۔

معنیٔ جبریل و قرآن است او   فطرۃ اللہ را نگہبان است او

پہلے شعر میں اقبالؔ نے دینِ اسلام کی روح یا حقیقت واضح کردی ہے اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ اسی نکتۂ جان فروز کی تفسیر ہے۔ وہ نکتۂ دلنواز کیا ہے؟ صرف یہ کہ اسلام نام ہے دنیا میں اجرائے حکمِ حق کا یہی ہر نبی کی بعثت کی علتِ غائی ہے۔ ہر نبی نے بنی آدم سے یہی کہا کہ انسانوں کی اطاعت (عبادت) اور غلامی اور فرمانبرداری کے بجائے اللہ کی عبادت یعنی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔ اسی لئے قرآن حکیم فرماتا ہے:۔

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ (۲ — ۲۸۵)

ہم (مسلمان) اللہ تعالیٰ کے مبعوث کردہ رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

کیوں؟ اس لئے کہ سب رسولوں کی تعلیم یکساں تھی اور جب تعلیم یکساں تھی تو سب رسول بھی یکساں ہوئے۔ اور وہ تعلیم یہ تھی:۔

(ا) یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ ط (۵ — ۷۲)

(جنابِ مسیحؑ نے فرمایا) اے بنی اسرائیل! اطاعت کرو اللہ کی جو میرا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی

(ب) اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (۲۳ — ۲۲)

پھر ہم نے ان میں ایک رسول مبعوث کیا جس نے انہیں یہ تعلیم دی کہ اطاعت کرو

اللہ کی جس کے علاوہ کوئی الٰہ (واجب الاطاعت ہستی) نہیں ہے۔

(ج) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ (۶-۱۰۲)

یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ یعنی کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت کی جائے (کیونکہ اللہ کے سوا جس قدر مخلوق ہے سب حادث، محتاج اور فقیر ہیں، لہٰذا جو خود محتاج ہے وہ دوسرے کو کیا دے گا؟ اور جو خود فقیر ہیں اسے دوسروں پر حکومت کا کیا حق ہے؟) یہی اللہ ہر شئی کا خالق ہے (ہر شئی مخلوق ہے اور ہر مخلوق بلاشبہ مجبور و عاجز، ناتواں، محتاج، ناقص، دست نگر، فقیر، حادث، ممکن اور اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہوتی ہے) اور جس میں اتنے عیوب اور نقائص موجود ہوں وہ اس لائق کہاں کہ اس کی اطاعت کی جائے وہ تو خود کسی کا مطیع ہے۔ کیا آج تک کسی غلام نے یہ کہا ہے کہ میری اطاعت کرو؟) پس تم اُسی کی اطاعت کرو اور یاد رکھو کہ وہ ہر شئی پر قدرت تامہ اور اختیار کامل رکھتا ہے کوئی شئی اس کے حیطہ اقتدار سے باہر نہیں ہے۔

(د) اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝

(حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے خطاب فرمایا) بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا اس تمام کائنات میں کوئی الٰہ نہیں ہے یعنی کوئی ہستی (خود موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر صرف میرا وجود خانہ زاد ہے۔ باقی تمام مخلوقات کا وجود مستعار، عارضی اور فانی ہے۔ اسی لئے کائنات میں کوئی ہستی اس قابل نہیں کہ اس کی اطاعت کی جائے) لہٰذا تم صرف میری اطاعت کرو (اور اس پر مداومت کا طریقہ یہ ہے کہ) میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔

"قرآن حکیم میں بہت سی آیات اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں کہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کی اطاعت کی جائے۔ لیکن مطلب کی وضاحت کے لئے یہ چار آیات کافی ہیں۔

اجرائے حکمِ حق سے مراد ہے اللہ کے قانون کو دنیا میں نافذ کرنا۔ (اور یہ قانون بصورتِ قرآن ہمارے پاس موجود ہے اور حدیثِ رسولؐ اسی قانون کی تشریح اور توضیح ہے، اس لیئے حدیث کا انکار دراصل قرآن کا انکار ہے)۔

نبی کا فرضِ منصبی، جس کے لیئے وہ مبعوث ہوتا ہے، یہ ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کا قانون نافذ کرے اور اللہ کے بندوں سے کہے کہ تم انسانوں کے نافذ کردہ قانون کے بجائے اللہ کے قانون کی اطاعت کرو۔

اس اعلان کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہر نبی

مصرعہ   پشتِ پا بر حکمِ سلطاں می زند

جب ایک نبی، اللہ کے بندوں کو اللہ کے قانون کی اطاعت کا درس دیتا ہے تو لامحالہ وہ سلاطین سے برسرِ پیکار ہو جاتا ہے۔ یعنی ہر نبی سب سے پہلے ملوکیت کا ابطال کرتا ہے تاکہ حکمِ حق جاری ہو سکے۔ بالفاظِ دگر نبی سب سے پہلے انسانوں کو بادشاہوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اس کا مقولہ (ماٹو) یہ ہوتا ہے:۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲ - ۴۰)

(حضرت یوسفؑ نے جیلخانہ میں اپنے ساتھیوں سے کہا) آگاہ ہو جاؤ کہ حکومت کرنے کا حق صرف اللہ کے لیئے ثابت ہے۔

اقبالؔ نے اس شعر میں اسی آیت کا مفہوم قلمبند کیا ہے:۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

فی الجملہ نبی، ملوکیت کے خلاف بغاوت کا درس دیتا ہے۔ یہ درس، بغاوت

اس کی تعلیمات کی ابجد ہے کیونکہ جب تک ملوکیت کا ابطال اور استیصال نہ ہو جائے "حکم حق" جاری نہیں ہو سکتا۔

جس طرح نیکی اور بدی، سیاہی اور سپیدی جھوٹ اور سچ دونوں بیک وقت بیک جہت ایک مقام یا ایک شخص میں جمع نہیں ہو سکتے اسی طرح حکم حق اور حکم ملوکیت دونوں بیک وقت نافذ نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی لئے رسولؐ نے انسانوں کو ملوکیت اور قیصریت کے خلاف اعلان جنگ کی تعلیم دی[1] (از آدم تا ایں زمان خاتم المرسلین سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم)۔

دوسرا شعر اسی پہلے شعر کی وضاحت کرتا ہے یعنی نبی کی نگاہ میں قصر سلاطین در اصل ایک بتخانہ ہوتا ہے اور سلطان بمنزلۂ بُت ہوتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کی رُو سے موحد حقیقی وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے۔ اس سے ہر وہ شی جس کے سامنے انسان سر تسلیم خم کرے، بُت ہے خواہ وہ بُت پتھر کا بنا ہوا ہو یا کوئی انسان ہو، قرآن ہر قسم کی بُت پرستی کا مخالف ہے، یعنی ماسوی اللہ کی اطاعت بھی، بُت پرستی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

الف بے تے ہی سے ہیں تو یہ سمجھا
الف اللہ کا اور ماسوی بُت

---

[1] ہمارے زمانہ میں بھی ایک مدعیٔ نبوت پیدا ہوا جس نے بڑے طمطراق سے یہ کہا

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے
من بعرفان نہ کمترم ز کسے

لیکن اس کے "عرفان" کی شان یہ تھی کہ وہ ساری عمر مسلمانوں کو ملا غنہ فرنگ کی غلامی کا سبق پڑھاتا رہا اور ان کی حمایت میں اپنی جہالت کے جوہر دکھاتا رہا ۱۲

(۱) ماسوی اللہ بُت ہے (صُغریٰ)

(ب) بُت پرستی حرام ہے (کُبریٰ)

(ج) اس لئے ماسوی اللہ کے سامنے جھکنا یا اس کی اطاعت کرنا حرام ہے قرآن حکیم نے اس باب میں اپنا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲۸ - ۸۸)

اور اللہ کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو اِلٰہ مت قرار دے۔ (کیوں؟ اس لئے کہ) اس کے سوا اور کوئی اِلٰہ موجود ہی نہیں ہے۔ (اور اس کی وجہ یہ ہے) کہ اس کے علاوہ ہر شئی معرضِ فنا میں ہے، اور اِلٰہ وہ ہے جس پر فنا طاری نہ ہو سکے۔ (چونکہ اللہ کے سوا کوئی ہستی اِلٰہ (واجب الوجود) نہیں ہے، اس لئے کوئی ہستی اس لائق بھی نہیں ہے کہ اس کائنات پر حکومت کر سکے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ لہ الحکم یعنی فرمانروائی اور حکمرانی صرف اللہ کے لئے ہے اور آگاہ ہو جاؤ تم سبھوں کو انجام کار اسی حاکم مطلق اور فرمانروائے حقیقی کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

اس آیت شریفہ کا مفہوم ذہن نشین کرنے کے بعد یہ مصرع پڑھو:-

ع غیرتِ او بر نتابد حکمِ غیر

یعنی نبی کی غیرتِ دینی، غیرُ اللہ کی حکومت کو برداشت ہی نہیں کر سکتی کیونکہ وہ مبعوث ہی اس لئے ہوتا ہے کہ غیرُ اللہ کی حکومت کو دنیا سے مٹا دے۔ اس کا پہلا اور سب سے بڑا فرض ہی یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کو غیرُ اللہ کی غلامی سے نجات دے۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کو تبلیغی خط لکھا تو اس کی ابتدا اس طرح فرمائی:-

من محمد رسول اللہ الیٰ عظیم الروم الخ

اللہ کے رسول برحق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے رومیوں کے سردار کے نام آپؐ نے اُسے قیصر یا سلطان یا ملک کے لقب سے مخاطب نہیں فرمایا کیونکہ آپؐ کی نگاہ میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ہستی اس لقب کی مستحق ہی نہیں تھی۔ یعنی آپؐ نے عملاً ثابت کر دیا کہ اسلام کسی انسان کو بادشاہ تسلیم نہیں کرتا۔ اسی لئے اقبال نے یہ تعلیم دی کہ "لا ملوکیت فی الاسلام" یعنی اسلام میں ملوکیت نہیں ہے ۱۲

خلاصۂ کلام ایں کہ قرآن کی رو سے

(ا) اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے۔

(ب) چونکہ خالق وہ ہے اس لئے عقل کا تقاضا یہ ہے کہ رازق (رب) بھی وہی ہو۔ جب اس کے سوا کوئی خالق نہیں تو اس کے سوا کوئی رازق کیسے ہو سکتا ہے ؟ اگر ہو سکتا ہے تو پھر وہ خدا ہو گئے ؟ لہٰذا اگر خدا خلق کر سکتا ہے تو رزق بھی دے سکتا ہے۔ اگر وہ رزق نہیں دے سکتا تو عقل یہ اعتراض وارد کرتی ہے کہ پھر اس نے کائنات کو خلق کیوں کیا ؟ یعنی اگر خدا کو رازق تسلیم نہ کیا جائے تو اس کی خدائی (خالقیت) بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔

(ج) چونکہ وہ رازق ہے اس لئے مالک بھی ہے۔ یعنی عقلاً اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ کائنات کو اپنی مِلک قرار دے اور اس میں تصرف کر سکے

(د) چونکہ ہر مالک اپنی مِلک میں بلا شرکت غیرے تصرف کا حق رکھتا ہے اس لئے اگر وہ مالک ہے تو حاکم بھی ہے۔

(ہ) لہٰذا از روئے عقل، اللہ کے سوا کوئی شخص حاکم نہیں ہو سکتا۔

پھر غور کرو :

(ا) چونکہ اللہ خالق ہے اس لئے وہی رازق بھی ہے۔

(ب) چونکہ وہی رازق ہے اس لئے وہی مالک بھی ہے۔

(ج) چونکہ وہی مالک ہے اس لئے وہی حاکم بھی ہے۔

اسی لئے حضرت علیؓ نے اپنی مہر پر یہ عبارت لکھوائی تھی:۔

الملک للہ و الحکم للہ

غور کرو تو ان دو لفظوں میں اسلام کی ساری روح سمٹ کر آگئی ہے۔

اکبر الہ آبادی نے اسی نکتۂ بلیغ کو یوں ادا کیا ہے:۔

رضائے حق پہ راضی رہ، یہ حرفِ آرزو کیسا!

خدا خالق، خدا مالک، خدا کا حکم، تو کیسا؟

حکمت نبوی کی دوسری خصوصیت:۔ ع پختہ سازد صحبتش ہر خام را الخ

"خام" کنایہ ہے اُس شخص سے جو کسی دوسرے کو اللہ کا شریک سمجھے، خواہ وہ شرکت ذات میں ہو یا صفات میں، عبادت میں ہو یا حکومت میں۔

مثلاً ایک شخص اللہ کے علاوہ کسی اور کو بھی الٰہ سمجھتا ہے تو یہ شرک فی الذات ہے اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور ہستی بھی عالم الغیب ہے تو یہ شرک فی الصفات ہے۔

اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی سجدہ کرے تو یہ شرک فی العبادت ہے

اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی فرمانروا سمجھے تو یہ شرک فی الحکم ہے۔

شرک کی یہ چاروں صورتیں شرک جلی کہلاتی ہیں۔ شرک خفی یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی حقیقی معنی میں موجود سمجھے۔ عرفا کی اصطلاح میں اسے شرک فی الوجود کہتے ہیں اور جب ایک مسلمان، شرک کی ان پانچوں قسموں سے مبرّا ہو جاتا ہے تو موحدِ کامل بن جاتا ہے۔

غالبؔ نے اس شعر میں شرکِ خفی سے اجتناب کی تلقین کی ہے :۔

جاروب لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
باگردِ فرش و سینہ بایوان برابر است

یعنی تیرا دل بمنزلہ ایوان ہے اور شرک فی الوجود کا عقیدہ بمنزلہ گردِ فرش ہے اس لیئے لاموجود الا اللہ کی جھاڑو سے فرشِ ایوان کی گرد کو جھاڑ دے تاکہ تو حقیقی معنی میں موحد بن جائے۔ یعنی یہ عقیدہ رکھ کہ حقیقی معنی میں اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے تاکہ تیرا دل شرک فی الوجود کی کدورت (گرد و غبار یا کثافت) سے پاک ہو جائے۔

واضح ہو کہ تصوفِ اسلام نام ہی ہے دل کو ہر قسم کے شرک سے پاک کرنے کا۔ انسان عارف بنتا ہی اس وقت ہے جب اسے اس بات کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے کہ اللہ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی شئی موجود نہیں ہے۔ اقبالؔ نے "مسافر" میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :۔

آں مسلمانے کہ بیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست
تیغِ "لاموجود الا اللہ" اوست

یعنی جو مسلمان اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہے وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔

چنانچہ امام ربانی حضرت "مجدد الف ثانی" فرماتے ہیں :۔

"ممکن را وجود ثابت کردن و خیر و کمال راجع باو داشتن فی الحقیقت شریک کردن است او را در ملک و ملکِ حق جل سلطانہ ہمچنیں ممکن را عین واجب گفتن تعالےٰ شانہ سوادب است و الحاد... اگر علماءِ ظاہر ازیں دقیقہ آگاہ می گشتند، ممکن را وجود ثابت نمی کردند الخ

(مکتوبِ اول جلد ثانی مطبوعہ نولکشور)

یعنی ممکن (کائنات کے لئے وجود ثابت کرنا (یعنی یہ سمجھنا کہ ممکن بھی موجود ہے) اور نیکی اور کمال کو اس کی طرف منسوب کرنا، درحقیقت ممکن کو، حق تعالیٰ کے مُلک اور اس کی مِلک میں شریک قرار دینا ہے۔

یعنی یہ سمجھنا کہ جس طرح خدا، بذاتِ خود موجود ہے اسی طرح انسان بھی بذاتِ خود موجود ہے۔ درحقیقت شرک فی الوجود ہے۔

تو بھی موجود اور حق بھی موجود!
ظالم یہ شرک و بُت پرستی تا کے؟

اسی طرح یہ سمجھنا کہ ممکن (بندہ) عینِ حق ہے، سراسر کفر و الحاد ہے

یعنی کائنات نہ تو بذاتِ خود موجود ہے (یہ شرک ہے)

اور نہ عینِ حق ہے (یہ الحاد ہے)

بلکہ بذاتِ خود معدوم ہے بحکم حق موجود ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی صحبت میں یہ طاقت اور تاثیر ہوتی ہے کہ کافر، ملحد اور مشرک اُس کی بدولت، مومن بلکہ موحّدِ کامل بن جاتا ہے۔ اگر مثال درکار ہو تو حضرات صحابۂ کرام رض کی زندگیوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض "الکتاب" سے انسانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو بعثتِ انبیاء کا سلسلہ قائم نہ ہوتا۔ حق تعالیٰ "الکتاب" آسمان سے نازل فرما دیا کرتے اور اسے پڑھ کر یا اس کی تعلیمات پر عمل کر کے انسانوں میں تبدیلی پیدا ہو جایا کرتی یعنی خام افراد، پختہ بن جایا کرتے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے (ناقص افراد کو کامل اور خام کو پختہ بنانے کے لئے) کتاب اور صاحب کتاب (قانونِ حق اور رسولِ برحق) دونوں کا وجود ضروری ہے اور ان میں

وہی نسبت ہے جو ہاتھ اور کنجی میں ہے۔

کتاب بمنزلۂ کلید ہے۔ رسول بمنزلۂ دست ہے۔ بلاشبہ قفل کنجی ہی سے کھل سکتا ہے مگر جب تک کوئی ہاتھ، کنجی کو قفل میں ڈال کر گردش نہ دے کنجی غیر موثر ہے۔ اسی طرح انقلاب بلاشبہ قرآن ہی کی بدولت برپا ہو سکتا ہے مگر جب تک کوئی اللہ کا بندہ خود مجسم قرآن بن کر سامنے نہ آئے[1] جب تک وہ خود قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے نہ دکھائے۔ بالفاظِ دگر، جب تک وہ اپنے عمل سے اسوۂ حسنہ[2] پیش نہ کرے، اُس وقت تک قرآن غیر موثر ہے۔

انسان کی فطرت ہی اس قسم کی ہے کہ وہ کتاب کے بجائے صاحبِ کتاب یعنی اُسوہ سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر کتابوں سے انقلاب ہو سکتا تو تمام حکما اور فلاسفہ انقلاب برپا کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا کیونکہ علماء اور فلاسفہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود عمل کر کے نہیں دکھلاتے۔

لیکن نبی کا ہر قول اور فعل "اُسوۂ حسنہ" ہوتا ہے۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد کچھ لوگ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپ کی سیرت سے آگاہی حاصل کریں تو انھوں نے دریافت

---

[1] اقبال نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

[2] خود قرآن سے ثابت ہے کہ کتاب کے علاوہ "نمونہ" کی بھی ضرورت ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ الخ

بلاشبہ تمہارے لئے اللہ کے رسول کی شخصیت میں بہترین نمونہ موجود ہے تاکہ تم اس کی اتباع کی بدولت کامیابی حاصل کر سکو۔

کہا "کیا تم لوگوں نے قرآن پڑھا ہے؟" انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو صدیقہؓ نے فرمایا کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰن یعنی آپؐ مجسم قرآن تھے۔

بات یہ ہے کہ خدا جسے ہدایت کے لئے مامور کرتا ہے اس کا انتخاب خود فرماتا ہے (یعنی کوئی شخص اپنی کوشش سے نبی نہیں بن سکتا) اور خود اس کی شخصیت کو منبعِ رشد و ہدایت بناتا ہے، اس میں فوق العادت طاقتیں پیدا کرتا ہے۔ بالفاظِ دگر، اس کی ذات کو چراغ بنا کر مبعوث کرتا ہے تاکہ اُس سے دوسرے چراغ روشن ہو سکیں۔ سب جانتے ہیں کہ چراغ، چراغ ہی سے روشن ہو سکتا ہے، اور کوئی صورت نہیں ہے۔ تقریروں، خطبوں، کتابوں، وعظوں، باتوں، تجویزوں، مجلسوں، پوسٹروں، اشتہاروں اور ٹریکٹوں سے سب کچھ ہو سکتا ہے مگر چراغ روشن نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی شخص اپنا چراغ روشن کرنا چاہتا ہے تو اس کی تو ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے چراغ کی بتی کو کسی جلتے ہوئے چراغ کی بتی یعنی لَو سے متصل یا مربوط کر دے۔ زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر چراغ روشن ہو جائیگا۔ؔ

اس کا مطلب یہ ہے کہ چراغ روشن کرنے کے لئے تقریر (قول) کے بجائے صحبت (عمل) درکار ہے۔ آپ ساری عمر چراغ روشن کرنے کی ترکیب بیان کرتے رہیں (کتابیں پڑھتے رہیں، لیکچر دیتے رہیں، سنتے رہیں) چراغ روشن نہیں ہوگا کیونکہ ایسا ہونا قانونِ قدرت یا سُنّۃ اللہ کے خلاف ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ۝ (۳۵ ـــ ۴۳)

اور اے مخاطب! تو اللہ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہ پائے گا۔

ؔ اسی لئے تو مرشد رومیؒ نے اس زمانہ کے مدعیانِ انسانیت کو یہ مشورہ دیا ہے:

قال را بگذار مردِ حال شو
پیشِ مردِ کاملے پامال شو

اسی طرح اگر آپ اپنے دل کا چراغ روشن کرنا چاہتے ہیں تو اس مرد حق کی صحبت اختیار کیجئے جس کا دل منور ہو۔ تنویر کا یہ نظام خود خالق کائنات کا قائم کردہ ہے۔

حق تعالیٰ نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو بواسطہ جبرئیل خود منور فرمایا۔ اس طرح تنویر کا وہ سلسلہ قائم ہو گیا جو قیامت تک قائم رہیگا اس کی تفصیل یہ ہے :۔

آپ کے چراغ سے حضرت علیؓ نے اپنا چراغ روشن کیا

آنجنابؓ کے چراغ سے سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے شیخ شیوخ عالم حضرت گنج شکر اجودھنیؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے مخدوم علی احمد صابر کلیریؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتیؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے قطب الاقطاب شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے حضرت نور محمد صاحب جھنجھانویؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے شیخ العرب والعجم حضرت اقدس مرشدی وسیدی مولانا مولوی حافظ حاجی امداد اللہ صاحب چشتی مہاجر مکیؒ نے اپنا چراغ روشن کیا اور اس چراغ سے ہندوستان میں سینکڑوں چراغ روشن ہو گئے

بلا شبہ جب میں حضرت حاجی صاحب قبلہ کی ذات بابرکات اور اس کے فیوض و برکات پر غور کرتا ہوں تو یہ شعر بے ساختہ میری زبان پر جاری ہو جاتا ہے :۔

چمنے کہ تا قیامت گل او بہار بادا

صنمے کہ بر جمالش دو جہاں نثار بادا

میں نے یہ تفصیل اس لئے سپردِ قلم کی ہے کہ اس زمانہ میں بعض لوگ اس قماش کے پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے اپنا چراغ تو روشن کیا نہیں مگر دوسروں کا چراغ روشن کرنے کے مدعی ہیں اور چونکہ انہوں نے خود کسی مردِ حق کی صحبت نہیں اٹھائی اس لئے وہ مسلمانوں کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اصلاح و تزکیۂ نفس کے لئے صحبتِ مرشد ضروری نہیں ہے۔ ہمارا لٹریچر پڑھ لو، اصلاح بھی ہو جائے گی اور دل بھی روشن ہو جائے گا! بلکہ پاکستان میں اسلامی حکومت بھی قائم ہو جائے گی!

چونکہ یہ فتنہ، پاکستان میں روبہ ترقی ہے اس لئے میں نے مناسب خیال کیا کہ مسلمانوں کو متنبہ کر دوں کہ صحبتِ مرشد کے بغیر کوئی خام طبع انسان پختہ نہیں ہو سکتا، اور جو لوگ اس کے خلاف یہ کہتے ہیں کہ محض کتابوں سے دین سمجھ میں آ سکتا ہے یا چراغ روشن ہو سکتا ہے وہ دراصل دین سے ناواقف ہیں اور مسلمانوں کے نادان دوست ہیں۔

تیسری خصوصیت:- ؎ درسِ او اللہ بس باقی ہوس

نبی، اپنے متبعین کے قلوب میں اس صداقت کو جاگزیں کر دیتا ہے کہ

"اللہ بس باقی ہوس"

یعنی مومن کا فرض یا شعارِ زندگی یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کو اپنا محبوب، مطلوب معبود اور مقصود بنائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ جل شانہٗ اپنے بندے کے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے (اور جب وہ اکیلا ہی اس کے لئے بس کرتا ہے (کافی ہے)) تو پھر بندے کا غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونا دراصل ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ (بندہ) اس (اللہ) کو کافی یقین نہیں کرتا۔ اگر وہ اس کو کافی یقین کرتا ہے تو غیر کی طرف کبھی ہرگز متوجہ نہ ہوتا۔ حق تو نے خود ہی صاف لفظوں میں

آگاہ فرما دیا ہے:-

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ط (۳۹ - ۳۶)

کیا اللہ (بذاتِ خود) اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے۔[1]

الغرض جب یہ عقیدہ دل میں راسخ ہو جاتا ہے کہ اللہ میرے لئے کافی ہے یعنی میری تمام حاجات پوری کر سکتا ہے تو پھر مردِ حق کسی انسان کی غلامی نہیں کر سکتا۔ وہ سب سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کو اپنے لئے کافی سمجھتے تھے اس لئے ان کی نگاہ میں دنیاوی ساز و سامان اور مال و دولت کی کوئی قیمت نہیں تھی اور نہ وہ کوئی چیز کل کے لئے جمع کرتے تھے، کیونکہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اللہ نے رزق کا ذمہ لے لیا ہے چنانچہ وہ حصولِ رزق کے لئے کبھی سلاطین کے دروازوں پر نہیں جاتے تھے رزق خود اُن کے پاس آجاتا تھا۔

جب نواب امیر خاں والی ریاست ٹونک نے حضرت شیخ غلام علی نقشبندی دہلوی خلیفہ حضرت میرزا مظہر جانجاناںؒ (المتوفی ۱۱۹۵ھ) کی خدمت میں چار گاؤں کی معافی کا فرمان بھیجا تو انہوں نے اُس کی پشت پر یہ شعر لکھ کر نواب کو واپس بھیج دیا۔

ما آبروئے فقر و قناعت نہ باختیم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

---

[1] اسی مضمون کو رحیم (عبدالرحیم خانخاناں) نے یوں ادا کیا ہے:-

جا کو راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی
بال بیکا نہ کر سکے جو جگ بیری ہوئے

یعنی جسے خدا زندہ رکھنا چاہے اُسے ساری دنیا کے لوگ مل کر بھی قتل نہیں کر سکتے۔

لیکن اس شان استغنا کے باوجود کہ انہوں نے ساری عمر کسی دولتمند سے سوال نہیں کیا۔ ان کی خانقاہ کا خرچ ہزار روپے سے کم نہ تھا۔

اس کے مقابلہ میں ارباب ہوس کا حال یہ ہے کہ ساری عمر دنیا کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں مگر ہاتھ نہیں آتی۔

چوتھی خصوصیت:۔ معنی جبریل و قرآن است او الخ

اس مصرع میں "او" کا مرجع ذات اقدس ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن ربط کلام کی خاطر لفظ نبی استعمال کرونگا۔ کہتے ہیں کہ نبی، جبریل اور قرآن کا معنی اور مفہوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کا وجود ہستی باری تعالیٰ اور ہستی ملائکہ پر حجت اور دلیل ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا اور فرشتے دونوں غیر محسوس ہیں۔ اور میں قبل ازیں اس بات کو ثابت کر چکا ہوں کہ عقل نہ خدا کا اثبات کر سکتی ہے نہ فرشتوں کا۔ اس کی رسائی صرف محسوسات تک ہے اور خدا محسوسات سے وراء الورا ہے اس لئے عقل اس مطلب میں قطعی طور پر عاجز ہے لیکن نبی خدا سے علم پا کر اس کی ہستی کا اعلان کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ خدا نے بذریعہ (وحی) جبریل مجھے اپنی ہستی سے مطلع کیا ہے اس طرح نبی کے وجود سے خدا اور ملائکہ دونوں کی ہستی ثابت ہو جاتی ہے علامہ مرحوم نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا۔ کہ اگر آنحضرت صلعم نہ فرماتے کہ خدا موجود ہے تو میں خدا کی ہستی پر محض اپنی عقل کی مدد سے ایمان نہیں لا سکتا تھا۔ چونکہ آپ کی بدولت مجھے خدا پر یقین حاصل ہوا اس لئے آپ خدا سے بھی بڑھ کر مجھے محبوب ہیں چنانچہ رموز میں لکھتے ہیں:۔

معنی حرم کن تحقیق اگر	بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوت قلب و جگر گردد نبی	از خدا محبوب تر گردد نبی

اب رہا نبی کا معنی قرآن ہونا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے اقوال اور اعمال سے قرآن کا مفہوم انسانوں کو سمجھایا۔ آپ کا وجود قرآن کی زندہ تفسیر ہے۔ مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ نماز پڑھو لیکن نماز پڑھنے کا طریقہ آپ نے ہمیں بتایا۔ اسی طرح شریعت کے تمام احکام پر آپ نے عمل کر کے دکھایا۔ لہذا آپ کی زندگی قرآن کی تشریح ہے۔ اگر سنت نبوی کو دین سے خارج کر دیا جائے۔ تو قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور چونکہ سنت نبوی احادیث میں محفوظ ہے اس لئے حدیث بلاشبہ دینی معاملات میں اسی طرح حجت ہے جس طرح قرآن۔ بالفاظ دیگر قرآن دین کے لئے بمنزلہ متن ہے اور حدیث اس کی شرح ہے۔ اس لئے حدیث کا انکار در پردہ قرآن کا انکار ہے۔

میں نے اس نکتہ کی صراحت اس لئے کی ہے کہ اس زمانہ میں بعض مسلمان یہ کہتے ہیں۔ کہ حدیث، دین میں حجت نہیں ہے۔ قرآن ہماری ہدایت کے لئے کافی ہے۔ اس شرح میں فتنۂ انکار حدیث کی مکمل تردید تو ممکن نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کو اس فتنہ عظیمہ سے بچانے کے لئے چند آیات ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے۔ کہ حق تعالیٰ اپنے کلام پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (۱۶ — ۴۴)

اور ہم نے آپ کی طرف یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کیلئے معنی اور مفہوم اس کا جو کچھ نازل کیا گیا ہے انکی ہدایت کے لئے۔ یعنی قرآن کے مطالب اور معانی لوگوں کو شرح اور بسط کے ساتھ سمجھا دیجئے۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ نے اس حکم کی تعمیل کی یا نہیں؟

اگر نہیں کی تو آپ کی رسالت ساقط ہوتی ہے اس لئے ثابت ہوا۔ کہ

کہ آپ نے ضرور تعمیل کی۔

اگر تعمیل کی تو آپ کی وہ تفسیر اور تشریح کہاں ہے؟ تمام مسلمان جانتے ہیں کہ آپ کی تفسیر ہی کا دوسرا نام حدیث نبوی ہے۔ لتبیّن کا لفظ بتا رہا ہے کہ قرآن کے بعض احکام مجمل ہیں جن کے بیان (تشریح) کی ضرورت تھی مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زکوٰۃ دو مگر زکوٰۃ کی تفصیل قرآن میں بیان نہیں کی گئی آپ نے بتایا کہ کس چیز پر کتنی زکوٰۃ واجب ہے لہذا حدیث حجت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ منکرین حدیث خود اپنے فعل سے اپنے قول کی کہ قرآن محتاج بیان نہیں ہے، تکذیب کرتے ہیں۔ یہ حضرات بڑے اہتمام کے ساتھ قرآن کی تفسیر کرتے ہیں اور اسے شائع کرنے کی زحمت بھی مول لیتے ہیں جب قرآن اپنی تفسیر خود کرتا ہے تو یہ لوگ تفسیر کیوں کرتے ہیں؟

تیسری بات یہ ہے کہ میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ ان لوگوں کو تو قرآن کی تفسیر کا حق حاصل ہے۔ مگر جس مبارک ہستی پر قرآن نازل ہوا اسے تفسیر کا حق حاصل نہ تھا؟ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔

چوتھی بات:- ان لوگوں کے طرز عمل کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ رسول (نعوذ باللہ) محض ایک پیغام رساں تھا اس نے پیغام پہنچا دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ اس کا مطلب تم خود سمجھو۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کا انکار کرنے کے بعد منکر حدیث کا کوئی روحانی رابطہ آپؐ سے قائم نہیں ہو سکتا۔ فافہم و تدبر۔

اس شعر کا دوسرا مصرع بہت غور طلب ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ نبی، محض جبریل و قرآن ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ فطرۃ اللہ کا نگہبان بھی ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ فطرت اللہ قرآن حکیم کی اصطلاح ہے۔ اور اس آیت سے

سے ماخوذ ہے:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ٥ (۳۰ـــ۳۰)

پس راست کر اپنے مونہہ کو عبادت (اطاعت) کے لئے یکسو اور یک رُخ ہو کر (یعنی) پیروی کر خدا کے دین (اللہ کی فطرت) کی (اور یہ خدا کا دین کیا ہے؟ وہی تو ہے) جس پر اللہ تعالے نے انسانوں کو پیدا کیا ہے یعنی ان کی تخلیق ہی اس نہج پر کی ہے۔ کہ وہ بلا تکلف دین خدا کی پیروی کر سکیں اس دین خدا میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اور یہی ہے دین درست اور صحیح۔

فی الجملہ فطرت اللہ سے مراد ہے دین اللہ اور اس سے سرشت انسانی بھی مراد ہے۔ جیسا کہ "خلق اللہ" سے واضح ہو رہا ہے مطلب یہ ہے کہ دین اللہ یعنی اسلام عین سرشت (فطرت) انسانی ہے اور اس معنی کی تائید و تصدیق حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ۔

یعنی ہر بچہ اپنی فطرت سلیمہ یعنی دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کی سرشت ایسی بنائی ہے۔ کہ تو وہ بجز دین اسلام کی طرف مائل ہوتا ہے۔ مگر اس کے والدین اسے نصرانی یا یہودی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

قرآن اور حدیث کے مطالعہ اور اس کی تعلیمات میں تدبر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالے نے انسان کو یہ حکم دیا کہ "اقم وجهك للدين" یعنی دین اسلام (دین فطرت) کی پیروی پر کمربستہ ہو جاؤ۔ تو یہ حکم خارج سے اس پر مسلط نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ تعالے نے اسے صرف اس کی سرشت کے تقاضے کی تکمیل کی طرف

متوجہ کیا ہے۔ بالفاظ دگر، اقامت وجہ برائے دین، کسی بیرونی طاقت کا خارجی دباؤ یا غلبہ نہیں ہے۔ بلکہ دین اسلام کی پیروی تو سرشت انسانی کا اقتضاء ذات ہے جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

جب ایک شخص دین اسلام کی پیروی کرتا ہے تو وہ اپنی سرشت (تخلیق) کے باطنی تقاضوں کی تسکین کا سامان کرتا ہے۔ دگر ہیچ۔ اسی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اور یہی فطرت "دین قیم" ہے۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ فطرت اللہ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے خود اس کا جواب دے دیا ہے۔ کہ تمہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے اندر غور کر کے دیکھ لو۔ شریعت خارج سے تم پر مسلط نہیں ہوئی ہے۔ ہم نے تمہیں دین (فطرت) ہی پر پیدا کیا ہے۔ تمہاری سرشت اور دین دونوں عین یک دگر ہیں۔[1]

نوٹ:۔ خدا کی ہستی اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور آخرت کے متعلق قرآن کا اسلوب بیان وہ نہیں ہے، جو منطقی مقدمات اور فلسفیانہ استدلال کا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ نہایت دلنشیں انداز میں انسان کی فطرت اور اس کے وجدانی ذوق کو مخاطب کرتا ہے۔ اور اس کے قلبی احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک خالق اور پروردگار ہستی (خدا) کا اعتقاد تمہارے ضمیر کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ تم اگر اپنے دل کی آواز سن سکو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ خدا کی ہستی کا اعتراف کر رہی ہے۔

---

[1] اقبال نے اس شعر میں اسی صداقت کو بیان کیا ہے:۔

شمع بر خیزد ز اعماق حیات   روشن از نورش ظلام کائنات

اکبر الہ آبادی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا

بس جان گیا میں، تیری پہچان یہی ہے

ماز آدم برسرِ مطلب، اقبال کہتے ہیں کہ

؎ فطرتِ اللہ را نگہبان او است او

یعنی نبی (حضور انور بدرجہ اولیٰ اور اتم مراد ہیں) دین اسلام کا (او ردین اسلام عین فطرت انسانی ہے) نگہبان ہوتا ہے۔ وہ یہ نگہبانی کس طرح کرتا ہے؟ دین اسلام کے تابناک چہرے پر غلط عقاید کی جس قدر گرد وغبار مرورِ ایام سے جم جاتی ہے۔ وہ اس کو دور کرکے فطرت اللہ (دین اللہ) کو حقیقی اور اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بالفاظ واضح تر خدا کا دین انسانوں کی کجروی کی بنا پر مسخ ہو چکا تھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ قرآن اسے ازسرنو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور چونکہ یہ کتاب زندہ قیامت تک فطرت اللہ کی نگہبانی کرتی رہے گی اس لئے آپ بجا طور پر نگہبان فطرت اللہ ہیں۔

پانچویں خصوصیت:۔ ؎ حکمتش برتر ز عقل ذوفنون۔

نبی کی حکمت عقل سے برتر ہوتی ہے یعنی نبی ان حقائق کی تعلیم دیتا ہے۔ جو بذریعہ عقل معلوم نہیں ہو سکتے مثلاً خدا، ملائکہ، آخرت، حشر و نشر وغیرہ۔ حکمت نبوی "برتر" اس لئے ہوتی ہے کہ وہ وحی سے ماخوذ ہوتی ہے اور وحی، عقل سے برتر ہوتی ہے بلکہ

؎ چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کہاں عقل انسانی جو ہر وقت غلطی کرتی رہتی ہے اور کہاں وحی یزدانی جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے۔

دوسرا مصرع آسان ہے مطلب یہ ہے کہ اسکی تعلیم کی بدولت دنیا میں ایک قوم پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جو لوگ اس کے دین میں داخل ہوتے ہیں وہ منکرین کے مقابلہ میں ایک مستقل جماعت (امت) بناتے ہیں بالفاظ دیگر اہی قومیت کی بنیاد، وطن، زبان، نسل، رنگ یا جغرافیائی حدود پر رکھنے کے بجائے دین (عقیدہ توحید) پر رکھتا ہے اس لئے جو لوگ اس کی تعلیم قبول کرتے ہیں وہ خود بخود ایک مستقل قوم (امت) بن جاتے ہیں۔

چھٹی خصوصیت:۔ نبی حکمران تو ہوتا ہے مگر وہ عام مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے وہ نظام ملوکیت قائم نہیں کرتا ہوا سے تخت و تاج کی ضرورت لاحق ہو وہ تو دنیا میں اللہ کے قوانین کو نافذ کرتا ہے اور خدا کی نظر میں سب انسان یکساں ہیں اس لئے نبی یا اس کا جانشین، نہ تخت پر بیٹھ سکتا ہے نہ تاج سر پر رکھ سکتا ہے۔

ساتویں خصوصیت:۔ ع از نگاہش فرودیں خیزد ز دے اُمم

فرودیں کنایہ ہے موسم بہار سے اور دے کنایہ ہے موسم خزاں سے بہار کنایہ ہے۔ عروج اور خوش نصیبی سے۔ خزاں کنایہ ہے تباہی اور زوال سے مطلب یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں غیر معمولی تاثیر ہوتی ہے۔ وہ ایک مایوس اور ناکام انسان کو ایک نگاہ میں پُر امید اور کامراں بنا سکتا ہے یعنی انسانوں کی زندگی میں انقلاب عظیم برپا کر سکتا ہے۔

مثلاً ابن خطاب رضؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنیکے ارادے سے حضرت ارقمؓ کے دروازہ پر دستک دی تھی چونکہ شمشیر بکف تھے اس لئے صحابہؓ کو تشویش لاحق ہوئی مگر سید الشہداء حضرت حمزہؓ نے فرمایا دروازہ کھول دو۔ اگر وہ کسی فاسد ارادہ سے آیا ہے تو انشاء اللہ اُسی کی

تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا :

جب حضرت عمر اندر داخل ہوئے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور ان کی طرف دیکھا۔ یوں سمجھو کر ایک نگاہ ڈالی۔ جس نے عمر کی کایا ہی پلٹ دی۔ اور فرمایا۔ عمر! کیوں آئے ہو؟ عمر کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔ اور ہمہ تن اطاعت و انقیاد بن کر کہنے لگے۔

آپ پر ایمان لانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

اگر یہ فیضان نظر نہ تھا۔ تو پھر فرائڈ اور ایڈلر کے متبعین اس محیر العقول حادثہ (PHENOMENON) کی کیا نفسیاتی توجیہ پیش کریں گے؟ وہ قتل کی نیت سے آئے تھے۔ تو حلقہ بگوش کیسے ہو گئے؟

نوٹ :۔ نبی تو خیر بہت بڑی چیز ہے مورد انعام و اکرام، مہبط وحی و الہام معصوم عن الخطاء منبع صدق و صفا! نبی کے ادنیٰ غلاموں کی نگاہ میں بھی (نبی کی توجہ کی بدولت) یہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ

از نگاہش فرو دین بخرد و زدے
درد ہر خم تلخ تر گرد و نے

اب دوسرے مصرعہ کا مطلب لکھتا ہوں :

درد بمعنی تلچھٹ، کنایہ ہے بیکار بے قیمت اشیاء یا افراد سے۔ تلخ تر بمعنی زیادہ قیمتی (تلخی ہی شراب کی خوبی ہے اسی پر اس کی قدر و قیمت موقوف ہے۔ جتنی تلخ ہو گی اتنی ہی نشہ آور ہو گی)

مطلب یہ ہے کہ اس کی نگاہ کی تاثیر سے ناکارہ اور بے قیمت افراد (کفار) نہایت مفید اور کارآمد بلکہ قیمتی افراد بن جاتے ہیں (صحابہ کرام رض)

ساتویں خصوصیت :۔ درس لاخوف علیھم می دہد۔ ۶ ھ

بھی اپنی جماعت کے افراد کو غیر اللہ کے خوف سے آزاد کر دیتا ہے۔

کیونکہ اس کا پہلا سبق یہ ہوتا ہے کہ زندگی اور موت نفع اور نقصان عزت اور ذلت یُسر اور عُسر فراخی اور تنگی تونگری اور افلاس رزق کی فراوانی یا کمی، اعطائے اولاد ذکور یا اناث یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا کسی انسان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کسی انسان میں کسی انسان کو نہ نفع پہنچانے کی طاقت ہے نہ نقصان پہنچانے کی۔

جب انسان کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی میں کوئی قدرت نہیں ہے تو وہ سب سے منہ موڑ کر اللہ کا ہو جاتا ہے اور جب وہ اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کا ہو جاتا ہے قرآنی اصطلاح میں اسے مقام ولایت کہتے ہیں اور اولیاء کی شان بمطابق قرآن یہ ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۱۰ — ۶۲)

آگاہ ہو جاؤ کہ بلاشبہ جو لوگ مرتبہ ولایت پر فائز ہو جاتے ہیں ان کی زندگی خوف اور حزن ان دونوں آفتوں سے پاک ہو جاتی ہے یعنی وہ دنیا اور عقبیٰ دونوں میں، ان دونوں مصیبتوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

غور سے دیکھو تو ہر انسان (باستثنائے اولیاء اللہ) از بدو شعور تادم وفات انہی دو آفتوں میں گرفتار رہتا ہے اور انہی کی وجہ سے اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ زندگی کی ساری تلخی عبارت ہے انہی دو بلاؤں سے۔ اگر یہ دو آفتیں نہ ہوتیں تو کسی انسان کو جنت کی آرزو نہ ہوتی یہی دنیا جنت بن جاتی۔ آخر جنت

ؔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب لکھا ہے ؎

دل میں تو صنعت عقیدت کو کبھی راہ نہ دے
کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

ہیں وہ کیا شئی ہے جو دنیا میں نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اطمینان قلب (شانتی) اور مسرت نہیں ہے۔ بالفاظ دگر، دنیا اور جنت میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ جنت میں نہ کسی کو خوف ہوگا نہ حزن ہوگا۔ چنانچہ جو لوگ زمرۂ اولیا میں داخل ہو جاتے ہیں ان کے لئے یہی "دکھ بھری" دنیا جنت بن جاتی ہے۔

سب سے پہلے خوف اور حزن کے اسباب واضح کرتا ہوں پھر ان کے ازالہ کی صورت بیان کروں گا۔

(الف) ہر انسان (بادشاہ و دلی) صاحب اقتدار افراد کو مالک نفع و ضرر سمجھتا ہے اس لئے ان سے ڈرتا ہے مبادا وہ کسی وجہ سے ناراض ہو جائیں تو مجھے نقصان (ضرر) پہونچا دیں گے ضرر کی مختلف صورتیں ہیں:۔

(۱) مجھے قتل کرا دیں گے۔

(۲) جیلخانہ بھجوا دیں گے

(۳) مالی نقصان پہونچا دیں گے۔

(۴) ذلیل و رسوا کر دیں گے

(۵) ملازمت سے محروم کر دیں گے۔ وقس علیٰ ھذا

اس کے علاوہ ہر انسان بہت سے توہمات (imaginary fears) میں گرفتار رہتا ہے یعنی وہ ڈرتا رہتا ہے کہیں

(۱) میری محبوبہ مجھ سے خفا نہ ہو جائے۔

(۲) میری دولت ضائع نہ ہو جائے۔

(۳) میری کھیتی نہ اجڑ جائے یا زمین دریا برد نہ ہو جائے۔

لہ اس تعلیم کا موازنہ بودھ دھرم سے کرو جس کی بنیادی تعلیم یہ ہے۔
سَرْوَم دُکھم یعنی یہ ساری کائنات دکھ سے عبارت ہے۔

(۴) میں نے جو روئی چار روپے من خریدی ہے کہیں اس کا بھاؤ نہ گر جائے ۔

وقس علیٰ ھذا!

خوف کی تیسری قسم یہ ہے ۔ کہ ہر انسان دانستہ نادانستہ ہر روز گناہوں کا ارتکاب (خدا کی نافرمانی) کرتا رہتا ہے ۔ اس لیئے ہر وقت یہ خوف اس کے تحت الشعور میں کارفرما رہتا ہے ۔

(۱) میں نے جو رشوت لی ہے کہیں اس کا علم میرے افسروں کو نہ ہو جائے

(۲) میں نے حکومت کو فریب دیکر جو پرمٹ حاصل کیا ہے اس کا راز فاش نہ ہو جائے[1]

(۳) میں نے ناجائز طریقے سے جو دولت جمع کی ہے کہیں اس کا علم حکومت کو نہ ہو جائے ۔

(۴) میرے جھوٹ ، میری خیانت ، میرے فریب ، میری عیاری کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے ۔ وقس علیٰ ھذا!

خلاصہ کلام اینکہ جس شخص کا رابطہ اللہ تعالےٰ سے استوار نہیں ہوتا وہ ہر وقت

---

[1] خدا نے ہر شخص کو ضمیر کی نعمت سے نوازا ہے تاکہ وہ قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکے کہ میں نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا تھا ۔ جب ہم کسی بُرے (یا اچھے) کام کا ارادہ کرتے ہیں تو ضمیر باطنی قوت ہمیں متنبہ کر دیتی ہے کہ یہ کام اچھا نہیں ہے اور جب ہم اس بُرے کام کے مرتکب ہو جاتے ہیں تو ہمارا دل چپکے سے ہم سے کہتا ہے کہ یہ کام اچھا نہیں کیا ۔

کانٹ اس اخلاقی حاسّہ یا قانون کو خدا کی ہستی پر موثر ترین دلیل قرار دیتا ہے ۔

"THE STARRY HEAVENS ABOVE ME AND THE MORAL LAW WITHIN ME"

یعنی خارج میں نظام کائنات اور باطن میں اخلاقی قانون (ضمیر کی آواز) خدا کی ہستی پر دو سب سے بڑے گواہ ہیں ۔ ۱۲

کسی نہ کسی قسم کے خوف میں مبتلا رہتا ہے گویا زبانِ حال سے کہتا رہتا ہے۔

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

(ب) ہر انسان (باستثنا وحی) جس طرح آئندہ حوادث، مصائب اور آفات سے خوفزدہ رہتا ہے اسی طرح زمانہ ماضی میں جو غلطیاں، حماقتیں اور نادانیاں اس سے سرزد ہو چکی ہیں۔ اور جن کے نتائج اس کے حق میں بہت مضرت رساں نکلے ہیں ان پر کفِ افسوس ملتا رہتا ہے پچھتاتا رہتا ہے رنجیدہ اور ملول رہتا ہے ان کیفیات کو قرآن نے حُزن سے تعبیر کیا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ ہر دنیادار (جو حق کی مشیت پر ایمان نہیں رکھتا اور اسے مدبر و منظم کائنات یقین نہیں کرتا) خوف اور حُزن ان دو بلاؤں میں گرفتار رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے لیکن نبی ان دونوں باتوں کا ازالہ کر دیتا ہے تو اس طرح کہ وہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ

(۱) مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (۵۷ - ۲۰)

اے لوگو! نہیں پہنچتی کوئی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں مگر وہ لکھی ہے ایک کتاب میں (یعنی مقدر ہو چکی ہے علم الٰہی میں) قبل ازیں کہ ہم پیدا (ظاہر) کریں اس کو۔ بلاشبہ یہ بات اللہ پر آسان ہے تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے فوت ہو جائے اور نہ اتراؤ اس پر جو وہ تمہیں عطا کرے۔

یہ آیت نصِ صریح قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے اس بات پر کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خالقِ کائنات کی مشیت کے مطابق ہو رہا ہے

الغرام :۔ انتظام کائنات صرف اسی کے قبضہ قدرت میں ہے کسی مخلوق کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ تمام واقعات و حوادث قبل ظہور علم ازلی میں مقدر ہو چکے ہیں اللہ تو فرماتا ہے کہ جس طرح ہم نے یہ کائنات اپنی مرضی سے پیدا کی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی مرضی کے مطابق اسے چلا رہے ہیں[1] چونکہ ہم علیم بھی ہیں اور قدیر بھی اس لئے پہلے جانتے ہیں پھر اس علم کے مطابق ہی پیدا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تقدیری امور ہمارے لئے بالکل آسان ہیں لہذا تمہارے اطمینان کے لئے ہم تمہیں بتلائے دیتے ہیں کہ چونکہ سب کچھ ہماری مشیت کے مطابق ہو رہا ہے اس لئے۔

(الف) جو مصیبت تم پر نازل ہو مثلاً جوان بیٹا مر جائے یا جو نقصان تمہیں پہونچے مثلاً گودام میں آگ لگ جائے اس پر رنج مت کرو۔

(ب) جو راحت تمہیں نصیب ہو مثلاً تم ایک مفلوک الحال سپاہی کے گھر پیدا ہوئے مگر جوان ہو کر احمد شاہ ابدالی بن جاؤ تم اس عروج کو اپنی کوشش یا دانائی کا نتیجہ قرار دے کر فخر مت کرو ہم نے تمہیں اپنی مشیت کے مطابق ادنیٰ سے اعلیٰ بنا دیا۔

(۲) قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَاۚ هُوَ مَوْلٰنَاۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (۹ ـ ۵۱)

اے رسول! آپ ان منافقوں سے کہہ دیجئے (کہ تم جو ہماری مصیبت پر زبان طعن دراز کرتے ہو کہ اگر ہم تمہارے کہنے پر چلتے تو مصائب سے محفوظ رہتے پر تمہاری

---

[1] اکبر الہ آبادی نے اسی مضمون کو یوں پورا ادا کیا ہے

مفت کیوں اپنی جان کھوتا ہے

جو خدا چاہتا ہے۔۔۔ ہوتا ہے

حمایت پر دلیل ہے حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ہرگز نہیں پہنچے گی کوئی مصیبت مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لئے پہلے ہی سے مقدر کر دی ہے وہی ہمارا آقا اور مالک ہے۔ اور (ہم) ایمان والوں کو اللہ ہی پر توکل (بھروسہ) رکھنا چاہیے۔

(۳) قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ

اے رسول! آپ ان منافقوں سے جو اپنی حماقت کی وجہ سے آپ پر یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ اگر آپ مدینہ ہی میں رہ کر جنگ کرتے تو جو مسلمان دامن کوہ احد میں شہید ہوئے وہ شہید نہ ہوتے، کہہ دیجئے کہ اگر تم جان بچانے کے لئے اپنے گھروں کے اندر بھی چھپ کر بیٹھ جاتے تو بھی جن لوگوں کے لئے قتل ہونا مقدر ہو چکا تھا وہ گھروں سے اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل کھڑے ہوتے (۳ ۔ ۱۵۴)

(۴) وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔ (۳ ۔ ۱۴۵)

اور نہیں مر سکتا کوئی شخص مگر اللہ کے حکم سے اپنے وقت مقرر پر۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی موت کا وقت معین کر دیا ہے اس میں نہ تاخیر ہو سکتی ہے نہ تقدیم۔

(۵) اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ط (۱۳ ۔ ۲۶)

اللہ ہی روزی فراخ کرتا ہے جس کی چاہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کی چاہے۔ مطلب یہ ہے کہ کشادگی اور تنگی مقدر ہو چکی ہے۔

(۶) تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط (۳ ۔ ۲۶)

اے خدا! تو جسے چاہے اسے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے اسے ذلت دیتا ہے ہر قسم کی خیر تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہے۔

(۷) يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ط يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝

اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جسے چاہے لڑکیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے (۴۲ ۔ ۴۹)

اس قسم کی آیتیں تو بہت سی ہیں مگر ایضاح مقصد کے لئے یہی کافی ہیں۔ اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ

(ا) موت اور زندگی اللہ کے اختیار میں ہے وقت سے پہلے نہ کوئی شخص مر سکتا ہے اور نہ کوئی شخص کسی کو مار سکتا ہے۔[1]

(ب) نزول مصائب اس کے اختیار میں ہے کوئی شخص دوسرے کو اپنی مرضی سے نہ مبتلائے مصائب کر سکتا ہے نہ راحت پہنچا سکتا ہے۔

(ج) رزق میں کمی یا بیشی اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ کوئی شخص دوسرے کی روزی نہ چھین سکتا ہے نہ اس میں زیادتی یا کمی کر سکتا ہے۔

(د) عزت اور ذلت اس کے اختیار میں ہے۔

(ہ) اولاد عطا کرنا اس کے اختیار میں ہے۔

(و) نفع اور ضرر اس کے اختیار میں ہے۔

(ز) صحت اور مرض اس کے اختیار میں ہے۔

جب یہ تمام حقائق اللہ کے کلام سے ثابت ہیں تو جو شخص اس پر ایمان رکھتا ہے وہ نہ دوسروں سے ڈرے گا نہ کسی نقصان پر رنجیدہ ہوگا۔ جو شخص دوسروں سے ڈرتا ہے وہ در اصل اُن کو مالک اختیار اور فاعل حقیقی سمجھتا ہے۔ حالانکہ بقول غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ لا فاعل فی الحقیقة الا اللہ یعنی درحقیقت اللہ کے سوا کوئی فاعل نہیں ہے اگر افعل کی قوت

---

[1] یہی صداقت تو حضرت عالمگیر کے سامنے تھی۔ جو انہوں نے دوران محاصرہ قندھار میں چلتے تیروں کی بارش میں نہایت اطمینان کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی تھی دشمن نے انہیں تاک تاک کر اپنے تیروں کا نشانہ بنانا چاہا۔ مگر انہیں مطلق گزند نہ پہنچا۔ مٹکے رہتے تو پچاس سال تک حکمرانی مقدر تھی ہرگز نہ وہ مر سکتے تھے اور نہ کوئی انہیں مار سکتا تھا۔ دیکھو فتوح الغیب مقالہ سوم۔

عطا نہ کرے تو کسی سے کوئی فعل بعرز دہی نہیں ہوسکتا چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے۔

مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۵ (۱۸ ۔ ۴۰)

جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے جب تک اللہ کسی کو قوت عطا نہ کرے کسی میں کوئی قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔

ایک شخص حضرت شیخ شیوخ عالم بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی کہ میرے لئے بادشاہ کو سفارشی خط لکھ دیجئے حضرت نے حسب ذیل خط لکھ کر اسے دیا۔

اے بادشاہ! میں نے اس شخص کی حاجت سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کی بعد ازیں تجھ سے بیان کرتا ہوں اگر تو اس کی حاجت پوری کر دے گا۔ تو دراصل معطی اللہ (عطا کرنے والا یعنی حاجت روا) ہے۔ تو مشکور ہوگا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو دراصل مانع اللہ (روکنے والا) ہے اور اس صورت میں تو معذور ہوگا۔ والسلام"

اس خط کے مضمون سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت کی نگاہ میں جب تک اللہ نہ چاہے کوئی انسان نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔

اس آیت کا مضمون دنیاوی زندگی کے علاوہ اخروی زندگی پر بھی حاوی ہے یعنی مومنوں کو قیامت کے دن نہ خوف ہوگا نہ حزن۔ چونکہ دنیاوی زندگی میں انہوں نے احکام الٰہی کی تکمیل کی۔ اور اس کی مشیت پر راضی رہے اس لئے قیامت میں اللہ ان سے راضی ہو جائیگا۔ جیسا کہ خود قرآن فرماتا ہے:۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (۹۸ ۔ ۸)

قیامت کے دن اللہ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہونگے یہ صورت حال اس شخص کے لئے ہے جو دنیاوی زندگی میں اپنے رب کی نافرمانی سے

ڈرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ جس بندے سے اللہ راضی ہو گیا اسے نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

آٹھویں خصوصیت: ع عزم و تسلیم و رضا آموز دش

اس سے پہلے اقبال نے یہ لکھا ہے:۔

ع مومن از عزم و توکل قاہر است

عزم کی وضاحت اس مصرع کی شرح میں ہو چکی ہے تسلیم و رضا کی وضاحت آئندہ فصل کے اس شعر کی شرح میں کی جائے گی:۔

مصطفےٰ داد از رضائے او خبر

یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ تسلیم و رضا دراصل توکل کا نتیجہ ہے توکل کا مفہوم یہ ہے۔ کہ مومن اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ نے مجھے عزم کی قوت عطا کی ہے۔ اور عمل کا اختیار دیا ہے اسلئے میرا یہ فرض ہے کہ جہاد کا عزم کروں۔ (جہاد عمل کی اعلیٰ صورت کا نام ہے) اور اس محدود اختیار کی بنا پر اپنے عزم کو عملی جامہ پہناؤں۔ عمل تو میرے اختیار میں ہے مگر کامیابی حاصل کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے اس لئے یہ بات میں اللہ کے فضل و کرم پر چھوڑتا ہوں۔ اس کی مرضی ہوگی تو کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

اگر میں کامیاب ہو گیا تو یہ اس کا فضل ہے اگر نہ ہوا تو راضی برضا ہوں خدا نے مجھے جہاد کا حکم دیا ہے یعنی عمل کا مکلف ٹھہرایا ہے لہٰذا میرا کام جہاد کرنا ہے۔ نتیجہ (کامیابی پانا کا مجھ) اس کے اختیار میں ہے قیامت کے دن مجھ سے یہ سوال تو ضرور ہوگا کہ جہاد کیوں نہیں کیا۔ جبکہ ہم نے تجھے جہاد کی قوت عطا کی تھی۔ لیکن یہ سوال نہیں ہوگا کہ کامیابی کیوں نہیں حاصل کی۔

الغرض مومن عزم کے بعد خدا پر توکل کر کے سرگرم جہاد ہو جاتا ہے اس کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیتا ہے بس یہی شیوہ تسلیم و رضا ہے یعنی وہ ہر حال میں راضی

رہتا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا۔ تو بھی شکر بجا لاتا ہے اور اگر شہید ہو گیا۔ تو بوقت شہادت زبانِ حال سے یوں کہتا ہے:

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

سلطان ٹیپو شہید کی زندگی شیوۂ تسلیم و رضا کی ایک روشن مثال ہے۔ اس نے اسلام کی سربلندی کے لئے حتی المقدور کوشش کی۔ اللہ نے جس قدر اختیار اسے دیا تھا۔ اس سے کام لے کر اس نے دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کیا لیکن مشیتِ ایزدی یہی تھی۔ کہ وہ شہید ہو جائے۔ اس لئے اس نے اللہ کی مشیت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور شہادت کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ اس کا بھروسہ مادی اسباب پر نہیں تھا۔ بلکہ خدا پر تھا۔ اسی کو توکل کہتے ہیں اور توکل سے مومن میں شانِ تسلیم و رضا پیدا ہو جاتی ہے۔

نویں خصوصیت: ع من نمی دانم چہ افسوں می کند

مطلب یہ ہے کہ نبی اپنی روحانی طاقت کی بنا پر ان لوگوں کے اندر جو اس کی معیت اختیار کرتے ہیں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیتا ہے بلکہ انہیں نئی زندگی عطا کر دیتا ہے اس کی صحبت میں یہ تاثیر ہوتی ہے۔ کہ ناکارہ (خزف) افراد مفید خلائق (دُر) بن جاتے ہیں اور اس کی تعلیم نادانوں (تہی) کو دانا (پُر) بنا دیتی ہے۔

دسویں خصوصیت: ع بندہ درماندہ را گوید کہ خیز

نبی اپنی روحانی طاقت کی بدولت اپنی جماعت کے افراد میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شمشیر بکف ہو کر تمام معبودانِ باطلہ کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔

مثال درکار ہو تو صحابہ کی زندگیوں کا مطالعہ کافی ہو گا اسلام لانے سے پہلے

وہ "خروف" اور "تیغی" تھے۔ لیکن فیض صحبت سے ان کے اندر ایسا انقلاب پیدا ہو گیا۔ انہوں نے ساری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

مرد حق یعنی مسلمان سے خطاب :۔ اب اقبال مرد حق سے خطاب ہو کر کہتے ہیں

(۱) اے مرد حق! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت اختیار کر کے یعنی آپ کی تعلیمات پر عمل کرنے سے تجھ میں یہ طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ تو سبحان کا نی الاعلیٰ کہہ کر اس دیر کہن کے افسوں کو باطل کر دے۔

افسون دیر کہن سے مراد ہے۔ دنیا اور اس کی لذات اور دلچسپیاں جب ایک شخص دنیا کو مقصود بنا لیتا ہے تو قرآنی زاویہ نگاہ سے وہ دنیا اس کی معبود بن جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن کی تعلیم یہ ہے۔ کہ

(ا) ہر محبوب انسان کا مقصود ہو جاتا ہے۔

ب اور ہر مقصود اس کا معبود بن جاتا ہے۔

محبوب سے مراد ہے مطاع یعنی معبود وہ ہے جس کی اطاعت کی جائے اور جس کو راضی کرنے اور راضی رکھنے کی کوشش کی جائے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں امتحان کی غرض سے بھیجا ہے۔ امتحان کی صورت یہ ہے کہ اس نے انسان کے دل میں عورت اور دولت کی محبت رکھ دی ہے اور اس کے بعد یہ حکم دیا ہے کہ میری محبت کو ان کی محبت پر غالب اور فائق رکھو یعنی جب ان دونوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کا موقع آئے تو عورت اور دولت دونوں کو میری محبت پر قربان کر دو۔ جسے شریعت کہتے ہیں دراصل اس امتحان کا نصاب (COURSE) ہے جب ایک شخص اسے باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیتا ہے تو یہ طریقت ہے۔

جب وہ امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ معرفت ہے۔

جب اسے کامیابی کا ثمرہ حاصل ہوتا ہے تو یہ حقیقت ہے۔

اب میں آیات قرآنی سے اپنے دعویٰ کو مبرہن کرتا ہوں۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝

آراستہ کی گئی ہے انسانوں کے لئے محبت آرزوہائے نفس کی (اب نفسانی خواہشات کی تفصیل شروع ہوتی ہے مثلاً عورتیں بیٹے سونے چاندی کے جو تُنے جمع کردہ شدہ خزانے (قیمتی) گھوڑے اور چارپائے اور کھیتی یہ ہے (کل) متاع دنیاوی زندگی کی۔ اس کے مقابلے میں بہترین ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ (۳-۱۴)

مذکورہ بالا آیت کے ساتھ اس آیت کو بھی مدِ نظر رکھو۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

ایماندار دل کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں اشد ہوتے ہیں یعنی انہیں دنیاوی اشیا (عورت دولت اور زمین) کے مقابلہ میں اللہ کی محبت زیادہ شدید ہوتی ہے۔

اب پہلی آیت سے حسب ذیل حقائق واضح ہوسکتے ہیں۔

(۱) انسان کے دل میں عورت اور دولت کی محبت فطری ہے اسکی پیدا کردہ نہیں ہے خدا نے اس کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ زن، زر اور زمین سے محبت کرتا ہے۔

(۲) دنیا انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے قرآن نے چھ چیزیں بیان کی ہیں۔ میں نے ان کو تین چیزوں میں محدود کر دیا ہے۔

(۳) اللہ کے پاس اس دنیا سے بہتر ٹھکانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تو انسان سے فرماتا ہے کہ

(الف) ہم نے خود دنیا کی محبت تیرے دل میں پیدا کی ہے۔

(ب) لیکن اب ہم تیرا امتحان لیتے ہیں وہ اس طرح کہ آرزوئے نفس (شہوات) پر ہماری آرزو (محبت) کو غالب اور فائق رکھ یعنی ہماری محبت کے مقابلہ میں زن زر اور زمین تینوں کو قربان کر دے۔

اگر تو ایسا کرے گا تو ہم تجھے متاع دنیوی سے بہتر تحفہ عطا کریں گے یعنی ہماری خاطر سے دنیاوی زندگی میں اپنی خواہشات نفسانی کو ہمارے احکام (شریعت) پر قربان کر دو۔ جو ہم کہیں وہ کرو۔ (جو نفس کہے وہ مت کرو) اس کا ثمرہ یہ ملے گا۔ کہ جنت (اخروی زندگی) میں جو تم چاہو گے وہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن نے اس کو یوں بیان کیا ہے۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ٥

اے مسلمانو! یقین رکھو کہ جنت میں (جو حسن المآب ہے) تمہیں ہر وہ شی باسانی ملے گی۔ جس کی تم آرزو کرو گے (یعنی ہر خواہش نفسی پوری ہوگی) اور جو چیز تم طلب کرو گے وہ فوراً تمہیں آملے گی۔

نوٹ:۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے خواجگان چشت نے نفس امارہ کی مخالفت کو شعار زندگی بنا لیا تھا۔ کیونکہ تصوف (طریقت) نام ہی ہے شریعت پر عمل کرنے کا۔

تکاثر اور ہدایہ کا درس دیتا ہے۔

عاشق اس درس کے انتظار پر عمل کرتا ہے۔

بس یہی فرق ہے رازی اور رومی میں اول الذکر اسلام کی خوبیوں پر لیکچر دیتا ہے آخر الذکر اس لیکچر پر عمل کرتا ہے۔

اب مرد حق کا فرض منصبی واضح ہو گیا یعنی اسے لازم ہے کہ اس دیرکہن کے افسوں کو باطل کر دے اگر وہ ایسا کر دے گا تو امتحان میں کامیاب ہو جائیگا

یعنی اپنا مقصد حیات حاصل کر لے گا۔

ابطال کا طریقہ کیا ہے؟ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى کے اقتضا پر عمل کرنا جب مرد حق سر بسجود ہوتا ہے تو یہ کہتا ہے:

سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى

پاک ہے میرا رب اُن تمام عیوب اور نقائص سے جو خاصہ امکان[1] ہیں یا جن کا تصور ہو سکتا ہے اور وہ کامل اور مجموعہ کمالات ہی نہیں ہے بلکہ اعلیٰ یعنی تمام موجودات سے بلند و بالا (معزز اور محترم) ہے۔

اس جملہ میں دو لفظ قابل غور طلب ہیں۔

سُبْحَانَ اور اَعْلٰى

(۱) حق تعالیٰ سبحان ہے یعنی مخلوقات میں جس قدر عیوب اور نقائص پائے جاتے ہیں ان سب سے پاک (منزہ) ہے بالفاظ دگر وہ کامل ہے بلکہ منبع ہر کمال (مصدر ہر جمال) ہے۔

(۲) وہ اعلیٰ ہے وہ تمام مخلوقات سے اونچا اور بلند ہے یعنی اس عالم امکان (کائنات) میں نہ کوئی مدمقابل ہے نہ ہمسر وہ ہر بلند سے بلند تر ہے ہر قوی سے قوی تر ہے ہر حسین سے حسین تر ہے ہر قاہر سے قاہر تر ہے۔

---

[1] میں نے بامقصد اس جگہ منطق کی اصطلاح لکھ دی اس لیے اس کی تشریح ضروری ہے واضح ہو کہ امکان وجوب کی ضد ہے حق تو واجب الوجود ہے اور یہ کائنات ممکن الوجود ہے ہر ممکن مخلوق میں عیوب اور نقائص پائے جاتے ہیں اسی لئے کہتے ہیں کہ

بے عیب ذات تو صرف خدا کی ہے۔

ممکن میں سب سے بڑا عیب اور نقص تو یہ ہے کہ وہ اپنے وجود میں واجب کا محتاج ہوتا ہے

اب چونکہ وہ سبحان بھی ہے اور اعلیٰ بھی۔ اس لئے عقل کا تقاضا یہ ہے کہ زن زر اور زمین کے مقابلہ میں اسی کو اپنا محبوب و مطلوب و مقصود بنایا جائے۔ جب یہ عقیدہ دل میں جاگزیں ہو جائے تو دنیا کی محبت خود بخود دل سے نکل جائیگی اس لئے اقبال نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اے مرد حق سبحان ربی الاعلیٰ کی ضرب سے اس دنیا کی محبت اپنے دل سے نکال دے۔

(۲) فقر خواہی از تہی دستی منال۔

پہلے شعر سے ربط یہ ہے کہ

ابطال فسون دیر کہن، مرد حق کا مقصد حیات ہے۔

اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر شان فقر پیدا کرے۔

اس کے بغیر دنیا کی محبت دل سے نہیں نکل سکتی۔

۱؎ واضح ہو کہ جب تک انسان یہ عقیدہ نہ رکھے کہ اللہ کے سوا کوئی موجود حقیقی نہیں ہے (لاموجود الا اللہ) اس وقت تک وہ عورت اور دولت اور زمین کو چھوڑ کر اور جملہ لذات دنیوی سے منہ موڑ کر اللہ کو اپنا محبوب بنا ہی نہیں سکتا۔ میں اس مسئلہ پر اپنی تجزیہ تصنیف اقبال اور تصوف میں شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کرونگا انشاءاللہ اس جگہ صرف اس قدر لکھتا ہوں کہ اسی مقصد کو حاصل کرنیکے لئے سالک حسب ذیل مراقبات کی منزلوں سے گزرتا ہے (مراقبہ کہتے ہیں تصحیح خیال کو)

لاالٰہ الا اللہ ۔ لامقصود الا اللہ ۔ لافاعل فی الحقیقۃ الا اللہ

لامؤثر فی الوجود الا اللہ ۔ لاموجود الا اللہ

نوٹ: اقبال نے بھی اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چساں مومن کند پوشیدہ را فاش

ز لاموجود الا اللہ دریاب

(ارمغان حجاز)

چونکہ ابطالِ فنون کے لئے تفرقہ شرط اولین ہے اسلئے بطور دفع دخل مقدر اقبال ہم سے یہ کہتے ہیں کہ حصولِ مقصد کے لئے تمہیں مسلک فقر پر گامزن ہونا پڑے گا۔ اور اس مسلک میں تہی دستی سے دو چار ہونا یقینی ہے اس لئے میں تمہیں پہلے ہی سے متنبہ کرتا ہوں کہ اگر خدا کی محبت میں فاقوں کی نوبت آجائے تو آزردہ مت ہونا کہ

؎ عافیت در حال دے نے در جاہ و مال

عافیت حال میں ہے نہ کہ جاہ و مال میں۔ اس مصرع میں عافیت اور حال دو لفظ غور طلب ہیں۔

عافیت ایک کثیر المعانی لفظ ہے اس میں جسمانی اخلاقی تمدنی معاشی اور روحانی تمام خوبیاں پوشیدہ ہیں اسی لئے ہر شخص طالب عافیت ہوتا ہے اس لفظ کے معانی ہیں صحت کاملہ، سلامتی، حفظ و امان، سود و بہبود، فوز و فلاح

---

[1] عجیب بات ہے اللہ نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فاقہ میں مبتلا کیا اور آپ کی سنت کا اتباع تمام اولیا نے بھی کیا۔

جب آپ خندق کھود رہے تھے تو آپ کے شکم اقدس و اطہر پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھئے۔

خود بھی فاقہ سے ہیں اور صحابہ بھی اسی حال میں ہیں مگر جب کدال کی ضرب سے پتھر سے چنگاریں نکلتی تھی تو آپ اپنے عاشقوں سے فرماتے ہیں۔

واللہ میں نے دیکھا۔ کہ کسریٰ کے خزانے اونٹوں پر لدے ہوئے اسی مدینہ کی طرف چلے آرہے ہیں۔ جس کے گرد تم خندق کھود رہے ہو۔

آپ چاہتے تو سارا کوہِ احد بحکم خدا سونے کا ہو جاتا مگر ام المومنین حضرت عائشہ رضی فرماتی ہیں کاشانہ نبوت میں مہینوں چولہا نہیں سلگتا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)

کامیابی اور فارغ البالی۔

حال: تصوف کی اصطلاح ہے۔ جب کوئی شخص اپنے عقاید کے مطابق زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ تو اسے صاحب حال کہتے ہیں مزید وضاحت یہ ہے:۔
زید زبان سے کہتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ لیکن عمل اس کا یہ ہے کہ دولتمندوں اور حکمرانوں کے دروازوں پر جبہ سائی کرتا ہے۔ اُن کو داتا اور مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتا ہے۔ تو وہ شخص صاحب قال ہے۔ لیکن بکر توحید کے اقتضاء پر عمل کرتا ہے اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور کسی کو مالک نفع و ضرر نہیں سمجھتا۔ تو اس کا عقیدہ اس کا حال بن گیا۔ یعنی وہ صاحب حال ہے
فی الجملہ حال سے مراد ہے استقامت علی التوحید یعنی توحید کے اقتضاء پر اس طرح عمل کرنا کہ پوری زندگی اس عقیدہ کی مظہر بن جائے۔

لا الٰہ گوئی، بگو از روئے جاں
تا ز اندام تو آید بوئے جاں
(جاوید نامہ)

مطلب اس مصرع کا یہ ہے کہ اطمینان قلب حال (توحید کے اقتضاء پر عمل کرنے) سے نصیب ہو سکتا ہے نہ کہ دولت سے۔ یا یوں سمجھو کہ کامیابی کا ذریعہ حال ہے۔ نہ کہ دولت۔

نوٹ:۔ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ دولت سے عافیت کے بجائے پریشانی لاحق ہوتی ہے مگر انسان چونکہ پیدائشی طور پر حریص واقع ہوا ہے اسلئے اس کی طرف دوڑتا ہے
اگلے شعر میں اسی شعر کی مزید وضاحت کی ہے کہتے ہیں کہ عافیت تو صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد (ثمرات حال) سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ زر و سیم و قماش سرخ و زرد (جاہ و مال) سے۔

واضح ہو کہ (۱) توحید کے اقتضاء پر عمل نہیں ہو سکتا جبتک اللہ تو سے

شاید قسم کی محبت پیدا نہ ہو جائے۔

(ب) اور جب ایک مسلمان عاشق بن جاتا ہے۔ تو اس میں عشق کی بدولت یہ صفات حسنہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ یعنی صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد

(ج) اور ان صفات عالیہ کی بدولت سالک کو عافیت کی دولت یا نعمت حاصل ہو جاتی ہے۔

(د) اور عافیت، جیسا کہ میں نے ابتدا میں لکھا ہے، وہ حالت ہے۔ جو ہر ذی روح کا مطلوب مقصود اور محبوب ہے۔ دنیا میں ہر شخص عافیت کا طالب ہے۔ اسی کا جویا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس کے حصول کا صحیح طریقہ (دیانت) اختیار کرتے ہیں۔

(ہ) بگذر از کاؤس و کے الخ

یعنی بادشاہوں، حکمرانوں، اور ارباب اقتدار سے قطع تعلق کر کے اپنی خودی کی تربیت میں مشغول ہو جاؤ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ پھر یہ بادشاہ جن کے سلام کے لئے تم جاتے ہو۔ تو دہ تمہارے سلام کے لئے حاضر ہوں گے۔

افسوس ہے کہ تم نے اپنے منصب اور مقام رفیع کو فراموش کر دیا۔ اگر کسی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا چھوڑ دو! تم تو شاہین زادہ ہو اسلئے اپنا رزق خود اپنی قوت بازو سے حاصل کرو۔

نوٹ:۔ بزرگان دین کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین عصر اُن کی قدمبوسی کے متمنی رہتے تھے مثلاً

(۱) التمش (متوفی ۶۳۳ھ) حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ادنیٰ کفش برداروں میں تھا۔ (تفصیل کے لئے دیکھو بزم صوفیہ اور تاریخ مشائخ چشت)

(ب) بلبن نے اپنی بیٹی حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ جو دھنی کے حبالہ

عقد ہی دے دی تھی۔

(ج) سلطان علاؤ الدین خلجی ساری عمر سلطان المشائخ محبوب الٰہی دہلوی رح کی قدمبوسی کا متمنی رہا۔ مگر حضرت نے اسے شرف باریابی عطا نہیں فرمایا۔

(د) سلطان احمد شاہ بہمنی حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو دراز رح کی حاشیہ برداری پر فخر کرتا تھا۔

(ہ) سلطان محمود بیگڑہ (والی گجرات متوفی ۹۱۱ھ) حضرت شاہ عالم رح کی خاک پا کو طوطیائے چشم بنایا کرتا تھا۔

(و) حضرت میاں میر لاہوری رح (المتوفی ۱۰۴۵ھ) نے اپنے مرید خاص ملا شاہ کی سفارش پر شاہجہاں کو حاضر خدمت ہونے کی اجازت دی تھی۔

(ز) حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی (جنہوں نے دوبارہ دکن میں چشتیہ سلسلہ کو فروغ دیا) خلیفہ اعظم شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رح (المتوفی ۱۱۴۲ھ) اصرار پیہم کے باوجود محی السنہ عالمگیر اورنگ زیب جیسے باشرع مسلمان سے ملنے نہیں گئے چنانچہ جب ان کے مرشد کو معلوم ہوا تو انہوں نے تحسین و آفرین کے بعد یہ فقرہ بھی لکھا کہ ہمارے اکابر چشت کبھی کسی بادشاہ سے ملنے نہیں گئے اسی لئے اقبال نے بھی یہ تلقین کی ہے۔ کہ کاؤس اور کے کے سلاطین سے بے نیاز ہو جاؤ۔

(ح) دیگر این نہ آسمان تعمیر کن الخ

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی اطاعت مت کرو۔

"بر مراد خود جہاں تعمیر کردن" کا یہ ہے آزاد زندگی بسر کرو یعنی وہ زندگی جس میں انسان اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکے۔

اس کے بعد اقبال ہمیں "بر مراد خود جہاں تعمیر کردن" کا طریقہ بتاتے ہیں

اور اس فصل کا یہی حصہ بہت غور طلب ہے۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

حاشیہ یہ شعر اس مثنوی کے اہم اشعار میں سے ہے اسکی تشریح ذیل میں ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔

فنا تصوف کی اصطلاح ہے اس سے مراد ہے سالک کا اپنی خواہشات نفسانی کو احکام شریعت کے تابع کر دینا یعنی نفس امارہ کے بجائے اللہ اور اس کے رسول کے حکموں پر عمل کرنا۔

رضائے حق قرآن اور ارشادات رسول میں مندرج ہے اور انہی دو چیزوں کے مجموعہ کا معروف نام شریعت ہے۔ اور تصوف اسی شریعت و رضائے حق پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے۔

جب بندہ اپنی مرضی! اللہ کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے یعنی احکام شریعت پر خلوص کے ساتھ عمل کرتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ بندہ قضائے حق بن جاتا ہے یعنی اس کی مرضی اللہ کی مرضی ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دگر جو وہ چاہتا ہے اُسی کے مطابق ظہور میں آجاتا ہے۔

قضاد شریعت کی اصطلاح ہے اس کے معنی ہیں۔ اللہ کا فیصلہ۔ کہ بندہ مومن قضائے حق شود یعنی پھر اللہ کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو بندہ مومن چاہتا ہے۔ اور جب سالک کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو

چار سوئے با قضائے نیلگوں
از ضمیر پاک او آید بروں

یعنی وہ نئی دنیا پیدا کر دیتا ہے بالفاظ دگر بمراد خود جہاں تعمیر می کند

خواجگان چشت کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے اس شعر کی صداقت بآسانی واضح ہو سکتی ہے۔ مثلاً

جب رائے پتھورا نے سلطان الہند خواجہ غریب نواز کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ اجمیر خالی کر دو۔ ورنہ تمہارا انجام اچھا نہ ہوگا۔ تو حضرت نے حاضرین مجلس سے فرمایا "ما رائے پتھورا را زندہ گرفتار کردہ حوالہ سلطان شہاب الدین غوری کر دیم"۔

یہ الفاظ (جن میں ایک عظیم الشان پیشگوئی مضمر تھی) اس شخص کی زبان سے نکلتے ہیں۔

(۱) جو آنا ساگر کے کنارے ایک شکستہ جھونپڑے پر بیٹھا تھا۔

(۲) جس کے پاس نہ دولت تھی نہ فوج نہ کسی قسم کی مادی طاقت۔

(۳) جو ایک اجنبی ملک میں ایک اجنبی بلکہ دشمن جان و ایمان قوم میں رہتا تھا

(۴) جس کا بظاہر نہ کوئی ہمدرد تھا نہ مددگار نہ رفیق نہ غمگسار۔

لیکن ع گفتہ او گفتہ اللہ بود۔

جو وہ کہتا ہے وہی ہو جاتا ہے یعنی

قبل اس کہ رائے پتھورا اس درویش گلیم پوش کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرے خود اس کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

(نوٹ) چونکہ مستشرقین لفظ فنا کے اصطلاحی مفہوم سے آگاہ نہ تھے اس لئے انہوں نے اس لفظ کا وہ مفہوم مراد لے لیا جس کی تعلیم بودھ دھرم نے دی ہے اور بلا تامل یہ رائے ظاہر کر دی کہ تصوف اسلام بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا دے ان جاہل مستشرقین کی تقلید میں بعض مسلمانوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلامی تصوف بھی غیر اسلامی عقائد سے متاثر ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات

بالکل غلط ہے اسلامی تصوف میں فنا سے مراد فنائے ذات نہیں ہے بلکہ اپنی خواہشات کو شریعت کے تابع کر دینا ہے۔

اس کے بعد اقبال پھر مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

؎ در رضائے حق فنا شو چوں سلف

یعنی جس طرح تیرے اسلاف (بزرگان دین مثلاً خواجگان چشت) نے اتباع رسول کی بدولت اپنی "خودی" کی مخفی صلاحیتوں کو پایہ تکمیل تک پہونچایا (گوہر خود را از صدف بیروں آوردند) اسی طرح تو بھی فناء فی الرسول ہو کر یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کاملہ کی بدولت اس مقام کو حاصل کر۔ اور اسکی صورت یہ ہے کہ

؎ چشم خود روشن کن از نور سرشت

یعنی اپنی فطرت سلیمہ کا مطالعہ کر تجھے معلوم ہو جائیگا کہ حق تعالیٰ نے تیرے اندر کائنات کو مسخر کرنے اور عبدیت کاملہ کے مرتبہ پر پہنچنے کی صلاحیت رکھدی ہے

اس کے بعد حسب ذیل حقائق بیان کئے ہیں۔

(۱) ؎ تا نگیری از جلال حق نصیب الخ

واضح ہو کہ حق تعالیٰ کی شئون منکشفہ میں جلال اور جمال یہ دو شانیں بہت نمایاں ہیں بلکہ تمام شئون کی اصل ہیں۔

چونکہ بندہ مومن مظہر ذات و صفات ہے اسلئے ان دونوں شانوں کا اس میں پایا جانا ازبس ضروری ہے۔ اور اقبال نے اس شعر میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ بندہ مومن کا فرض اولیں یہ ہے کہ وہ اپنے اندر شان جلال پیدا کرے کیونکہ شان جمال کا حصول اس پر موقوف ہے اور جب تک یہ دونوں شانیں جلوہ گر نہ ہوں مومن صحیح معنی میں مظہر حق نہیں بن سکتا۔

شان جلال کو شان جمال پر اسلئے تقدم حاصل ہے کہ لا الٰہ الا اللہ میں

کا پہلے سے الا بعد میں ہے۔ اور اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ لا سے جلال اور الا سے جمال پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی وضاحت آئندہ فصل میں کی جائے گی اسلئے یہاں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۲) ؏ ابتدائے عشق و مستی قاہری است الخ

اقبال نے اس شعر میں پہلے شعر کی وضاحت کی ہے یعنی عشق و مستی (سلوک) کی ابتدا قاہری (جلال) سے ہوتی ہے اور انتہا دلبری (جمال) پر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سالک کے اندر پہلے شان جلالی کا ظہور ہوتا ہے اور اسکے بعد شان جمال ظاہر ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ لا الٰہ الا اللہ کا منطقی نتیجہ یہی ہے چنانچہ جب سالک لا الٰہ کہتا ہے تو وہ ساری کائنات کی نفی کر دیتا ہے۔ یعنی وہ غیر اللہ کا ابطال کر دیتا ہے یہی شان جلال ہے۔ کہ اس کی نگاہ میں کسی شی کی ہستی ہی باقی نہیں رہتی پھر وہ الا اللہ کہتا ہے یعنی وہ ذات حق کا اثبات کرتا ہے یہی شان جمال ہے۔ کہ یہ کائنات اللہ ہی کے سہارے سے یعنی اس کی بدولت موجود ہے۔ (بذات خود معدوم ہے)

اب ان دونوں شانوں کی جلوہ گری سرکار دو عالم اور صحابہ کرام کی زندگیوں میں دیکھیے۔ آپ نے پہلے کفر کو مٹایا اور دین حق کو قائم کیا اس کے بعد آپ کا وجود اہل عالم کے حق میں رحمت بن گیا۔ یعنی پہلے آپ نے مکہ فتح کیا۔ اس کے بعد اہل مکہ کو لا تثریب علیکم الیوم کا مژدہ سنایا۔

در اصل دنیا میں سرکار دو عالم صلعم شان جلال اور شان جمال کے مظہر اتم ہیں آپ کی اتباع کاملہ سے بندہ مومن میں بھی یہ دونوں شانیں جلوہ گر ہو جاتی ہیں جب بندہ مومن کفر کا مقابلہ کرتا ہے تو گویا شان جلال کا مظاہرہ کرتا ہے اور

بسوہ اللہ کے بندوں پر مہربانی کرتا ہے تو شان جمال کا اظہار کرتا ہے۔

اور مومن کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ وہ

(۱) اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرے۔ باطل کو مٹائے (یہ شان جلالی ہے)

(۲) اللہ کے بندوں پر مہربانی کرے انہیں راحت پہونچائے (یہ شان جمالی ہے)

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

(۳) مرد مومن از کمالات وجود
او وجود و غیر او ہر مثنی نمود

اس اہم شعر میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اس کائنات میں صرف مرد مومن پر ظلی اعتبار سے وجود کا اطلاق ہو سکتا ہے اسکے علاوہ کائنات میں جو کچھ ہے (حیوانات، نباتات اور جمادات) اس کی حقیقت "نمود" سے زیادہ نہیں ہے۔

(۱) اس شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ مرد مومن چونکہ وجود کے کمالات سے بہرہ وافر حاصل کر لیتا ہے بالفاظ دگر، کمالات وجود اس کی ذات میں پورے طور سے منعکس (جلوہ گر) ہو جاتے ہیں اس لئے ظلی اعتبار سے اسے موجود کہہ سکتے ہیں یعنی مجازی رنگ میں وجود کا اطلاق اس پر بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض "نمود" ہے جس کی کوئی اصل وحقیقت نہیں ہے۔

(۲) اس شعر میں مرد مومن کمالات وجود، وجود اور نمود غور طلب ہیں۔

میری رائے میں یہ شعر اس مثنوی کے چند مشکل ترین اشعار میں سے ہے۔
اگر اس کی پوری وضاحت کی جائے تو یقیناً ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے

اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا۔

(و) مرد مومن سے اقبال کی مراد وہ شخص ہے جس نے فنا فی الرسول ہو کر حق تو
کی تمام صفات یعنی وجود کے تمام کمالات ظلی طور پر اپنے اندر پیدا کر لئے ہوں

(ب) کمالات وجود) فلسفہ تصوف میں (اور اقبال اسی فلسفہ کے متبع اور مبلغ ہیں)
وجود باعتبار ذات خویش تمام کمالات کا منبع اور مصدر ہے من وجود مطلق کے کمالات کا ظہور ہے اسلئے وہ بھی وجود ہے اور
اسمیں وجود مطلق کے علاوہ اس کے کمالات کا ظل بھی پایا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ کمالات وجود کی بدولت، مومن میں بھی "وجود" کی شان
پیدا ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ اقبال کے شعر میں اجمال ہے اس کی نثر یوں ہوگی۔

ہرگاہ مرد مومن از کمالات وجود بہرہ وافی حاصل می کند۔ بدینوجہ او ہم وجود
می گردد۔ یعنی اطلاق وجود بروروا باشد۔ اگرچہ این اطلاق در مرتبہ ظل می باشد
غیر او ہر شئی (جملہ کائنات) محض نمود است۔

یعنی چونکہ مرد مومن وجود مطلق کے کمالات لامتناہی سے بہرہ وافی حاصل کرتا
ہے۔ حتی کہ وہ وجود مطلق کا ظہور اتم بن جاتا ہے اس لئے اس پر بھی ظلی طور
سے وجود کا اطلاق ہو سکتا ہے اسکے علاوہ ساری کائنات محض نمود ہے۔

(۱) مومن وجود کا ظہور (عکس) ہے: اس لئے وجود ہے۔

(۲) کائنات وجود کی فعالیت کا اثر ہے۔ اسلئے نمود ہے۔

(ج) وجود:- اقبال نے اس لفظ کو اپنی تصانیف میں بکثرت اور مختلف
معانی میں استعمال کیا ہے۔ صرف مثنوی "پس چہ باید کرد" سے
چند مثالیں لکھتا ہوں۔

(۱) ؏ از تو ایں سوز و سرور اندر وجود . ص ۹

یہاں وجود سے کائنات محسوسہ مراد ہے .

(۲) ؏ تا برون آئی ز گرداب وجود ص ۲۰

یہاں وجود سے کائنات مادی مراد ہے

(۳) ؏ از وجود خود نگردد باخبر ص ۱۶

یہاں وجود سے ذات یا شخصیت مراد ہے

(۴) ؏ فکر ما جویائے اسرار وجود ص ۲۰

یہاں وجود سے وجود مطلق (ذات حق) مراد ہے

(۵) ؏ مرد مومن از کمالات وجود

یہاں بھی وجود سے ذات حق مراد ہے .

واضح ہو کہ جب لفظ وجود کو فلسفہ کی اصطلاح قرار دیا جائے . تو اس سے کائنات مراد نہیں ہوتی بلکہ موجودات (کائنات) کی اصل یا ان کا منشا مراد ہوتا ہے اور دنیا میں فلسفہ خالص (مابعد الطبیعات) کے جس قدر مدارس فکر آج تک مدوّن ہوئے ہیں سب کا نقطہ آغاز یہی مسئلہ وجود ہے . یعنی وہ شئے کیا ہے جس سے موجودات سرزد ہوتے ہیں؟ بالفاظ دگر اس کائنات کی اصل کیا ہے ؟

فلسفہ کا جو شعبہ اس مسئلہ سے بحث کرتا ہے اسے اصطلاح میں ONTOLOGY یعنی علم الوجود کہتے ہیں ہندی اور یونانی مدارس فلسفہ سے قطع نظر کرکے صرف مسلمانوں میں اس مسئلہ پر کئی مدارس فکر پیدا ہوگئے . مثلاً پیروان ارسطو (مشائیں)، پیروان افلاطون (اشراقیون) معتزلہ، متکلمین، اشاعرہ اور صوفیہ ان تمام گروہوں نے اپنے اپنے نظریات مرتب کئے ہیں جن کی تفصیل اس شرح

کے دائرہ سے باہر ہے۔ اس لئے چند ضروری اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) جمہور متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ وجود تمام موجودات کیلئے دصف ہے یعنی زائد بر ذات ہے۔ نہ عین ماہیت ہے نہ جز ماہیت ہے بالفاظ دیگر متکلمین وجود کو غیر ذات شئی قرار دیتے ہیں مثلاً زید کی ذات اور ہے وجود اور ہے۔ ذات اصل ہے وجود اس کی ذات کو عارض ہو گیا ہے۔

(۲) مشائین اور معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ وجود بعض موجودات کیلئے وصف ہے اور بعض موجودات کے لئے عین ہے۔

(۳) صوفیہ، اشراقیہ اور اشاعرہ کا مذہب یہ ہے کہ وجود بعض موجودات کے لئے عین ذات ہے یہ اور بات ہے کہ اس عینیت کی تعبیر اور تشریح میں ان تینوں گروہوں میں عظیم الشان اختلاف پایا جاتا ہے جسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے میں ناظرین کی آگاہی کے لئے صوفیہ کی تعبیر ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔

ان حضرات کے نزدیک وجود نہ کلی طبعی ہے نہ معانی مصدریہ ہے۔ بلکہ معنی واحد جزئی حقیقی منحصر در فرد واحد ہے۔ اور واجب ہے اور تمام ممکنات اسی وجود واحد (حق تعالے) کے اظلال و آثار ہیں اقبال نے

مرد مومن از کمالات وجود

میں لفظ وجود کا اسی معنی میں استعمال کیا ہے اس معنی کی تشریح عارف جامی کے الفاظ میں یہ ہے:۔

لفظ وجود را گاہ بمعنی تحقق و حصول کہ معانی مصدریہ و مفہومات اعتباریہ اند اطلاق می کنند و بداں اعتبار در برابر شے امرے نیست در خارج اشیاء ماہیات را عارض می شود در تعقل چنانچہ حکماء و متکلمین تحقیق آں گروہ اند و گاہ وجود می گویند و حقیقتے می خواہند کہ ہستی شے بذات خود است و ہستی باقی موجودات

بودے۔ وفی الحقیقۃ اغیر از وے موجودے نیست در خارج و باقی موجودات عارض وے اند و قائم بوے و اطلاق ایں اسم بر حضرت حق سبحانہ بمعنی ثانی است نہ بمعنی اول۔ (لائحہ چہاردہم)۔

مطلب اس عبارت کا یہ ہے۔ کہ

معنی اوّل:۔ وجود کا ایک مفہوم تو مصدری ہے جس کا ترجمہ بودن ہستی یا ہونے سے کیا جاتا ہے۔ یہ مصدری مفہوم تمام مفاہیم مصدریہ کی طرح ایک اعتباری مفہوم ہے جو خارج میں عقل کے سوا کچھ اور نہیں ہاں ہمی تصور کے اعتبار سے اشیا کو عارض ہو جاتا ہے حکما اور متکلمین نے وجود کو اسی مفہوم مصدری کے پیش نظر اعتباری قرار دیا ہے۔

معنی ثانی:۔ لفظ وجود کا دوسرا مفہوم وہ حقیقت حقہ اور اصلیہ ہے جو بذات خود موجود ہے یعنی اس کی ہستی بذاتہ خود ہے کسی کی محتاج نہیں ہے اور باقی تمام موجودات کی ہستی اس کی بدولت ہے اور فی الحقیقت اس کے علاوہ اور کوئی شئی خارج میں (کائنات میں) موجود نہیں ہے تمام موجودات اسے عارض ہیں۔ اس اسم کا اطلاق حق تعالیٰ پر معنی ثانی میں ہے نہ کہ معنی اول (مفہوم مصدری) میں۔

خلاصہ کلام اینکہ وجود جزئی حقیقی ہے اور فرد واحد میں منحصر ہے جسے اللہ کہتے ہیں جو بذاتہ خود موجود ہے یعنی واجب الوجود ہے اور باقی تمام ممکنات اسی ذات واجب (حق) کی وجہ سے اور اسی کے انتساب کی بدولت موجود ہیں۔ یعنی حق تعالیٰ کا وجود حقیقی اور اصلی ہے باقی تمام ممکنات کا وجود ظلی اور اعتباری ہے

لے لیکن بمکاشفات ارباب شہود
اشیا ہمہ عارض اند و معروض وجود
(جامی)

(د) نمود: یہ لفظ بھی فلسفہ تصوف کی اصطلاح ہے اقبال نے یہاں اسے وجود کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ لہٰذا اس سے مراد ہے وہ شئے جس کا وجود حقیقی اور اصلی نہ ہو بلکہ وہمی ہو یعنی دیکھو تو نظر آسکے مگر غور کرو تو اسکی کوئی حقیقت نہ ہو جیسے آئینہ میں کسی کا عکس کہ دیکھو تو ہے غور کرو تو کچھ بھی نہیں

صورت وہمی بہ ہستی متہم داریم ما

چوں حباب آئینہ بر طاق عدم داریم ما (بیدل)

اب شعر کا مطلب لکھتا ہوں اقبال کہتے ہیں کہ مرد مومن چونکہ وجود مطلق کا مظہر اتم ہے۔ وجود مطلق (ذات حق) کے سارے کمالات اسکی ذات میں منعکس ہیں اسلئے وہ بھی ظلی طور پر موجود ہے۔ وجود کا اطلاق مجازی رنگ میں اس پر بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے سوا کائنات میں جو کچھ ہے نمود کے مرتبہ سے آگے نہیں ہے یعنی کائنات کا وجود محض اور وہمی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اقبال نے اسی مضمون کو بال جبریل میں یوں ادا کیا ہے:

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں

باقی ہے نمود سیمیائی

یعنی کائنات کی حقیقت نمود سیمیائی سے زیادہ نہیں ہے نمود سیمیائی کی مثال وہ حلقہ یا دائرہ آتشیں ہے جو نقطۂ آتشیں کو نہایت تیزی کے ساتھ گردش دینے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ درحقیقت موجود نہیں ہے محض گردش کی بدولت نظر آتا ہے یعنی اس کا وجود محض وہمی ہے۔

علامہ محمود شبستری نے اسی صداقت کو یوں بیان کیا ہے:۔

ہمہ از وہم تست ایں صورت غیر

کہ نقطہ دائرہ است از سرعت سیر

اب رہی یہ بات کہ مرد مومن یعنی انسان وجود مطلق کا مظہر اتم کیوں ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ خود مشیت ایزدی نے (جس میں بحث نہیں ہو سکتی) آدم کو
اس منصب و مقام رفیع کے لئے منتخب فرمایا کما قال اللہ تعالیٰ:۔
وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ط (۲ ۔ ۳۰)
اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔
اگر آدم، خلیفۃ اللہ ہے تو لازمی ہے کہ اس میں اس ذات کے تمام کمالات ظلی
طور پر موجود ہوں جس کی نیابت وہ اس کائنات میں کریگا مثلاً علم، قدرت
ارادہ سمع بصر اور کلام۔ اور سب جانتے ہیں کہ انسان کے علاوہ اور کسی حیوان
میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔
شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی نے اسی مضمون کو اپنی شہرہ آفاق تصنیف
فصوص الحکم کی پہلی فص کی ابتداء میں یوں بیان کیا ہے:۔
لما شاء الحق سبحانہ من حیث اسمائہ الحسنیٰ التی لا یبلغھا الا
حصا ان یریٰ اعیانھا ان شئت قلت ان یری عینہ فی کون
جامع یحصر الامر لکونہ متصفا بالوجود ویظھر بہ سرّہ الیہ
فان رؤیۃ الشئ نفسہ فی نفسہ بنفسہ ما ہی مثل رؤیتہ نفسہ
فی امر آخر یکون لہ کالمرآۃ ۔ ۔ ۔ فاقتضی الامر جلاء مرآۃ
العالم فکان آدم عین جلاء تلک المرآۃ و روح تلک الصورۃ۔
ترجمہ:۔ جب چاہا حق سبحانہ نے باعتبار اپنے اسمائے حسنیٰ کے جن کا شمار نہیں ہو سکتا
یہ کہ دیکھے ان اسماء کے حقائق کو (اسے حق سند ہ کتاب)، اگر تو چاہے تو
یہ بھی کہہ سکتا ہے۔ کہ دیکھے خود اپنی حقیقت کو (یعنی اپنے وجود کی ایک کون
جامع یعنی ایسے وجود میں جو جامع کمالات ہو اور محیط ہو تمام وجود تمام امور اسماء کو بسبب

متصف ہونے والی کونِ جامع کے ساتھ وجود دے ، اور یہ کہ ظاہر ہو اس کی بدولت اس (حق تو) کا بھید ۔ اسی حقیقت کا اس پیرا میں شیخ خود اس نکتہ بلیغ کی وضاحت کرتے ہیں کہ "دیکھنا ایک شخص کا اپنی ذات کو اپنی ذات میں اپنی ذات سے ایسی شئی نہیں جیسے اپنی ذات کو کسی دوسری شئی میں مثلاً آئینہ میں ۔ ۔ ۔ اسے ظاہر ہوتی ہے اس طرح جلوہ گر کی ذات اس کے سامنے پس تقاضا کیا شانِ الٰہی نے کہ آئینہ عالم کو جلا (صیقل) دی جائے پس آدم وہ آئینہ جلاء بنے اس آئینہ کی اور روح ہے اس صورت (کائنات) کی ۔ الخ

اگر میں اس عبارت کی تشریح کروں تو ایک مستقل کتاب مرتب ہو جائیگی اس لئے چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں ۔

(ا) یہ عبارت پیرایہ آغاز ہے فصِ اول کا جس کا عنوان ہے ۔

فصِ الحکمۃ فی کلمۃ آدمیۃ ۔

(ب) اس فص میں انہوں نے اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے ۔

خلافت آدم (انسانی) مظہر الوہیۃ ہے ۔

(ج) حق کا معروف نام اللہ ہے اور الوہیت کی خصوصیت اولین طلبۂ اقتدار ہے بلکہ قوتِ تسخیر ارض و سماء کائنات ایسے جسے صفت الوہیت کا مظہر قرار دیا جائے اس میں جو تسخیر کائنات کی صفت ہے

(د) حق نے اپنے آپ کو دیکھنا چاہا ۔

(ہ) ایک کون جامع میں یعنی ایسے وجود میں جو جامع کمالات ایزدی ہو ۔

(و) حق تعالیٰ تو عین وجود ہیں اور وہ کون جامع متصف بالوجود ہے یعنی چونکہ اس میں وجود باری منعکس ہو رہا ہے وہ مظہر ذات ہے اسلئے اس میں بھی شانِ وجود پیدا ہو گئی ہے ۔

(ز) تا کہ خدا کی حقیقت اس کون جامع میں منعکس ہو کر خود خدا کے سامنے

ظاہر ہو جائے (شیخ نے اسے یوں لکھا ہے۔ کہ سرِ حق، حق کے سامنے ظاہر ہو جائے۔

چونکہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر حق تو اپنے آپ کو آئینہ میں کیوں دیکھنا چاہتا ہے اسلئے شیخ اکبر نے اس کا یہ جواب دیا کہ اپنا حسن و جمال بلا واسطہ دیکھنے میں اور کسی چیز کے ذریعہ سے دیکھنے میں جو جلوہ گر کے سامنے اس کے جلوے کو پیش کرے بڑا فرق ہے۔

(ط) خلاصہ کلام اینکہ جب حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو ایک کونِ جامع میں دیکھنا چاہا۔ تو اس نے فیصلہ کیا کہ آئینہ کائنات کو جلا دی جائے پس آدم جلاءِ آئینہ کائنات اور روحِ صورتِ کائنات ہے جلا کے بعد یہ کائنات آئینہ بن گئی۔ جس میں وہ اپنا جلوہ دیکھ رہے ہیں۔

پوچھتے ہو کہ سرِّ وحدت کیا
واسوا کی جلا حقیقت کیا

باز آمدم بر سرِ مطلب :-

حق تعالےٰ عین وجود ہے۔

چونکہ آدم میں وجود کے تمام کمالات منعکس ہیں۔

اس لئے آدم متصف بالوجود ہے۔

باقی تمام اشیائے کائنات میں چونکہ کمالاتِ وجود منعکس نہیں ہوئے۔

اس لئے ان کی حیثیت نمود سے زیادہ نہیں ہے۔

اب پڑھو اقبال کے اس شعر کو۔

مردِ مومن از کمالاتِ وجود
او وجود و غیر او ہر شی نمود

آخری شعر:۔ گر بگیرد سوز و تاب از لا الٰہ

اس سے پہلے شعر میں اقبال نے یہ بات واضح کی ہے کہ مومن "وجود" ہے
یعنی موجود ہے اور ماسوی "نمود" ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے انسان
نے غلط بینی کی وجہ سے کائنات کو اپنا مقصود بنا لیا ہے اس لئے اس کے
سامنے سر بسجود ہو گیا ہے۔ اگر وہ مومن (موحد) بن جائے اگر وہ لا الٰہ سے
سوز و تاب حاصل کر لے۔ اگر وہ اس حقیقت کا ادراک کر لے (یہ مقام ذکر)
مراقبہ اور مجاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کہ کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے
اگر وہ غیر اللہ کی نفی کر دے (لا الٰہ کا یہی مفہوم ہے) تو اس کائنات پر
حکمران ہو جائیگا۔ یہ مہر و ماہ اس کے تابع فرمان ہو جائیں گے۔

مرضی او مرضی حق می شود

ماہ از انگشت او شق می شود

نوٹ:۔ اقبال نے جو کچھ لکھا ہے وہ پاکان امت مثلاً جامی، عراقی، رومی،
اور شیخ اکبر سے سن کر (ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد) لکھا ہے۔
اس لئے بالکل صحیح لکھا ہے مگر یہ مقام صحبت مرشد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا
جن بزرگوں نے زمان و مکان پر حکومت کی ہے انہوں نے صحبت مرشد
سے اکتساب فیض کیا ہے ۱۲

فصل پنجم
حکمت فرعونی

تعارف :۔ جس طرح کلیم انبیاء کے نمائندے ہیں اسی طرح فرعون اُن سلاطین کا نمائندہ ہے۔ جو اللہ کے بندوں کو اپنی غلامی پر مجبور کرتے ہیں۔ لہٰذا،

حکمت فرعونی سے مراد ہے مفاسدِ ملوکیت۔ بالفاظ دگر ملوکیت، انبیاء کی تعلیمات کی ضد ہے اور اس کا مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے اس لئے اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں ملوکیت کی مذمت کی ہے۔ اور مسلمانوں کو اس کے مفاسد سے آگاہ کیا ہے۔ نبی، انسان کو اللہ کا بندہ بناتا ہے بادشاہ، انسان کو اپنا بندہ بناتا ہے چونکہ ملوک اللہ اور اس کے رسولوں کے دشمن ہوتے ہیں اس لئے اقبال نے "ابلیس" ارباب کیں" سے تعبیر کیا ہے۔

یہ فصل چونکہ مقابلتاً آسان ہے اسلئے پوری فصل کا مطلب مجموعی طور پر لکھ دونگا

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے گزشتہ فصل میں انبیا کی تعلیمات واضح کر دی ہیں اس فصل میں بادشاہوں کی حکمت عملی (طریق کار) یا پالیسی بیان کرتا ہوں:۔

(۱) سلاطین کی پالیسی سراسر مکر و فریب پر مبنی ہوتی ہے اور مکر و فن کا معنی یہ ہے کہ وہ ایسا نظام زندگی مدوّن کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ افراد قوم مادیات میں مشغول ہو کر روحانیت (عشق الٰہی) سے بیگانہ ہو جائیں۔ اس لئے وہ ان کی جسمانی آسائش اور مادی

فوائد کا انتظام تو کر دیتے ہیں مگر کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس سے ان کے اندر تقویٰ اور روحانیت پیدا ہو سکے۔

(۲) اُن کی پالیسی (حکمت عملی) دین (اسلام) کی قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ یعنی وہ لادینی نظام کو فروغ دیتے ہیں۔ اس نظام زندگی میں "مقام شوق" یعنی خدا تک پہنچنے کی گنجائش مطلق نہیں ہوتی مثلاً:۔

(ا) وہ کلچر کو فروغ دینے کے پردے میں رقص و سرود اور اختلاط مرد و زن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ لیکن قرآن و حدیث کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔

(ب) اُن اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں جن کا مقصد افراد میں بےحیائی اور فحاشی کا میلان پیدا کرنا ہو۔ تاکہ کوئی شخص ان کی بدکاریوں پر معترض نہ ہو سکے۔

(ج) گھڑ دوڑ (ریس) کے پردے میں قمار بازی کو فروغ دیتے ہیں۔

(د) ہوٹلوں کے مالکوں کو شراب فروخت کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور تاجروں کو بہترین قسم کی شرابیں منگوانے کا پرمٹ عطا کرتے ہیں۔

(ہ) عریاں لٹریچر اور عریاں فلمیں امپورٹ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

(و) کتابوں کو سامان تعیش میں اور سامان تعیش کو ضروریات زندگی میں شمار کرتے ہیں

(ز) وہ نمود و نمائش پر لاکھوں روپے صرف کرتے ہیں مگر اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے بجٹ میں کوئی رقم مخصوص نہیں کرتے

(ح) فلم اسٹاروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں مگر دین کے خادموں کو کسی قسم کی سہولت بہم نہیں پہنچاتے بلکہ انہیں مُلّا کہہ کر مطعون کرتے ہیں۔

(۳) وہ افراد کی تعلیم کیلئے کالج اور اسکول (مکتب) قائم کرتے ہیں مگر نظام تعلیم اور نصاب تعلیم ایسا مرتب کرتے ہیں جسکی بدولت غلام اپنے آقا کے مقاصد کی تکمیل کر سکے یعنی جو نئے غلامی میں پختہ تر ہو سکے۔ اور ایسے اساتذہ کا انتخاب کرتے ہیں جو انہیں کامیابی کے ساتھ

غلامی کا درس دے سکیں۔ [1]

(د) ارباب کیں ایسے شیوخ ملت (دینوی پیشواؤں) کو مناصب عالیہ کے لئے منتخب کرتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول سے قطع نظر کر کے اُن کی مراد کے مطابق دین کی تجدید کر سکیں یعنی دین اسلام کو اُن کے خیالات کے سانچے میں ڈال سکیں۔ اور جو علمائے حق ان سے اختلاف رائے کرتے ہیں اُن کو ختم کر دیتے ہیں۔

(ھ) ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قوم میں اتحاد اور وحدت پیدا نہ ہو بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وحدت قومی کو فنا کرنا ہی ان کا مقصد حیات ہوتا ہے۔

ارباب کیں (سلاطین) کی حکمت عملی واضح کر لینے کے بعد آئندہ اشعار میں اقبال اس قوم کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہیں جو بادشاہوں کی غلامی میں گرفتار ہو کر اپنی تخریب اور غیر کی تعمیر پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس قوم کی حالت یہ ہوتی ہے کہ:۔

(۱) گی شود در علم و فن صاحب نظر
از وجود خود نگردد با خبر

یعنی اس قوم کے افراد مختلف علوم و فنون میں ماہر ہو جاتے ہیں مثلاً

(الف) یورپ کی درسگاہوں سے ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں۔

(ب) آسمان کے ستاروں کے حالات بیان کر سکتے ہیں۔

(ج) فنون لطیفہ پر لیکچر دے سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] اکبر الہ آبادی نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

لیکن اپنی شخصیت اور اس کی صلاحیتوں سے بیگانہ رہتے ہیں یعنی اپنی "خودی" کی تربیت نہیں کر سکتے ۔

(۲) نقش حق یعنی اللہ کی محبت کو اپنے دل سے مٹا دیتے ہیں اگر ان کے دلوں میں ترقی کی آرزو پیدا ہوتی ہے تو بہت جلد فنا ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس کی تکمیل کا کوئی انتظام نہیں کر سکتے [1]

(۳) اس قوم کے افراد "دلا وغیرہ" سے محروم رہتے ہیں یعنی اس قوم کے نوجوانوں میں دینی غیرت کا مادہ نہیں ہوتا ۔ اور اس بے غیرتی کی بنا پر ان کی روح قبر کے مردے کی طرح بے حس ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ اس بے غیرتی اور بے حسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کے افراد

(ا) اپنے بھائیوں کی جاسوسی کا مقدس فرض انجام دیتے ہیں ۔

(ب) اپنی گولیوں سے اپنے بھائیوں کا سینہ چھلنی کر دیتے ہیں ۔

(ج) عہدوں اور جاگیروں کے لئے اپنا دین و ایمان فروخت کر دیتے ہیں ۔

(۴) اس قوم کے پیران کہن بڑے بوڑھے حیا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور نوجوان عورتوں کی طرح آرائش جسمانی میں منہمک رہتے ہیں ان کی تمام تر توجہ لباس اور غذا کلب اور ہوٹل پر مرکوز ہو جاتی ہیں ۔ دنیا میں باعزت زندگی بسر کرنے کی کوئی آرزو ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتی ۔ اور ہو بھی کیسے ؟ یہ آرزو تو غیور اور زندہ قوم کے افراد میں پیدا ہوتی ہے لیکن اس قوم کے افراد تو ماں کے پیٹ ہی سے مردہ پیدا ہوتے ہیں ۔

(۵) اب رہیں اس قوم کی لڑکیاں تو ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود اپنی ہی

---

[1] آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو اگر پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
(ارمغان حجاز)

زلفوں میں اسیر ہوتی ہیں! شوخ چشم۔ بے باک ، بے حیا ، خود نما اور دوسروں کا عیب نکالنے والی رات دن آرائش جسمانی میں مصروف ، ہر وقت بناؤ سنگھار سے کام (دیدے کا پانی ڈھلا ہوا) (دل باختہ) نہ دن کو چین نہ رات کو آرام ہو ٹھٹا ، میک اپ ایسے کام۔ بھنویں جیسے کھنچی ہوئی تلواریں ، "تبرج" (جسم کی نمائش) کی دلدادہ ، "ساعد سمیں" اغیار کی نگاہوں کے لیے سامان عیش! ملبوس اس قدر مہین (باریک) کہ تمام جسم اس سے اس طرح نمایاں جس طرح پانی میں مچھلی۔

ع سینہ ماہی بموج اندر نگر

یعنی جس طرح مچھلی کا جسم پانی میں نظر آتا ہے اس طرح ان کا جسم لباس میں نظر آسکتا ہے

فرزندان و دختران ملت کی زندگی کا نقشہ کھینچنے کے بعد اقبال ، غلام قوم کی مجموعی حالت پر تبصرہ کرتے ہیں :۔

جو قوم کشتۂ تدبیر غیر ہوتی ہے یعنی ملوکیت کا شکار ہو جاتی ہے اس کا جسم (خاکستر) زندگی (شرر) سے محروم ہو جاتا ہے۔ یعنی غلامی روحانی موت ہے اور ملوکیت کا مقصد ہی انسانوں کو روحانی اعتبار سے ختم کر دینا ہوتا ہے کیونکہ اس کی بقا اسی پر موقوف ہے۔

ملوکیت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلام قوم کے افراد ہر وقت تلاش برگ و ساز میں مصروف اور منہمک رہتے ہیں[1]۔ بلکہ پوری زندگی

---

[1] ان اشعار کی وضاحت چنداں ضروری نہیں ہے کیونکہ جو کچھ اقبال نے ان اشعار میں لکھا ہے۔ وہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے۔ کیونکہ ہم ابھی تک غلامی کی منحوس زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بقول داغ۔

خیر تو آپ کی مناتے ہیں
جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

فکرِ معاش اور ترسِ مرگ بن جاتی ہے۔ یہ بدقسمت لوگ ہر وقت روزی کی فکر میں سرگرداں اور موت سے خائف رہتے ہیں۔

اب رہے اس قوم کے دولتمند افراد تو ان کی حالت یہ ہے کہ

(ا) وہ بخیل اور زرپرست ہو جاتے ہیں قومی کاموں کے لئے اپنی دولت مطلق صرف نہیں کرتے۔ ہاں عیش و عشرت اور حکومت کو راضی کرنے کے لئے اسی دولت کو پانی کی طرح بہاتے رہتے ہیں۔

(ب) زندگی کے حقائق (مغز) سے بیگانہ ہوتے ہیں صرف مادی آسائش (پوست) پر قانع ہو جاتے ہیں بلکہ اسی کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔

(ج) خدا کے بجائے اربابِ اقتدار (قوتِ فرمانروا) کی اطاعت (عبادت) کرتے ہیں۔ ان کا معبود اللہ نہیں بلکہ حکمران طبقہ ہوتا ہے اور اسی ملوکیت پرستی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ دین اور ایمان فروشی کو اپنے حق میں مفید سمجھتے ہیں۔

(د) مستقبل سے بے نیاز بلکہ بیگانہ ہو کر صرف عارضی منفعت کو مدِ نظر رکھتے ہیں آئندہ کی فکر تو زندہ قوم کیا کرتی ہے۔

(ہ) یہ لوگ اپنے بزرگوں کی تصانیف کا مطالعہ تو کرتے ہیں مگر ان کے ارشادات پر اصلاً عمل نہیں کرتے۔

(و) غلام قوم کا دین صرف یہ ہے کہ وہ اغیار سے عہد وفا استوار کرتی ہے اور خشتِ حرم سے دیر و کلیسا کی تعمیر کرتی ہے یعنی قرآن و حدیث سے کافروں کی اطاعت کا جواز ثابت کرتی رہتی ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے مسلمانوں کو مدِ نظر رکھ کر یہ تمام اشعار لکھے ہیں اسی لئے انہوں نے "خشتِ حرم" کا استعارہ استعمال کیا ہے مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان غیر مسلموں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ

وہ اپنے وجود سے کفر کو تقویت پہونچاتے ہیں اور حق بات یہ ہے کہ اسکے علاوہ وہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتے ۔

بقول اکبر الہ آبادی اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے ۔

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

اگر ناظرین مسلمان ملکوں کے حال زار کا مطالعہ کریں تو اقبال کے اشعار کی صداقت خود ان پر واضح ہو جائے گی ۔ چونکہ آپ بیتی محتاج شرح نہیں ہوتی اس لیئے میں نے ان اشعار کی تشریح سے اجتناب کیا ہے ۔

آخری شعر گویا مسلمانان عالم کی زندگی کا مرقع ہے یا یوں سمجھیے کہ اقبال نے ان کی روحانی اور اخلاقی موت پر مرثیہ لکھا ہے ۔ کہتے ہیں کہ

افسوس ہے اس قوم پر جو مسلمان ہونے کی مدعی ہو مگر اس کا دل اللہ تعالی کی محبت سے بالکل خالی ہو ۔ وہ دراصل مر چکی ہے ۔ مگر جہالت کی وجہ سے اس تلخ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے ۔ اسلیئے اپنے آپ کو زندہ سمجھ رہی ہے ۔

فصل ششم

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

تمہید :۔ اس فصل میں تین بند ہیں پہلے بند میں اقبال نے کہ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کے معانی کثیرہ اور مفاہیم متعددہ میں سے صرف ایک حقیقی اور ایک مفہوم کو واضح کیا ہے۔ کہ جب تک لا اِلٰہ کا حقیقی مفہوم قلب و دماغ میں جاگزیں نہ ہو انسان غیر اللہ کی غلامی سے نہیں نکل سکتا۔

تا نہ رمز لا الٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

دوسرے بند میں ایام عرب سے لا الٰہ کی تاثیر کی مثالیں بیان کی ہیں۔ مثلاً جب عربوں کے دل و دماغ میں لا الٰہ کا حقیقی معنیٰ راسخ ہو گیا تو

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او

تیسرے بند میں روس کی تاریخ سے لا الٰہ کی تاثیر واضح کی ہے اور اس ضمن میں یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ وہ وقت بھی آنے والا ہے جب روسی قوم لا الٰہ کے بعد الا اللہ کا اعتراف کرے گی کیونکہ

در مقام لا نیاساید حیات
سوئے الّا می خرامد کائنات

پہلا بند :- پہلا شعر : کہتے ہیں کہ مردان حال سے کسب فیض کرنے کے بعد یہ نکتہ بیان کرتا ہوں۔ کہ قوموں کی زندگی میں لا الٰہ سے شان جلال اور الا اللہ سے شان جمال پیدا ہوتی ہے۔

شعر کا مطلب لکھنے سے پہلے اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ اقبال نے یہ نکتہ منطقیوں، فلسفیوں اور سائنسدانوں سے حاصل نہیں کیا ہے۔ (یہ حضرات اس کوچہ سے نابلد ہیں) بلکہ مردان حال یعنی صوفیائے کرام کی تصانیف سے اخذ کیا ہے۔ (انہوں نے اپنے بعض واردات، مکاشفات اور تجربات کو عوام کی آگاہی کے لئے قلمبند کر دیا ہے)

مردان حال سے مراد ہیں وہ مبارک افراد جنہوں نے توحید کو اپنی عقل اور جذباتی زندگی میں ایک زندہ اور فعال عنصر بنا لیا ہے یعنی ان کے افکار اقوال اور اعمال توحید کے مفہوم سے مطابقت کلی رکھتے ہیں یعنی ان حضرات کے لئے عقیدہ توحید قال کی منزل سے گزر کر حال بن گیا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے یہ نکتہ ارسطو، ابن سینا، ابن رشد، امام رازی یا صدرالدین شیرازی سے نہیں سیکھا۔ بلکہ شیخ اکبر، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت مجدد دہلوی کے ارشادات سے اخذ کیا ہے کہ

ع امتاں را لا جلالی، الا جمالی

یعنی جب کوئی قوم لا الٰہ کے اقتضا پر عمل کرتی ہے تو اس میں شان جلال (قہاری وجباری، سطوت، شوکت، طاقت، غلبہ، اقتدار اور حکومت) پیدا ہو جاتی ہے اور جب وہ قوم الا اللہ کے مفہوم کو دلنشیں کر لیتی ہے تو شان جمال (رافت، شفقت، رحمت، جود وکرم، فضل وعطا) کی مظہر بن جاتی ہے۔

(۱) شان یا صفت جلال کا یہ تقاضا ہے کہ مقابل کو نیست یا فنا کر دیا جائے چونکہ لا الٰہ کا مفہوم یہ ہے۔ کہ کائنات میں کوئی ہستی یا شئی الٰہ نہیں ہے یعنی یہ کلمہ ہستی غیر یا غیر اللہ کی نفی کر رہا ہے۔ اس لئے منطقی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ لا الٰہ میں شان جلال پائی جاتی ہے۔

لہذا جو شخص یا جو قوم اس کے اقتضا پر عمل کریگی اس کے اندر لازمی طور سے شان جلال (قہاری) سطوت حکمرانی پیدا ہو جائیگی۔

لا کا مطلب ہے کوئی موجود نہیں ہے یعنی قائل نے سب کی نفی کر دی چونکہ جلال بھی نفی کر دیتا ہے اسلئے لا = جلال۔

(۲) شان جمال کا تقاضا یہ ہے کہ مقابل کو باقی رکھا جائے بلکہ اسے شعور اور ادراک بھی عطا کیا جائے۔ تاکہ وہ جمال کا مشاہدہ کر سکے۔ اس لئے الّا = جمال۔

بطرز دیگر:- جلال اپنے مقابل یا غیر کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی ذات کا اقتضا یہی ہے کہ ماسوی کی ہستی فنا ہو جائے کوئی موجود نہ رہے اس لئے جلال اپنے غیر کو فنا کر دیتا ہے یعنی جلال = لا

جمال اپنی نمود چاہتا ہے اس لئے برعکس جلال اپنے غیر کو قائم رکھتا ہے یعنی جمال = الّا

واضح ہو کہ جلال کا تقاضا ہے فنائے ماسوی

اور جمال کا تقاضا ہے بقائے ماسوی

اور حق تو یہی ہے یہ دونوں شانیں ہر لحظہ کارفرما ہیں

(بموجب آیہ مبارکہ کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ)

اس لئے کائنات ہر لحظہ فنا ہوتی رہتی ہے اور معاً ہر لحظہ پیدا ہوتی رہتی

ہے فلسفہ تصوف میں اس حقیقت کو تجدد امثال کہتے ہیں ۔
یعنی مثلاً زید بتقاضائے شان جلال فنا ہو گیا۔ اور بتقاضائے شان جمال اس کی مثل پھر پیدا ہو گئی بالفاظ دگر ہر آن (جس کا تصور عقلاً محال ہے) زید فنا ہو جاتا ہے ۔ اور اسی آن پیدا ہو جاتا ہے اور یہ تجدد مثل زید اس سرعت سے ہوتا ہے ۔ کہ زید کی شخصیت میں بظاہر کوئی تعطل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذات یا شخصیت ایک امر ممتد اور مستمر محسوس ہوتی ہے اس کی مثال درکار ہو تو چراغ کی لو یا شعلہ جوالہ یا آب رواں پر غور کرنا مفید ہو گا گردش کی سرعت سے نقطہ آتشیں دائرہ محسوس ہوتا ہے اسی طرح تجدد امثال کی سرعت سے عالم ایک امر ممتد محسوس ہوتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر آن فنا ہوتا ہے اور ہر آن اس کا مثل ظہور میں آجاتا ہے کیونکہ شان جلال عالم کو پوشیدہ کرتی ہے اور شان جمال معاً اسے ظاہر کر دیتی ہے ۔

اب اس شعر کے مفہوم کو امتوں کی زندگی پر منطبق کرتے ہیں ۔

اقبال کہتے ہیں کہ اگر کوئی قوم لا الٰہ کے مفہوم کو شعار زندگی بنا لے یا اس کے اقتضا پر عامل ہو جائے تو اس کے اندر بھی شان جلال پیدا ہو جائے گی اس کی وجہ شروع میں بیان کر چکا ہوں کہ لا الٰہ شان جلال کا مظہر ہے ۔

اقبال نے اس مصرعہ میں لا کو لا الٰہ کا نمائندہ قرار دیا ہے اور لا الٰہ سے اس جگہ یہ مراد لی ہے کہ اس کائنات میں کوئی ہستی تجھ پر حکمران نہیں ہے ۔ کیوں ؟ اسلیے کہ ہو نہیں سکتی ۔ یعنی کسی ہستی میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ تجھ پر حکمران ہو سکے ۔

مثلاً اگر پاکستان کے باشندوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو جائے کہ

دنیا کی کسی قوم میں یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ وہ ہم پر مسلط ہو جائے ہم اللہ کے سوا کسی انسان یا قوم یا حکومت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرینگے (لا الٰہ الا اللہ کا یہی مفہوم ہے) تو امریکہ اور روس ان کے آستانے پر جبہہ سا نظر آئیں گے۔

جب کوئی قوم لا الٰہ کا مفہوم سمجھ کر اس کے اقتضا پر عمل کرتی ہے تو اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے اور اس کی بدولت اس کے اندر بے پناہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے اس کے بعد جب وہ الا اللہ کہتی ہے یعنی خدائی قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے تو اس کا وجود دنیا کے حق میں رحمت بن جاتا ہے قوت کا دوسرا نام جلال اور تقوی کا دوسرا نام جمال ہے اور جس قوم میں یہ دونوں شانیں جمع ہو جاتی ہیں۔ تو وہ قوم اس دنیا کی محتسب بن جاتی ہے یعنی دیگر اقوام کو قوانین ایزدی کی پابندی کرنے پر مجبور کر سکتی ہے اور یہ کائنات اسکی مطیع ہو جاتی ہے

پاکستان کے آٹھ کروڑ مسلمان محض زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں اس کے اقتضا پر عمل نہیں کرتے اس لئے دوسروں کے دست نگر ہیں جس طرح زبان سے لفظ آب کہنے سے پیاس نہیں بجھ سکتی اسی طرح زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتے رہنے سے شان جلال اور شان جمال پیدا نہیں ہو سکتی اسی لئے اقبال نے جاوید نامہ میں ہمیں متنبہ کیا ہے۔

لا الٰہ گوئی بگو از روئے جاں — تا ز اندام تو آید بوئے جاں

ایں دو حرف لا الٰہ گفتار نیست — لا الٰہ جز تیغ بے زنہار نیست

لا الٰہ کے مفہوم پر عامل ہونے سے انسان صاحب شمشیر ہو جاتا ہے اور الا اللہ کے مفہوم پر عمل کرنے سے اس میں درویشی پیدا ہو جاتی ہے

خسروی شمشیر و درویشی نگہ
ہر دو گوہر از محیطِ لا الٰہ

دوسرا شعر:۔ اس شعر کا مطلب اوپر بیان ہو چکا ہے احتساب کائنات کنایہ ہے غلبہ و اقتدار سے کیونکہ جب تک کسی قوم میں یہ صفت موجود نہ ہو وہ احتساب نہیں کر سکتی فتح باب کائنات کنایہ ہے دشواریوں اور مشکلات زندگی پر غالب آنے سے۔ یعنی جو قوم لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم پر عمل کرتی ہے وہ دنیا میں سب اقوام پر غالب آجاتی ہے اور تمام دشواریوں کو اپنے راستہ سے ہٹا سکتی ہے بلکہ تسخیر کائنات کا دروازہ اسکے لیئے کھل جاتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ لا الٰہ الا اللہ یہ اس دنیا کی ابجو کلمہ کُن سے پیدا ہوئی ہے تقدیر ہیں۔ لا سے حرکت پیدا ہوتی ہے اِلّا سے سکون پیدا ہوتا ہے۔

(۱) لا اور اِلّا اس دنیا کی تقدیر ہے۔ یعنی حق نے فیصلہ کر دیا کہ اس دنیا پر صحیح معنی میں حکومت کرنیکا حق (ایسی حکومت جو اہل دنیا کے لیئے رحمت ہو) صرف اس قوم کو حاصل ہو سکتا ہے جو لا الٰہ الا اللہ دونوں کے اقتضاء پر عمل کرے۔

(۲) لا الٰہ کا لازمی نتیجہ ستیزہ و پیکار ہے اور اس کے لیئے حرکت لازمی ہے جب کوئی قوم لا الٰہ کہتی تھے یعنی اس کے مفہوم پر عمل کرتی ہے۔ تو لامحالہ دشمنوں سے برسر جنگ ہو جاتی ہے اور جب وہ الا اللہ کہتی ہے تو اللہ کے قانون کو نافذ کرتی ہے۔ اور قوانین شریعت کے نفاذ کا لازمی نتیجہ امن و امان یعنی سکون ہے۔

صحابہ کرام نے پہلے لا الٰہ کا نعرہ بلند کیا اس کا نتیجہ جہاد فی سبیل اللہ

(جنگ بدر و دیگر غزوات) کی شکل میں ظاہر ہو۔ بعد از ان الا اللہ کہا یعنی
خدا کا قانون نافذ کیا تو ہر طرف امن قائم ہو گیا گویا حرکت سے جہاد اور
سکون سے اطمینان قلب مراد ہے۔ جب کوئی قوم لا الٰہ کے بعد الا اللہ
بھی کہتی ہے۔ تو اس قوم کو بھی اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے اور دوسروں
کو بھی یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے۔

چوتھا شعر :- تا نہ رمز لا الٰہ آید بدست الخ

جب تک کوئی فرد یا قوم لا الٰہ الا اللہ کے حقیقی مفہوم سے آگاہ نہ
ہو اس وقت تک وہ غیر اللہ (انسانوں) کی غلامی سے نہیں نکل سکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ رمز لا الٰہ کا مطلب کیا ہے؟ اس کا جواب
یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کا در حقیقت مفہوم یہ ہے کہ

لا موجود الا اللہ

یعنی اللہ کے سوا کائنات میں کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود ہی نہیں ہے
کلمہ طیبہ میں یہی حقیقت کبریٰ مخفی ہے اسی کو اقبال نے رمز سے تعبیر
کیا ہے اور یہ وہ حقیقت کبریٰ اور صداقت عظمیٰ ہے جس کو تسلیم کئے بغیر
مسلمان کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

اس کلمہ میں دو لفظ توجہ طلب ہیں (۱) الٰہ اور (۲) اللہ
ترجمہ اس کلمہ کا یہ ہے اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ یعنی اللہ کے
سوا کسی دوسری ہستی میں الوہیت کی صفت نہیں ہے یعنی سارے کائنات میں
صرف ایک ہی ہستی الٰہ ہے اور اس کا نام اللہ ہے۔

واضح ہو کہ جس ہستی کو حکما اپنی اصطلاح میں واجب لذاتہ یا واجب الوجود
کہتے ہیں قرآن حکیم اس کو اپنی اصطلاح میں اللہ سے تعبیر کرتا ہے اور

اس کا نام اللہ رکھتا ہے

(۱) اللہ وہ ہے جو واجب لذاتہ یا ذات الوجود ہو۔

(ب) اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔

(ج) یعنی اللہ کے سوا کوئی واجب الوجود نہیں ہے۔

(د) واجب اسے کہتے ہیں جو از خود موجود ہو جس کی ذات کا یہ تقاضا ہو کہ وہ لازمی طور سے موجود ہو جس کے لئے وجود ضروری ہو جس کا نہ ہونا محال عقلی ہو۔ جس کا وجود خانہ زاد ہو، مستعار نہ ہو جسے کسی دوسرے نے وجود عطا نہ کیا ہو۔ بلکہ وہ خود بخود موجود ہو

چونکہ اس کا وجود ذاتی ہے اس لئے اس وجود کے کمالات بھی ذاتی ہوں گے کیونکہ اگر اس کے کمالات کسی دوسرے کے عطا کردہ ہیں تو وہ مستکمل بالغیر ہو جائے گا۔ اور استکمال بالغیر مستلزم احتیاج ہے اور احتیاج منافی وجوب ہے اسلئے وہ واجب نہ رہے گا۔

لہذا اگر وہ واجب لذاتہ ہے تو تمام کمالات بھی اسکے لئے ثابت ہوں گے۔ بالفاظ دگر وہ واجب الوجود غنی ہوگا یعنی اسے کسی اعتبار اور کسی جہت سے کسی دوسرے کی احتیاج نہیں ہوگی

وجوب وجود کی بنا پر واجب الوجود میں حسب ذیل صفات کا پایا جانا لازمی اور یقینی اور ابدی ہے۔

(ا) واجب الوجود کی ذات میں وحدت لازمی ہے کیونکہ اگر اس کی ذات میں کسی قسم کی ترکیب پائی جائے تو ذات حادث ہو جائیگی۔

(ب) بالفاظ دگر، واجب الوجود میں ذات، حقیقت، وجود، تعین، تشخص اور وجوب سب ایک دوسرے کا عین ہوں گے ان میں کوئی مغائرت نہیں

ہوگی کیونکہ مغائرت سے ترکیب لازم آتی ہے۔ اور ترکیب مستلزم حدوث ہے۔

(ج) واجب الوجود ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا یعنی تعدد وجبا محال ہے کیونکہ اگر دو ہستیوں کو واجب تسلیم کیا جائے۔ تو ان دونوں میں وجوب تو مابہ الاشتراک ہوگا۔ اور وجوب کے علاوہ ہر ایک میں کوئی ایسی شئی بھی ہوگی جس کی بنا پر ان میں امتیاز ہو سکتا ہے۔ اس کو مابہ الامتیاز کہتے ہیں۔ لہٰذا دونوں واجب مرکب ہو گئے۔ اور ہر مرکب حادث ہوتا ہے۔

(د) واجب الوجود ہر جہت سے واجب ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنی صفات اور اپنے کمالات میں کسی غیر کا محتاج نہیں ہوتا۔ واجب الوجود کی ذات اپنی تمام صفات کمالیہ کے لئے خود ہی کافی ہوتی ہے۔

(لا) واجب الوجود قادر مطلق، خیر مطلق، عالم الغیب والشہادۃ، علیٰ کل شئی شہید، ہمہ جا حاضر و ناظر، فعال لما یرید، صاحب اختیار، صاحب ارادہ، صاحب جود و کرم، خالق، صانع، مبدع، مبدا، رحمٰن و رحیم، رازق، مالک اور حاکم ہوتا ہے۔

دلیل اس پر یہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی صفت اس میں نہ ہو تو وہ ناقص اور محدود ہو جائے گا۔ اور نقص و تحدید مستلزم احتیاج ہے اور احتیاج منافی وجوب ہے جو ہستی کسی دوسرے کی محتاج ہو وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتی۔ اب ناظرین قرآن حکیم کا مطالعہ کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ جس قدر صفات اور جس جس قسم کی صفات حکما نے واجب الوجود سے منسوب کی ہیں وہی صفات قرآن نے اللہ سے منسوب کی ہیں۔

اگر اس کی تفصیل درج کروں تو یہ شرح علم العقائد کی کتاب بن جائے گی اسلئے صرف چند آیات پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) یا اَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۔

اے لوگو! تم سب (ہر امر میں مثلاً وجود، حیات، قوت، حرکت وغیرہ) اللہ کے محتاج ہو۔ (اور تمہارے مقابلہ میں اللہ کی شان یہ ہے کہ) اور اللہ تو وہ غنی (بے نیاز) اور خوبیوں والا (صاحب کمالات) ہے۔ (۳۵ - ۱۵)

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوئیں:

(ا) اللہ تو غنی اور حمید ہے یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں واجب الوجود ہے اور اس کی ذات مجمع جمیع کمالات وحسنات ہے۔

(ب) ماسوی اللہ (کائنات) ہر امر میں اللہ تو کی محتاج ہے یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں ممکن الوجود ہے اور مجمع جمیع عیوب ونقائص ہے۔

(۲) اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۵ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ۵ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط (۲ — ۲۵۵)

اللہ کی شان یہ ہے کہ اس کے علاوہ ساری کائنات میں کوئی ہستی الٰہ (واجب الوجود) نہیں ہے (الوہیت کی ایک جھلک دکھائی دیتے ہیں۔

(ا) وہ خود بھی زندہ ہے اور ساری کائنات کو بھی قائم رکھنے والا ہے۔

(ب) یہ کائنات اسی کی بدولت موجود ہے اگر وہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

(ج) نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند، یعنی وہ تمام مادی اور جسمانی نقائص اور عیوب اور کمزوریوں سے پاک ہے۔

(د) ساری کائنات اس کی خادم مطیع اور فرمانبردار ہے، وہ مالک ہے، حاکم ہے بادشاہ ہے بلکہ مالک الملک لاشریک لہ ہے۔

(۳) قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ۵ (۱۳ - ۱۶)

آپ انسانوں کو آگاہ کر دیجئے کہ اللہ ہی ہر شئی کا خالق ہے اور وہ واحد ہے۔

اور ساری کائنات اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔

(س) ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝ (۲۲ - ۶۲)

یہ اس لئے کہ بلا شبہ صرف اللہ ہی الحق ہے اور بلا شبہ ہر وہ شی جس کو وہ لوگ اللہ کے سوا الٰہ سمجھ کر یا قرار دے کر پکارتے ہیں باطل ہے اور بلاشبہ صرف اللہ ہی صاحب علو اور صاحب کبریا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ

(۱) کائنات میں صرف اللہ ہی الحق ہے یعنی صرف وہی واجب الوجود ہے وہی ہے جس کی ہستی از خود ہے۔ اسی کی ذات ہمیشہ قائم رہنے والی ہے صرف وہی قائم بالذات ہے الحق سے مراد ہے وہ ذات یا وہ ہستی جو کبھی مٹ نہ سکے جو ازلی و ابدی ہو جو از خود موجود ہو یعنی واجب الوجود ہو جس کا ہونا ضروری ہو جس کا نہ ہونا محال ہو جو درحقیقت موجود ہو۔ جو اپنے وجود اور اپنی ہستی میں کسی کی محتاج نہ ہو جسے ثبات اور دوام حاصل ہو۔ غور کیجئے۔ (۱) اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

(۲) اللہ کے سوا کوئی الحق نہیں ہے۔

اس لئے ثابت ہوا کہ اللہ کے سوا ہر شئے باطل ہے یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ لبید کے اس قول سے بڑھ کر سچی بات کسی عرب کی زبان سے نہیں نکلی۔

"اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ"

"وَكُلُّ نَعِيمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ"

آگاہ ہو جاؤ اللہ کے سوا ہر شئے باطل ہے اور ہر نعمت ایک نہ ایک دن یقیناً زائل ہو جائیگی

اسی لئے قرآن حکیم نے اس آیت میں دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ

(ب) ہر وہ شی جسے وہ لوگ اللہ کے علاوہ اللہ سمجھ کر پکارتے ہیں باطل ہے اور چونکہ انسانوں نے اپنی جہالت کی بنا پر کائنات کی ہر شی کو اللہ سمجھ کر پکارا ہے اس لئے ثابت ہوا۔ کہ کائنات کی ہر شی بذاتہ باطل ہے بالفاظ دگر: صرف اللہ الحق ہے۔ باقی یہ ساری کائنات باطل ہے چونکہ باطل ضد ہے حق کی اس لئے باطل کے معنی ہوئے وہ شی جو مٹ جانے والی ہو۔ جس کی حقیقت وجود نہ ہو بلکہ عدم ہو، جو بذات خود قائم نہ ہو جو بذات خود موجود نہ ہو جسے ثبات و دوام نہ ہو۔

باطل کا مفہوم خود قرآن نے واضح کر دیا ہے۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۱۷ — ۸۱)

بلاشبہ باطل نابود ہو جانے والا ہے یعنی اس کی ذات کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ مٹ جائے۔

فی الجملہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ حق ہے اور ماسوی اللہ (کائنات) باطل ہے اسی کو فلسفہ کی اصطلاح میں یوں کہیں گے کہ اللہ واجب الوجود ہے۔ اور ماسوی اللہ (کائنات) ممکن الوجود ہے اور جس طرح باطل حق کی ضد ہے اسی طرح ممکن، حق کی ضد ہے۔

(۵) لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱ — ۲۲)

اگر ہوتے ان (آسمان و زمین) میں چند اور بھی اللہ (اللہ کے سوا) تو بگڑ جاتا

؎ اسی لئے اقبال نے کائنات کو باطل قرار دیا ہے۔

بر سر ایں باطل حق پیرہن
تیغ لاموجود الا ھو بزن

(رموز بیخودی)

وہ دونوں تباہ ہو جاتے۔

قرآن حکیم نے تعدادِ الٰہ کا ابطال کرنے کے لئے فلسفیانہ اسلوب کے بجائے عام فہم اسلوب اختیار کیا ہے یعنی یہ فرمایا۔ کہ اگر اللہ کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی الٰہ ہوتی تو وہ اللہ کی مشیت، قضاو قدر، امرضی اور فیصلہ کو ہرگز تسلیم نہ کرتی۔ بلکہ اپنی مرضی نافذ کرتی مثلاً اللہ فیصلہ کرتا کہ زید کی وفات کے بعد حامد اس کا جانشین ہو۔ وہ دوسرا الٰہ کہتا کہ نہیں خالد جانشین ہوگا۔ وقس علی ھذا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ زمین و آسمان دونوں تباہ ہو جاتے

اس سے ثابت ہوا۔ کہ کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی الٰہ یعنی واجب الوجود نہیں ہے۔

دوسری بحث :۔ میں نے بدلائل عقلیہ و نقلیہ یہ ثابت کر دیا کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی الٰہ یعنی واجب الوجود نہیں ہے۔

ہم نے الٰہ کا معنی واجب الوجود اس لئے کیا ہے کہ قرآن حکیم نے الٰہ کی جو صفات بیان کی ہیں۔ وہی صفات حکما نے واجب الوجود سے منسوب کی ہیں۔ یعنی جسے حکما واجب کہتے ہیں۔ قرآن اُسے الٰہ (الحق) کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اور جس طرح تعدد وجبا محال ہے۔ اسی طرح تعدد الٰہ بھی محال ہے یعنی الٰہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

فی الجملہ یہ صرف اللہ ہی الٰہ ہے صرف اللہ ہی الحق ہے۔ یعنی صرف اللہ ہی واجب الوجود یا واجب الذاتہ یا بذات خود موجود ہے تو ماسوی اللہ (کائنات) یقینی طور پر غیر الٰہ یا غیر اللہ یا غیر الحق یا ممکن الوجود ہے جسے فلسفہ میں ممکن الوجود کہتے ہیں۔ قرآن اسے مخلوق کہتا ہے اور کتاب اللہ

نے مخلوق کی رہی تعریف کی ہے ۔ جو حکمائے ممکن کی بیان کی ہے اس موضوع پر آیات تو بہت سی ہیں ۔ بنظر اختصار صرف ایک آیت درج کرتا ہوں ۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝

بیشک آیا ہے اوپر آدمی کے ایک وقت زمانہ میں سے جبکہ نہ تھا وہ کچھ چیز جس کا ذکر ہوتا ۔ یعنی ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب انسان معدوم تھا ۔ اللہ تو نے اُسے پیدا کیا ۔ تو موجود ہو گیا ۔ یعنی اس کا وجود خانہ زاد نہیں ہے بلکہ مستعار ہے ۔ فلسفہ میں اُس شخص یا شے کو جو بذات خود معدوم ہو مگر کسی (واجب الوجود) کے موجود کرنے سے موجود ہو جائے ، ممکن کہتے ہیں اس آیت میں انسان ساری کائنات کا نمائندہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب یہ کائنات معدوم تھی ۔

خلاصہ کلام اینکہ

اللہ واجب الوجود ہے یعنی اس کی ذات کا تقاضا وجود ہے ۔

ماسوی اللہ ممکن الوجود ہے یعنی اس کی ذات کا تقاضا عدم ہے ۔

اسی لئے قرآن نے اللہ کو حق اور ماسوی اللہ کو باطل قرار دیا ہے

لہ یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ قرآن نے تخلیق کو بالحق قرار دیا ہے ۔

جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے :-

وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ (۲۲ - ۴۵)

بیشک تخلیق بالحق ہے مگر مخلوق باطل ہے ۔ اللہ تو کا فعل تخلیق بالحق ہے یعنی اس میں ایک خاص مصلحت ہے یا مقصد ہے بالفاظ دگر فعل تخلیق عبث یا بیکار نہیں ہے مگر جو چیز (کائنات) پیدا کی ہے وہ باطل یعنی مٹ جانے والی ہے اسکو ہمیشگی نہیں ہے کما قال كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝

ممکن الوجود (مخلوق) وہ ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے معدوم ہو مگر کسی کے موجود کرنے سے موجود ہو جائے۔ قرآن حکیم کی رو سے ماسوی اللہ مخلوق (معدوم) ہے۔ کائنات میں جس قدر اشیاء ہیں سب مخلوق ہیں یعنی ہر شئی ممکن الوجود ہے

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (۳۵ - ۳)

کیا کوئی اور ہستی بھی خالق ہے اللہ کے سوا جو تم کو آسمانوں اور زمین میں سے رزق دیتا ہے (آگاہ ہو جاؤ کہ) اس کے سوا ساری کائنات میں کوئی مستحق الٰہ نہیں ہے۔

اس آیۂ مبارکہ سے تین باتیں ثابت ہو گئیں۔

(۱) اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی ہستی خالق نہیں ہے

(۲) اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی ہستی رازق نہیں ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ

(۳) اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی مستحق الٰہ نہیں ہے۔

تیسری بحث: اب ممکن الوجود کی حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہوتا ہے یعنی

واجب کی حقیقت وجود ہے۔ اور ممکن کی حقیقت عدم ہے

واضح ہو کہ جس کی حقیقت عدم ہوتی ہے جب واجب اسے موجود کرتا ہے تو اس کا وجود محض عارضی ظلی مجازی یا اعتباری ہوتا ہے درحقیقت وجود کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ یعنی ممکن حقیقی معنی میں موجود نہیں ہوتا حقیقی معنی میں صرف اللہ ہی موجود ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقی معنی میں اللہ کے سوا کوئی شئی موجود نہیں ہے۔ اس نکتہ کو ارباب تصوف نے انداز

بلیغ یوں بیان کیا ہے۔

لا موجود الا اللہ

قرآن حکیم نے متعدد آیات سے اس حقیقت کو مبرہن فرمایا ہے مثلاً

(ا) هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۵۷۔۳)

(ب) فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۵ (۲ — ۱۱۵)

(ج) وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۵ ۔ (۵۷ — ۴)

(د) وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۵ (۲ — ۲۰)

(ہ) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا اَحَدٌ ۵ (۱۱۲ — ۱ تا ۴)

(و) مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ ۵ ۔ (۷ — ۵۹)

(ز) لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ الخ (۲۱ — ۸۷)

(ح) لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا الخ (۲۰ — ۱۴)

(ط) اَلَا اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ ۵ ۔ (۴۱ — ۵۴)

(ی) مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ الخ (۵۸ — ۷)

ذیل میں ان آیات کا بامحاورہ ترجمہ کرتا ہوں۔

(ا) وہی اللہ ہر شئی کا اوّل ہے اور وہی ہر شئے کا آخر ہے یعنی وجود کے لحاظ سے اس کو ہر شئی پر تقدم حاصل ہے[1] اور تمام اشیاء کے فنا ہو جانے کے بعد وہی باقی رہ جائے گا۔ پھر فرمایا وہی ہر شئے کا ظاہر ہے اور وہی ہر شئی کا باطن ہے یعنی ہر شئی کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک ظاہری دوسرا باطنی مثلاً انسان کہ اس

---

[1] بقول امام غزالی حق تعالیٰ اول ہے بایں معنی کہ وہ ہماری ہستی اور ہمارے وجود کا سرچشمہ ہے ۱۲

کا ظاہری پہلو جسم ہے۔ اور باطنی پہلو روح ہے تو قرآن حکیم صاف لفظوں میں اعلان فرماتا ہے کہ ظاہر بھی وہی اور باطن بھی وہی ہے۔ یعنی وہی ہے غیر اللہ کا وجود ہی نہیں۔ آخر میں فرمایا۔ کہ وہ ہر شئی کا علم رکھتا ہے یعنی ہر شئی کی ظاہری اور باطنی حالت سے آگاہ ہے کیونکہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ ہر شئی کا ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی ہے

(ب) پس تم جدھر بھی اپنا رخ کرو گے اسی طرف اللہ کا منہ ہے۔ یعنی جسے تم کائنات کہتے ہو یہ بذات خود کچھ نہیں ہے مگر اس کی جلوہ گاہ ہے[1]

(ج) اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو

(د) بیشک اللہ تو ہر شئی پر قدرت رکھتا ہے۔

(ہ) آپ کہہ دیجئے۔ کہ اللہ تو احد ہے اللہ تو صمد ہے نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اسے کو کسی نے جنا۔ اور نہ کوئی ہستی اس کی ہمسر ہے۔

(و) اس کے علاوہ تمہارے لئے اور کوئی الٰہ (واجب الوجود) نہیں ہے یعنی اس کے سوا اور کوئی ہستی بذات خود موجود نہیں ہے

(ز) اے خدا تیرے سوا ساری کائنات میں اور کوئی الٰہ نہیں ہے

(ح) اللہ تو نے حضرت موسیٰ سے فرمایا کہ میں خدا ہوں اور میرے سوا اس کائنات میں اور کوئی الٰہ (بذات خود موجود) نہیں ہے

(ط) آگاہ ہو جاؤ کہ وہ ہر شئی کو محیط ہے یعنی وہ کائنات کی ہر شئی کو گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی ہر شئی سے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔

---

[1] نیاز بریلوی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا

(کا) جب تین آدمیوں میں صلاح مشورہ ہوتا ہے تو وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور جب پانچ آدمیوں میں صلاح مشورہ ہوتا ہے تو ضرور ان کا چھٹا وہ ہوتا ہے اور اس سے کم ہوں یا زیادہ اور کہیں بھی ہوں وہ ضرور ان کے ساتھ ہوتا ہے

(نوٹ :. ان آیات کے ساتھ اس آیت مبارکہ کو بھی مدِ نظر رکھو:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ

یعنی اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے الخ

یعنی ساری کائنات کچھ نہیں مگر اسی کا جلوہ ذات ہے۔ ۱۲

اب پڑھیئے اس شعر کو۔

تا نہ رمز لا الٰہ آید بدست

بند غیر اللہ را نتواں شکست

یعنی جب تک یہ حقیقت دل پر نقش نہ ہو جائے کہ

(ا) غیر اللہ (کائنات) کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(ب) یعنی یہ کائنات حقیقی معنوں میں موجود ہی نہیں ہے اسلئے

(ج) یہاں کسی شئی میں نہ کوئی قوت ہے نہ طاقت۔

(د) جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے

نفع اور ضرر، عزت اور ذلت، زندگی اور موت، صحت اور مرض، تونگری اور افلاس، روزی کی کشادگی یا تنگی، غرضیکہ ہر بات اسکے اختیار (قبضہ قدرت) میں ہے۔

اسلئے کسی انسان سے ڈرنے یا خوفزدہ ہونے یا کسی قسم کی توقع رکھنے یا کسی کی اطاعت کرنے کی مطلق حاجت نہیں ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ انسان غیر اللہ کی قید (غلامی) سے صرف اس وقت

رہائی پا سکتا ہے جب وہ یہ یقین پیدا کر لے کہ

لا موجود الا اللہ

اور یہی رمز لا الٰہ الا اللہ ہے۔

جب ایک انسان لا الٰہ الا اللہ کے رمز حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو جاتا ہے یعنی جب یہ عقیدہ اس کے دل و دماغ میں راسخ ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے تو وہ دنیا میں عوام تو درکنار، بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ کیوں؟ اسلئے کہ یہ صداقت اس پر واضح ہو جاتی ہے کہ یہ بادشاہ دراصل میری طرح ہی عاجز، درماندہ، بیکس اور محتاج (فقیر الی اللہ) ہے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ اس میں کوئی طاقت ہی نہیں ہے جب تک خدا بھی نہ چاہے اس کا چاہا ہو ہی نہیں سکتا۔[1]

میں بھی ممکن یہ بادشاہ بھی ممکن، میں بھی مخلوق یہ بادشاہ بھی مخلوق، میں بھی عاجز اور محتاج (فقیر الی اللہ) یہ بادشاہ بھی عاجز اور محتاج زندگی اور موت میرے اختیار میں نہیں ہے تو اس بادشاہ کے اختیار میں بھی تو نہیں

---

[1] قرآن حکیم میں اس مضمون کی بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں اس جگہ صرف ایک آیت درج کرتا ہوں۔

ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ (۱۸ - ۳۹)

جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے (اور کسی میں کوئی قوت نہیں جبتک اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو۔ اسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

ہیں. میں اگر خالی ہاتھ آیا تھا۔ اور خالی ہاتھ دنیا سے جاؤں گا تو یہ بادشاہ بھی خالی ہاتھ ہی جائے گا۔

الغرض جب یہ بادشاہ بھی میری طرح عاجز اور محتاج ہے تو پھر میں اس کے آگے ہاتھ کیوں پھیلاؤں؟ اس سے توقعات کیوں وابستہ کروں؟ اس سے خوف کیوں کروں؟ اس کی اطاعت کیوں کروں؟

جب یہ حقیقت دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے تو پھر انسان کی نگاہ میں بادشاہ کی حیثیت پرکاہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ انہیں یہ لکھ کر سمجھا دیتا ہے

بازگیر ایں عامل بد گوہرے
ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے

اب میں اس بند کے بقیہ اشعار کا مطلب مجموعی طور پر سپرد قلم کرتا ہوں کیونکہ ان سب میں مذکورہ بالا بنیادی تصور یعنی رمز لا الٰہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ موحّد (مرد خدا) کی پہلی منزل لا الٰہ ہے یعنی پہلے وہ

لے اس شعر میں اقبال نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ملک غالب گورنر (صوبہ دار) پانی پت نے حضرت بو علی شاہ قلندر کے ایک مرید کو ایذا پہنچائی تھی اس پر حضرت قلندر نے اس کے آقا سلطان علاؤ الدین خلجی کو حسب ذیل عتاب نامہ تحریر فرمایا تھا۔

علاؤ الدین مخرہ دہلی را غلام ککہ خواجہ سرائے، یکے از درویشاں را رنجانید و عرش الرحمٰن در لرزہ آمد. اگر او را بسزا نرسانید ی ہنوز ورنہ بجائے تو تخنہ ، دیگرے بدہلی نشانیدہ خواہد شد۔

شان قلندری ملاحظہ کے لائق ہے کہ سلطان علاؤ الدین خلجی جیسے مطلق العنان اور خود مختار اور باجبروت حکمران کو جس کی سلطنت از اٹک تا گنگ وسیع تھی محض شحنۂ دہلی لکھ کر خطاب کیا ہے۔ ۱۲

غیر اللہ کی نفی کرتا ہے نفی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرتا ہے۔ کہ اس کائنات میں کوئی ہستی مجھ سے بڑی یا مجھ پر حکمران نہیں ہے کیونکہ سب میری ہی طرح عاجز اور محتاج اور مخلوق ہیں۔

جب یہ عقیدہ کسی ملت (قوم) کے افراد میں ایک زندہ حقیقت بن جاتا ہے تو وہ قوم نئی زندگی حاصل کر لیتی ہے یعنی انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جاتی ہے غیر اللہ کے سامنے لا الہ کہنا یعنی غیر اللہ سے یہ کہنا کہ تیری کوئی حقیقت نہیں ہے کہنے والے کو زندگی (حریت) عطا کر دیتا ہے مگر ہر شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا صرف وہی شخص اس پر قادر ہو سکتا ہے جو حقیقی معنی میں موحد بن جائے۔

اگر کسی شخص میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی مجھ پر حکمران نہیں ہو سکتی تو وہ شخص ہزاروں انسانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے، بے عمل (رہ نشین) انسانوں کو با عمل (رہ نورد) بنا سکتا ہے۔

بزرگان دین کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے اس شعر کی صداقت واضح ہو سکتی ہے مثلاً خواجگان چشت نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔

کہتے ہیں کہ اگر تم کسی غلام (بندہ) کو اس کے آقا (خواجہ) کے خلاف صف آرا کرنا چاہتے ہو تو اسے اس حقیقت سے آگاہ کر دو کہ لا الہ الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی ہستی اس لائق نہیں ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے

جس شخص کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہو جائے کہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی مجھ پر غالب (حکمراں) نہیں ہے۔ سلاطین اس سے اس طرح لرزہ براندام ہو جائیں گے جس طرح قیامت کے تصور سے انسانوں کے حواس

گم ہو جاتے ہیں۔

لا الٰہ کی ضرب، آواز نے نہیں ہے بلکہ بجلی کا کڑکا ہے اس کی ضرب میں یہ طاقت ہے کہ ہر ہستی (بود) نیستی (نبود) ہو جاتی ہے یعنی لا الٰہ کی بدولت اس کائنات کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لا الٰہ کہنے والا "گرداب وجود" یعنی کائنات کے طلسم سے آزاد ہو جاتا ہے۔

ع تا برون آئی ز گرداب وجود

اس مصرع میں اقبال نے "وجود" کو کائنات کے معنی میں استعمال کیا ہے گرداب کہتے ہیں بھنور کو جس میں پھنس کر انسان غرق ہو جاتا ہے چونکہ کائنات کی دلچسپیوں میں منہمک ہو کر انسان حقیقت سے بیگانہ ہو جاتا ہے اس لئے کائنات کو گرداب سے تشبیہ دی ہے۔

اقبال کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات درحقیقت ایک طلسم یا فریب نظر ہے دنیا کی زندگی درحقیقت دھوکہ کی پونجی ہے[1] مگر انسان اپنی جہالت کی وجہ سے اس دنیا کو موجود سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کے حصول میں منہمک ہو کر خدا سے غافل ہو جاتا ہے بلکہ اسی کو اپنا مقصد حیات بنا لیتا ہے اس طلسم سے نکلنے کی صورت یہ ہے کہ انسان اس طلسم کو لا الٰہ کی ضرب پیہم سے پاش پاش کر دے۔

قرآن حکیم نے دنیا کی زندگی کو "دھوکے کی پونجی" قرار دیا ہے انسان اپنی جہالت کی بنا پر اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ دنیا اور اس کی نعمتیں مدار ہیں اس لئے انہیں حاصل کرنا چاہیئے اور ان کے حصول میں وہ ایسا منہمک ہوتا

---

[1] وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ہ (۵۷ - ۲۰)
اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر دھوکہ کی پونجی۔

ہے کہ خدا سے غافل ہو جاتا ہے قرآن نے اسے مذموم قرار دیا ہے۔

اسلام کی رو سے تمام دنیاوی نعمتوں سے تمتع تو جائز ہے مگر حصول دنیا میں ایسا انہماک کہ انسان خدا سے غافل ہو جائے ممنوع ہے۔ دنیا مذموم نہیں ہے دنیا میں منہمک ہو جانا مذموم ہے۔

چیست دنیا؟ از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس دھوکہ (گرداب وجود) سے جو چیز انسان کو نجات دے سکتی ہے وہ لا الٰہ الا اللہ ہے یعنی اللہ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی ہستی ہی موجود نہیں ہے لہٰذا یہ کائنات اس لائق ہی نہیں کہ اسے مقصود حیات بنایا جائے یا اس سے دل لگایا جائے۔

جب تک ایک انسان لا الٰہ الا اللہ کے حقیقی مفہوم یعنی لاموجود الا اللہ کو ذہن نشین نہ کرے اس وقت تک وہ گرداب وجود (کائنات) کے طلسم سے رہائی نہیں پا سکتا۔ اور جب تک وہ اس طلسم سے آزاد نہ ہو خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لئے عرفا نے یہ کہا ہے۔ کہ جب تک ایک مسلمان وحدۃ الوجود کا قائل نہ ہو اس وقت تک اس کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ وحدۃ الوجود کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے جب یہ حقیقت موحد کے دل میں جانشین ہو جاتی ہے تو وہ لامحالہ دنیا سے قطع نظر کر کے صرف اللہ کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے۔ اور سب سے بے تعلق ہو کر اسی کا ہو رہتا ہے اور اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ اللہ تو ہم سے یہی چاہتا ہے۔ کہ ہم اسی کے ہو رہیں۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلعم سے مخاطب ہوتا ہے۔

(واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا (۷۳ - ۸)

اور اپنے رب کے نام کو یاد کرتے رہئے اور سب دنیا کی دلچسپیوں سے قطع نظر کر کے یعنی سب سے منہ توڑ کر اسی کے ہو رہیے

اب میں ناظرین سے یہ کہہ کر اس بحث کو ختم کر دیتا ہوں کہ جب تک ایک شخص کے دل میں یہ صداقت جاگزیں نہ ہو جائے کہ

لا موجود الا اللہ

جب تک کائنات کی ہر شئی کی نفی نہ ہو جائے جب تک یہ یقین حاصل نہ ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی حقیقی معنی میں موجود ہی نہیں ہے اس وقت تک کوئی شخص خواہ وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے ماسوی اللہ سے قطع نظر کر کے اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا

اسی لئے صوفیائے کرام نے اور ان کی تقلید میں اقبال نے ہمیں یہ تلقین کی ہے کہ پہلے ہر موجود کی نفی کرو تاکہ ہر موجود سے قطع تعلق عقلاً اور عملاً ممکن ہو سکے اور جب یہ کائنات نگاہوں میں ہیچ ہو جائے گی تو قدرتی طور پر انسان کی توجہ موجود حقیقی (اللہ) کی طرف مبذول ہو جائیگی

لا الہ الا اللہ کے پہلے جز یعنی لا الہ کے مراقبہ سے انسان میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ماسوی اللہ کی نفی کر دیتا ہے اور نفی کے بعد صرف اللہ جو موجود حقیقی ہے باقی رہ جاتا ہے۔

مرشد رومی نے ان اشعار میں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے۔

تیغ لا در قتل غیر حق براند   در نگر زاں پس کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت   شاد باش اے عشق شرکت سوز زفت

مطلب ان اشعار کا یہ ہے کہ جب عشق حقیقی یعنی لا الہ کی تلوار غیر

حق (ماسوی اللہ) کو فنا کر دے کیونکہ مخلوق کی تو اسے مخاطب! اس پر غور کر کہ لا الٰہ کے بعد باقی کیا رہا؟ اس کے بعد تو دو جواب دیتے ہیں۔ کہ صرف اللہ باقی رہ گیا۔ ماسوی اللہ یکسر فنا ہو گیا۔

اسی مضمون کو عارف جامی نے یوں ادا کیا ہے

گر نہنگے ست کائنات آشام	عرش تا فرش درکشید بکام
ہر کجا کردہ این نہنگ آہنگ	از من و ما نہ بے ماندہ نہ رنگ

انہی بزرگوں کی تقلید میں اقبال نے بھی یہ تاکید کی ہے۔

بر سر ایں باطل حق پیرہن

تیغ لاموجود الا ھو بزن

مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات درحقیقت باطل ہے یعنی معدوم ہے مگر التباس بالحق کی وجہ سے موجود نظر آتی ہے اسلئے اے مخاطب تو لاموجود الاھو کی تلوار سے اسے فنا کر دے

خلاصہ کلام اینکہ جب تک ایک مسلمان وحدۃ الوجود پر ایمان نہ لائے اس وقت تک وہ ماسوی اللہ کی غلامی سے نجات نہیں پا سکتا یعنی گرداب وجود سے باہر نہیں نکل سکتا۔

دوسرا بند:۔ اس بند میں اقبال نے مغلوں کی تاریخ سے لا الٰہ کی تاثیر کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب تک انہوں نے لا الٰہ کو مدار زندگی نہیں بنایا۔ وہ بدترین قسم کی غلامی میں گرفتار رہے لیکن جب انہوں نے اس کلمہ کے اقتضاء پر عمل کیا تو لات و منات یعنی تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اور اگرچہ وہ دنیا میں رہے مگر علائق دنیوی سے آزاد ہو گئے

؎ در جہات، آزاد از بند جہات

بہت بلیغ مصرع ہے صنعت تضاد کی وجہ سے اس میں بڑی دلکشی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے دنیا فتح کر لی مگر اسکو مقصود حیات نہیں بنایا۔ جہات کنایہ ہے دنیا سے بند جہات کنایہ ہے علائق دنیوی یا محبت مال و زر سے۔ یعنی دنیا میں رہے مگر اس سے تعلق خاطر پیدا نہیں کیا۔

انہوں نے اسی کلمہ کی بدولت قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے صحراؤں اور سمندروں میں اپنی یلغاروں سے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور یہ ہنگامہ حرف لا الٰہ کی بدولت برپا ہوا۔ اسی کی بدولت انہوں نے نئی دنیا پیدا کر دی آج دنیا میں علوم و فنون کی جس قدر گرم بازاری ہے ان سب کی بنیاد انہوں ہی نے ڈالی تھی۔

اینکہ شمع لالہ روشن کردہ اند
از کنار جوئے او آوردہ اند

اس شعر میں اقبال نے عربوں کی ان خدمات جلیلہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو انہوں نے تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کے سلسلہ میں انجام دیں۔ آج دنیا میں جس قدر سائنٹفک ترقی نظر آ رہی ہے اس کی داغ بیل عربوں ہی نے ڈالی تھی۔ انہوں ہی نے یورپ کو جملہ علوم و فنون سے روشناس کیا۔

آخری شعر میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جب عربوں نے غیر اللہ کا تصور اپنے دل سے نکال دیا یعنی جب یہ عقیدہ انکے دل میں راسخ ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی یا قوم ہم پر حکمران نہیں ہو سکتی تو

؏ از کف ما کشتی دو صد ہنگامہ رست

لہذا اگر موجودہ زمانہ کے مسلمان دنیا میں از سر نو ہنگامہ برپا کرنا چاہتے ہیں یعنی اگر وہ دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کے آرزو مند ہیں تو انہیں کلا

الٰہ الا اللہ کے مفہوم پر عمل کرنا چاہیے۔ یعنی یہ عقیدہ اپنے دل میں راسخ کر لینا چاہیے۔ کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی ہم پر حکمران نہیں ہو سکتی اور وجہ اس کی محض یہ ہے۔ کہ اللہ کے سوا کوئی شے درحقیقت موجود ہی نہیں ہے اور جب موجود ہی نہیں تو حکمران کیسے ہو سکتی ہے؟ خلاصہ کلام اینکہ جب تک ماسوی اللہ کی نفی نہ کر دی جائے اسکے طلسم سے رہائی نصیب نہیں ہو سکتی۔

تیسرا بند :- اس بند میں انہوں نے انقلاب روس سے استشہاد کیا ہے۔ جو ۱۹۱۷ء میں واقع ہوا ناظرین کی آگاہی کے لئے ذیل میں اس انقلاب عظیم کی مختصر تاریخ درج کرتا ہوں۔

انقلاب روس کا بانی لینن ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا ۱۸۸۷ء میں قازان یونیورسٹی میں قانون پڑھنے گیا مگر باغیانہ خیالات کا اظہار کرنے کے جرم میں اس کو درسگاہ سے خارج کر دیا گیا۔ اخراج کے بعد اس نے کارل مارکس کے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ مزدوروں اور کاشتکاروں کی بہبود کے لئے اشتراکی نظام کا قیام ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے اس مقصد کے حصول کیلئے ایک یونین بنائی اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اشتراکی عقائد و افکار کی اشاعت شروع کی۔ اس جرم کی پاداش میں اسے جلا وطن کر دیا گیا ۱۹۰۰ء میں اس نے جرمنی میں پناہ لی۔ اور ۱۹۰۵ء میں روس واپس آیا۔ اور ٹراٹسکی کی معیت میں مزدوروں کی تنظیم شروع کی کچھ عرصہ کے بعد اسے میکسم گورکی کی رفاقت حاصل ہو گئی ۱۹۱۲ء میں اس نے اپنے خیالات کی اشاعت کیلئے ایک اخبار (PERVADA) جاری کیا اور چند سال کے عرصہ میں عوام الناس کا لیڈر بن گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں انقلاب برپا ہو گیا نکولس ثانی (زار روس) اور اس کے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اس انقلاب میں ٹراٹسکی نے لینن سے بڑھ کر شاندار کارنامے انجام دیئے۔ قوم نے لینن کو اپنا

نجات دہندہ تسلیم کیا۔ اور وہ ۱۹۱۷ء سے لیکر تادم وفات (۱۹۲۴ء) زار روس سے بھی بڑھ کر مطلق العنانی (آمریت) کے ساتھ حکمران رہا۔ اس نے چھ سال کے اندر روس میں اشتراکی نظام بہت استوار بنیادوں پر قائم کر دیا۔ اور آج امریکہ کے بعد یہ ملک دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے اب ہم اس بند کی شرح لکھتے ہیں۔

کہتے ہیں ہمارے زمانہ میں روس میں عوام (بندگی) اور ملوکیت (خواجگی) کے درمیان جنگ واقع ہوئی جب روسی عوام ملوکیت کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئے (قلب جگر خون گردید) تو انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ہم پر کوئی حکمران نہیں ہے (از ضمیرش لا الٰہ بروں آمد) چنانچہ انہوں نے زار روس کا خاتمہ کر دیا (نظام کہنہ را برہم زدہ)

کہتے ہیں کہ میں نے روسیوں کے نظام نو (اشتراکیت) کا مطالعہ کیا ہے اس نظام کی بنیادی تعلیمات حسب ذیل ہیں:-

لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ

یعنی اشتراکیت، ملوکیت، کلیسا اور خدا تینوں کی منکر ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس بند میں اشتراکیت کے معاشی نظام پر تنقید نہیں کی ہے۔ صرف یہ دکھایا ہے کہ اشتراکیت نے ملوکیت، کلیسا اور خدا کا انکار کیا ہے چونکہ اقبال بھی ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت (کلیسا) کے خلاف ہیں اس لئے انہوں نے آئندہ اشعار میں اشتراکیت کی اس غلطی کو واضح کیا ہے کہ انسان کو محض لا الٰہ کہنے سے اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا اس کے بعد الا اللہ کہنا بھی ضروری ہے۔

در مقام لا نیا ساید حیات
سوئے الا می خرامد کائنات

یعنی انسان کی فطرت اور اس کی عقل دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ لا الٰہ کے

بعد الا اللہ پر بھی ایمان لایا جائے۔ کیونکہ جب تک خدا یعنی خالق کائنات کو تسلیم نہ کیا جائے کائنات کی گتھی نہیں سلجھ سکتی۔

ع نفی ہے اثبات مرگ امتاں

مارکس کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ اس کائنات کی حقیقت ہے اور انسان سالمات مادی کے امتزاج کا نتیجہ ہے لیکن یہ مفروضہ تجربہ اور عقل دونوں کے خلاف ہے آج تک کوئی مادہ پرست یہ ثابت نہیں کر سکا کہ

(ا) نفس مدرک، مادہ کی پیداوار ہے یا

(ب) مادہ ترقی کر کے باشعور ہستی (انسان بن گیا یا

(ج) مادہ اس کائنات کا خالق اور صانع ہے۔

ناظرین کی آگاہی کے لئے ذیل میں مسلک مادیت پر مختصر تنقید سپرد قلم کی جاتی ہے۔

مادہ پرستوں کا دعویٰ یہ ہے کہ کائنات میں مادہ کے علاوہ اور کسی شی مثلاً خلا یا روح کا وجود نہیں ہے نیز مادہ ازلی، ابدی، ناقابل فنا اور متحرک بالذات ہے شعور، ادراک اور تفکر یہ سب دماغی حالات اور کیفیات، سالمات مادی کی حرکت کا نتیجہ ہیں۔

فی الجملہ مادیات کی بنیاد اسی قسم کے دعاوی پر ہے جن کا کوئی ثبوت مادہ پرستوں کے پاس نہیں ہے انتہا یہ ہے کہ یہ لوگ آج تک مادہ کی کوئی جامع اور مانع تعریف بھی پیش نہیں کر سکے لیکن نے اس کمزوری کو محسوس کر کے مادہ کی تین تعریفیں کی ہیں مگر وہ بھی تسلی بخش نہیں ہیں مثلاً تیسری کا تعریف یہ ہے۔

مادہ وہ ہے جو ہمارے حواس پر عمل کر کے احساسات پیدا کرتا ہے۔ یہ

تعریف منطقی اعتبار سے ناقص بھی ہے اور مبہم بھی ہے۔

ناقص اسلئے ہے کہ یہ تعریف، تعریف نہیں ہے بلکہ ایک دعویٰ ہے بلا دلیل اور مبہم اس لئے ہے کہ اس سے مادہ کی ماہیت کا کوئی علم حاصل نہیں ہوتا۔

چونکہ مادہ پرست یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شعور سالمات مادی کے امتزاج باہمی کی بدولت رونما ہوتا ہے اس لئے ہم ذیل میں ارباب سائنس کی تحقیقات کا خلاصہ درج کرتے ہیں جس سے مادہ پرستوں کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ بلکہ مسلک مادیت کی بیخکنی ہو جاتی ہے۔

(۱) جب سائنس والوں نے مادہ کی ماہیت معلوم کرنے کی غرض سے سالمات مادی (ATOMS) کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ اُن سے خاص قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں جن سے ریڈیم اور یورنیم بنتے ہیں۔ ان کا اصطلاحی نام الیکٹران یا (برق پارے) ہے۔

لیکن یہ برق پارے مادی نہیں ہیں بالفاظ دیگر ان پر مادی شئی SUBSTANCE کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ الیکٹران دراصل بجلی کا چارج ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مادہ کی حقیقت مادی نہیں ہے بلکہ وہ ایک قسم کا نظام توانائی (ENERGY SYSTEM) ہے۔

گویا جدید تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ سالمہ (Atom) جسے انیسویں صدی میں ناقابل تقسیم اور ناقابل فنا سمجھا جاتا تھا۔ اب ایک مخلوق شئی ثابت ہو چکا ہے۔ کیونکہ وہ توانائیوں کا مرکب ہے۔ اور یہ بات منطقی طور پر مسلم ہے کہ ہر مرکب حادث (مخلوق) ہوتا ہے۔

(۲) مادہ کی ماہیت معلوم کرنے (حقیقت کی تلاش) کے سلسلہ میں ہم برق تک پہونچے اب ہم پھر عالم طبیعات سے دریافت کرتے ہیں کہ برق کیا ہے؟ وہ

جواب دیتا ہے کہ میں نہیں جانتا۔ مگر میرا قیاس یہ ہے کہ برقی ذرات، ایتھر (Ether) میں دباؤ (Strain) سے عبارت ہیں۔ بالفاظ دگر برقی ذرات کی ماہیت توانائی (Energy) ہے۔

(۳) اب ہم پھر سوال کرتے ہیں کہ توانائی کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا جواب بھی سائنسدان یہی دیتے ہیں۔ کہ ہمیں نہیں معلوم۔ مجبوراً ہم فلسفی سے پوچھتے ہیں کہ مادہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ہم نے اس کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مالی کیولیس (Molecules) سے مرکب ہے اور وہ سالمات (Atoms) سے مرکب ہیں اور وہ الیکٹرانس (برق پاروں) سے مرکب ہیں اور الیکٹران ایک قسم کی توانائی ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ توانائی کی ماہیت کیا ہے؟ فلسفی اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ توانائی کی ماہیت ارادہ (Will) ہے جسے آپ روحانی توانائی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ارادہ کوئی مادی یا ٹھوس شئی نہیں ہے چنانچہ پروفیسر جمیز لی لکھتا ہے کہ اب ہمیں مادہ کے بجائے توانائی کو تسلیم کرکے اپنے فلسفہ توانائی (DYNAMINISM) کو از سر نو مرتب کرنا چاہیئے۔ اور ارباب علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ فلسفہ روحانیت کی ایک خاص شکل ہے۔

(۴) برٹرینڈرسل کا قیاس یہ ہے کہ کائنات کی اصل تین چیزیں ہیں (۱) برقی پارے (۲) ایٹم یا ان کے مراکز (۳) سالمات فعلیت اور اگر ہم (۱) اور (۲) کو ایتھر میں دباؤ کی کیفیت قرار دے دیں جیسا کہ قرین عقل ہے تو ایتھر کو کائنات کی اصل قرار دے سکتے ہیں

لیکن ہم پھر وہی سوال کرتے ہیں کہ ایتھر کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا جواب بھی حسب معمول نفی میں ہے یعنی من نمی دانم۔

ہر ایک بات یہ کہتا تھا من نمی دانم
یہ بات سچ ہے کہ اکبر بڑا ہی عالم تھا

(۵) ہم مادہ کی ماہیت معلوم کرنے چلے تھے تو ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اس کی ماہیت توانائی ہے اور توانائی کی ماہیت روح سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے یعنی نکلے تھے مادہ کی تلاش میں، دوچار ہو گئے روح سے یا تفاوت ہے کہ کائنات کی اصلی بنیاد یا حقیقت مادہ نہیں بلکہ روح ہے۔

جو صداقت سائنسدانوں پر بیسویں ہجری عیسوی میں منکشف ہوئی قرآن حکیم نے اسے ساتویں صدی میں ان الفاظ بیان کر دیا تھا:

اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہی آسمانوں اور زمین (کائنات) کا نور ہے۔

بقول شیخ اکبرؒ جسے ہم کائنات کہتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے مگر جلوۂ ذات ہے یعنی جلوہ ذات کا دوسرا نام کائنات ہے۔

اسی صداقت کو مرشد رومیؒ نے یوں بیان کیا ہے:

جملہ معشوق است و عاشق پردہ

زندہ معشوق است و عاشق مردہ

ناظرین کی آگاہی کے لئے اس شعر کا مطلب ذیل میں درج کرتے ہیں:

جملہ معنی ہمہ معشوق یعنی اوا یعنی مرشد رومی نے ہمہ اوست کی تعلیم دی ہے عاشق سے مراد کل ممکنات ہے۔ پردہ سے موجود ظاہری مراد ہے جو حجاب ہے موجود حقیقی کا۔ مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ نظر آتا ہے سب اسی معشوق حقیقی کا جلوہ ذات ہے یعنی ممکنات بظاہر موجود نظر آتے ہیں مگر درحقیقت معدوم ہیں ان تمام ممکنات میں سے کوئی ممکن (شئی) بذات خود حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ صرف ایک ذات حق حقیقی معنی میں یعنی بذات خود موجود ہے اور یہ تمام ممکنات اسی ذات حق کے اسماء وصفات کے عکوس و آثار ہیں

اسی مضمون کو شاہ نیاز احمد صاحب چشتی بریلوی نے یوں بیان کیا ہے

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا

از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا

اور خواجہ میر درد نے اسی نکتہ کو یوں ادا کیا ہے:

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا

اعیاں ہیں سب مظاہر ظاہر ظہور تیرا

پاکان امت[1] کے پیرو صادق اقبال مرحوم نے بھی اپنی تمام تصانیف نظم و نثر میں اسی حقیقت کو مختلف الفاظ میں واضح کیا ہے۔ ان کی رائے میں مادہ اور روح میں بلحاظ اصل کوئی فرق نہیں ہے۔ جسے ہم مادہ کہتے ہیں وہ درحقیقت روح کی ایک کثیف شکل ہے۔ ضرب کلیم میں اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:-

عقل ہے مدت سے اس پیچاک میں الجھی ہوئی

روح کس جوہر سے؟ خاک تیرہ کس جوہر سے ہے

میری مشکل! مستی و سوز و سرور و درد و داغ

تیری مشکل مے سے ہے ساغر کہ مے ساغر سے ہے؟

---

[1] اقبال کے نادان دوست خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں، تصوف اور وحدت الوجود کا تذکرہ ہی انتخفاف کیوں نہ کریں مگر اقبال تو ساری عمر وحدۃ الوجود ہی کا نغمہ جانفزا سناتے رہے اور ارباب تصوف کی تقلید اور اتباع پر فخر کرتے رہے۔ اس جگہ صرف ایک رباعی لکھتا ہوں:-

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم   حدیث عشق بے باکانہ گفتم

شنیدم آنچہ از پاکان امت   ترا با شوخی رندانہ گفتم

مشکل کا بیان کرنے کے بعد خود اسے یوں حل کرتے ہیں :۔

ارتباطِ حرف و معنی ؟ اختلاطِ جان و تن

جس طرح اخگر قبا پوش اپنی پیراہن سے ہے

یعنی روح اور مادہ میں اصلیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے جو فرق نظر آتا ہے یہ محض کیفیت کے اعتبار سے ہے۔

خطبہ الہ آباد میں لکھتے ہیں :۔

"MATTER IS ALSO SPRIT REALISING ITSELF IN SPACE AND TIME"

یعنی مادہ بھی روح ہی ہے جو بقید زمان و مکان اپنا تحقیق کر رہا ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ، مادہ پرستوں کا دعویٰ یہ تھا کہ مادہ ہی اس کائنات کی حقیقت یا اصل ہے۔ لیکن پھر عصر حاضر کے سائنسدانوں نے اپنی تحقیقات سے ثابت کر دیا ہے کہ مادہ توانائی میں تبدیل ہو سکتا ہے اور توانائی کوئی مادی چیز نہیں ہے بالفاظ دگر مادہ اور توانائی ایک ہی شے کے دو نام ہیں یعنی مسلک مادیت کا خاتمہ ہو گیا۔

باز آمدم بر سر مطلب :۔ اقبال کہتے ہیں کہ

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں

خویش را زیں تندباد آرد بروں

یعنی وہ دن دور نہیں ہے جب روسی قوم انکار خدا کی منزل سے نکلکر اقرار خدا کی منزل تک پہنچ جائے گی، کیونکہ

در مقام لا نیاساید حیات

سوئے الّا می خرامد کائنات

یعنی انکارِ خدا (مسلک مادیت) سے انسان کو آسودگی (تسکین) حاصل نہیں ہو سکتی۔ کائنات کا نظام اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس کا خالق مادہ نہیں ہے بلکہ خدا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا بحث میں واضح ہو چکا ہے۔

اس کے بعد اقبال اپنے مقصود کی طرف رجوع کر کے کہتے ہیں کہ قوموں کی زندگی لا اور الا دونوں کے امتزاج پر موقوف ہے یعنی لا الٰہ کے بعد الا اللہ بھی کہنا چاہیئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی مجھ پر حکمران نہیں ہے۔ جو قوم لا الٰہ کے بعد الا اللہ نہیں کہتی وہ روحانیت اور اخلاق کے اعتبار سے مردہ ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت کو انہوں نے حضرت ابراہیم کی زندگی سے واضح کیا ہے کہ انہوں نے پہلے تمام معبودان باطلہ کی نفی کی۔ اس کے بعد معبودِ برحق کا اثبات کیا جس کی وضاحت یہ ہے کہ کائنات میں جتنی چیزیں ہیں۔ وہ سب فانی اور متغیر اور محتاج ہیں اسلئے ایک ایسی ہستی کا پایا جانا عقلاً ضروری ہے جو باقی ہو اور بذات خود موجود ہو ایسی ہستی حضرت اللہ ہے جو واجب الوجود ہے۔

آخر میں اقبال مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

نعرہ لا پیش نمرودے بزن

یعنی ملوکیت کے خلاف اعلان جنگ کر دے بالفاظ دگر بادشاہوں سے کہہ دے کہ خدا کے سوا مجھ پر اور اس کائنات پر کوئی ہستی حکمران نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھو! جس شخص کے ہاتھ میں لا اللہ کی تلوار آجاتی ہے وہ ساری کائنات پر حکمران ہو جاتا ہے یعنی کلمہ توحید میں یہ طاقت ہے کہ اگر کوئی قوم اس کے اقتضاء پر عمل کرے تو غیر اللہ کی غلامی سے آزادی حاصل کر سکتی ہے۔

فصل ہفتم

فقر

تمہید:- اس مثنوی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں اقبال نے اپنے نظریہ فقر پر ایک مستقل باب باندھا ہے۔ محض اس لیے کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں فقر کی قدر و قیمت اہمیت اور عظمت جاگزیں ہو جائے۔ ذیل میں اس نظریہ کی وضاحت ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔

نظریہ فقر کا ارتقا:- اقبال نے اپنے ابتدائی کلام میں اس لفظ کو لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً بانگ درا میں لکھتے ہیں :-

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پہ ہے مدار قوت حیدری

اس شعر میں انہوں نے فقر کو غنا کے مقابلہ میں یعنی مفلسی کے معنی میں استعمال کیاہے

۱۹۱۵ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۶ء
(اسرار خودی، رموز خودی، پیام مشرق اور زبور عجم) میں انہوں نے اس لفظ کو، جہاں تک مجھے علم ہے، کہیں استعمال نہیں کیا۔

۱۹۳۲ء
جاوید نامہ میں انہوں نے پہلی مرتبہ اس لفظ کو بطور اصطلاح استعمال کیا

۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء
اور اس کے بعد مسافر، بال جبریل، ضرب کلیم، مثنوی پس چہ باید کرد اور ارمغان حجاز ان تمام کتابوں میں انہوں نے اس اصطلاح کی وضاحت کی۔

ان کتابوں میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا

ہے کہ وہ فقر کو خودی کی پختگی، تربیت اور تکمیل کا ثمرہ سمجھتے ہیں یعنی جب خودی اتباع رسول کی بدولت پختہ ہو کر مرتبہ کمال کو پہونچ جاتی ہے۔ تو اس میں شان فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دگر:۔ فقر کمالات انسانی کا دوسرا نام ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے اس اصطلاح کو اسلام کا مرادف قرار دیا ہے:۔

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور

میرا قیاس یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء تک فقر کا تصور ان کے ذہن میں تشکیل پذیر رہا۔ ۱۹۳۱ء میں جاوید نامہ میں انہوں نے اس کو ایک نظریہ کے طور پر پیش کیا۔ اور ضرب کلیم میں یہ نظریہ ان کے لئے ایک عقیدہ بن گیا کیونکہ ۱۹۳۶ء سے تا دم وفات انہوں نے اس اصطلاح کی تبلیغ اسی جوش و خروش اور یقین محکم کے ساتھ کی جس طرح کوئی شخص اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرتا ہے کون شخص ہے جو حسب ذیل اشعار کو پڑھ کر اس نتیجہ پر نہیں پہونچے گا کہ شان فقر سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی کمال متصور نہیں ہو سکتا۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندہ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقین — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ (بال جبریل)

فقر کا لغوی معنی:۔ امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لفظ فقر کے

حسب ذیل معانی لکھے ہیں :-

(الف) وجود الحاجۃ الضروریہ یعنی ان حاجات کا پایا جانا جن سے کسی انسان کو کسی وقت مفر نہیں ہے مثلاً ہوا، پانی، آگ، روشنی اور غذا یعنی فقر کے اصلی اور لغوی معنی احتیاج کے ہیں۔

(ب) عدام المقتنیات یعنی سامان معیشت کا نہ ہونا یعنی فقیر وہ ہے جس کے پاس زندگی بسر کرنے کا سامان نہ ہو۔

(ج) فقر النفس یعنی طبیعت میں حرص و طمع کا ہونا جس کی وجہ سے انسان ہر وقت مختلف اشیاء کا حاجتمند خواستمند طلبگار یا محتاج رہتا ہے۔ چنانچہ کاد الفقر ان یکون کفراً میں اسی افتقار نفس کی طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ فقر (مفلسی، حاجتمندی، احتیاج ضرورت) وہ بری بلا ہے کہ کبھی کبھی انسان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے۔

(د) الفقر الی اللہ یعنی نفس کی وہ حالت جب انسان ہر وقت اپنے آپ کو خدا کا محتاج یقین کرے یعنی یہ ایمان و ایقان اس کے لئے بمنزلہ حال بن جائے کہ

(الف) میں اپنی ہستی اپنی ذات اور اپنے وجود سب کے لئے اللہ کا محتاج ہوں۔ اگر وہ مجھے موجود نہ کرتا تو میں از خود ہرگز موجود نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ مجھ میں اس کی قدرت ہی نہیں ہے۔

(ب) میں اپنے وجود کو از خود ہرگز برقرار نہیں رکھ سکتا اس لئے میں اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں اس کی صفت قیومیت کا محتاج ہوں یعنی اس کی بدولت زندہ ہوں۔

(ج) اگر اس کا فضل و کرم شامل حال نہ ہو تو میں کسی قسم کی کامیابی حاصل

نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھ میں تو بذاتِ خود کوئی قوت یا خوبی ہے ہی نہیں [1]

(د) خلاصہ کلام اینکہ میں اپنی زندگی اور اس کے تسلسل کے لئے بھی اللہ کا محتاج ہوں۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں بھی ہر وقت اس کا دست نگر ہوں [2]

چنانچہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا میں فقر کو اسی احتیاج کے معنی میں استعمال فرمایا ہے :-

اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْکَ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْکَ

اے اللہ! مجھے اپنا محتاج بنا کر (ساری دنیا سے غنی کر دے اور اپنی ذات سے مستغنی کر کے (ساری دنیا کا) محتاج مت بنائیو۔

قرآنی مفہوم :- قرآن حکیم میں "فقر" احتیاج اور مفلسی کے معنوں میں آیا ہے۔

(ا) یٰاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ج وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۵

اے لوگو! تم سب (اپنی ہستی کے لئے) اللہ کی طرف محتاج ہو (اور اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ) تو غنی (بے نیاز بے پروا) اور لائق حمد و ثنا ہے (۳۵ - ۱۵)

(ب) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ الخ (۹ - ۶۰)

بلاشبہ صدقات تو مفلسوں اور محتاجوں کے لئے ہیں

---

[1] اسی مضمون کو ایک ہندی شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

ــــ سا ئیں اکھیاں پھیر ہاں تو پھیری کا ٹھک جہان
ٹک اکھیاں مہر کی تو لاکھوں کریں سلام

[2] اسی مضمون کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

بے تو از خواب عدم چشم کشودن نتواں
بے تو بودن نتواں، با تو نمودن نتواں

(پیام مشرق)

(ح) الشیطان یعدکم الفقر الخ (۲ — ۲۶۸)

شیطان تم کو مفلسی سے ڈراتا ہے۔

قرآنی مفہوم کی وضاحت:۔ اگرچہ قرآن حکیم نے فقر کو احتیاج اور مفلسی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مگر اسی معنی میں اقبال کا اصطلاحی مفہوم بھی پوشیدہ ہے جس کی تشریح انہوں نے جاوید نامہ سے لیکر ارمغان حجاز تک ہر تصنیف میں کی ہے۔ ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت کی جاتی ہے۔

(ا) قرآن حکیم انسانوں کو فقراء (محتاج) حاجتمند اور اللہ کو غنی (بے نیاز حاجات سے بالاتر) قرار دیتا ہے۔

(ب) فقر اور غنا ایک دوسرے کی ضد ہیں جس طرح نیازمندی اور بے نیازی

(ج) اللہ کی ذات میں غنا بے نیازی ہے کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ اپنے وجود کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا وجود خانہ زاد ہے۔ یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں وہ واجب الوجود ہے۔

(د) انسان کی ذات میں فقر (نیازمندی، احتیاج اور بیچارگی) ہے کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ اپنے وجود کے لئے اللہ کا محتاج ہے۔ اس کا وجود مستعار ہے اللہ کا عطا کردہ ہے۔ یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں وہ ممکن الوجود ہے[۱]

---

[۱] یہیں سے شیخ اکبر نے یہ عقیدہ مستنبط کیا ہے کہ صفت افتقار و احتیاج ممکن (انسان) کی ذات میں داخل ہے۔ جو کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتی چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

فالعبد عبد وان ترقی۔ والرب رب وان تنزل

عبد (انسان) ہمیشہ عبد ہی رہیگا۔ خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے۔ اور (رب) اللہ ہمیشہ رب ہی رہیگا خواہ وہ کتنا ہی تنزل کیوں نہ فرمائے۔

(۷) چونکہ انسان بروئے قرآن اپنے وجود کے لئے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اس لئے عقلی طور پر ہر بات میں ہر معاملہ میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر پہلو اور ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے ظاہر ہے کہ جب وہ اپنی ذات کیلئے حق تعالیٰ کا محتاج ہے تو اپنی صفات (علم، قدرت، ارادہ حرکت فعل سمع، بصر کلام حکومت اقتدار، غرضیکہ جملہ صفات وجودیہ ایجابیہ) میں بدرجہ اولیٰ حق تعالیٰ کا محتاج ہوگا چنانچہ قرآن حکیم اس پر شاہد ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ ہی بذات خود موجود ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اس کے سوا اور کوئی ہستی مستقل بالذات اور از خود موجود (واجب الوجود) نہیں ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝ (۲۱۔۳۰)

یہ جملہ شواہد مذکورہ بالا اس صداقت پر دلیل ہیں کہ صرف اللہ ہی الحق (واجب الوجود) اور قائم بالذات ہے اور بلا شبہ اس کے سوا جس کسی کو بھی وہ لوگ پکارتے ہیں اور باطل (فانی اور مٹ جانے والا) ہے۔ اور بلا شبہ صرف اللہ ہی علی (بلند مرتبہ اور بالا تر ہیں) اور کبیر (عظمت

(بقیہ صفحہ ۳۲۸) اس قرآنی تعلیم کو کہ انسان کا وجود حق تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ وہ اپنی اصطلاح میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ حقائق ممکنات حق کے اسماء صفات کی تجلیات ہیں۔

اور حضرت مجدد الف ثانی اسی صداقت کو اپنی وضع کردہ اصطلاح میں یوں پیش کرتے ہیں حقائق ممکنات حق کے اسماء و صفات کے عکوس و اظلال ہیں۔

یعنی دونوں بزرگ (وحدت الوجود کے قائل ہیں فرق صرف تعبیر کا ہے۔

لہ نظامی گنجوی نے اسی صداقت کو یوں نظم کیا ہے۔

مرا او را رسد کبریا و منی ۔۔۔ کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی

اور بزرگی والا) ہے۔

(۲) حیات اسی کے لئے ہے کما قال ھو الحی القیوم

اللہ کے سوا کوئی الہ (واجب الوجود) نہیں ہے اور وہی درحقیقت زندہ ہے اور وہی سب مخلوقات کو زندہ رکھنے والا ہے۔

اس سے ثابت ہوا۔ کہ کسی مخلوق میں صفت حیات ذاتی نہیں ہے کوئی مخلوق از خود زندہ نہیں ہے خلاصہ کلام اینکہ ہم موجود ہوئے تو اس کے موجود کرنے سے اور زندہ ہیں تو اس کے زندہ رکھنے سے ہماری حیات اور اس کا تسلسل، یہ دونوں باتیں اس کی نگاہ جود و کرم کا صدقہ ہیں

(۳) علم و قدرت بھی درحقیقت اسی کے لئے ثابت ہیں۔

یخلق ما یشاء و ھو العلیم القدیر ۵ (۳۰ - ۵۴)

وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہ بہت علم اور بہت قدرت والا ہے۔

(۴) ارادہ (مشیت) بھی درحقیقت اسی کے لئے ثابت ہے۔

وما تشاءون الا ان یشاء اللہ ط (۷۶ - ۳۰)

اور تم نہیں چاہو گے مگر جو چاہے اللہ۔

یعنی بے مشیت الٰہی کوئی شخص کوئی بات چاہ نہیں سکتا، کسی بات کا ارادہ نہیں کر سکتا کیونکہ بندے کی مشیت اللہ کی مشیت کے "تابع" ہے۔

(۵) سماعت و بصارت بھی درحقیقت اسی کے لئے ثابت ہے۔

انہ ھو السمیع البصیر ۵ (۱۷ - ۱)

تحقیق اللہ ہی سب کچھ سننے (اور) دیکھنے والا ہے۔

(۶) حکومت بھی درحقیقت اسی کے لئے ثابت ہے۔

لہ ما فی السموات وما فی الارض (۱۴ - ۲)

اسی کے قبضہ اور تصرف میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (۲۵ - ۲)

اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کے لئے ہے اور اس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا۔ (جو اس کی بادشاہت میں شریک ہو سکے) اور حقیقت حال یہ ہے کہ یہ بات ممکن ہی نہیں کہ کوئی ہستی بادشاہت اور حکومت میں اسکی شریک ہو سکے کیونکہ ساری کائنات تو اس کی محتاج ہے۔ اور یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ ممکن (محتاج) کبھی بھی واجب (غنی) کا مد مقابل یا ہمسر یا شریک کار ہو سکے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶ - ۵۷)

نہیں ہے حکم کسی (انسان) کا سوائے اللہ کے۔

الی انتہائے عاجزی و درماندگی و بیچارگی و افتقار و احتیاج و بے مائگی یہ ہے کہ ہم اپنے افعال کے بھی خالق نہیں ہیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۳۷ - ۹۶)

اور اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی۔

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (۱۳ - ۱۶)

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے اور وہ واحد (اور) زبردست ہے

نوٹ :- اگر اللہ ہر شئی کا خالق ہے تو چونکہ ہر انسان کا ہر فعل بھی ایک شئی ہے۔ اسلئے ہر فعل انسانی کا خالق اللہ تو ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی انسان میں ذاتی طور پر نہ زندگی ہے نہ قدرت نہ طاقت ہے نہ قوت۔

اور اس پر یہ آیت شاہد ہے۔

مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۝ (۱۸ - ۳۹

(خدا پرست نے اس متکبر انسان سے کہا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا

نے تو نے یہ بات کیوں نہ کہی کہ جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے، کسی انسان میں کوئی قوت نہیں ہے جب تک اللہ اسے قوت عطا نہ کرے۔

بازآمدم برسر مطلب:۔ جب یہ صداقت انسان پر منکشف ہو جاتی ہے کہ میں بذات خویش کچھ نہیں ہوں۔ میری کوئی حقیقت نہیں ہے میں اگر موجود ہوں تو محض اس لئے کہ اس نے مجھے وجود عطا کیا ہے اگر زندہ ہوں تو محض اس لئے کہ اس نے مجھے زندگی عطا کی ہے۔ بالفاظ دگر:۔ اسی کے وجود سے موجود ہوں۔ اسی کی حیات سے زندہ ہوں۔ اسی کے علم سے جانتا ہوں۔ اسی کی قدرت اور ارادہ سے مجھ میں قدرت اور ارادہ ہے تو وہ شخص کائنات کی تمام ہستیوں سے منہ موڑ کر اور سب مخلوقات سے رشتہ توڑ کر اپنا تعلق اللہ تبارک و تعالیٰ سے جوڑ لیتا ہے اور اسکے دل میں یہ یقین جاگزیں ہو جاتا ہے کہ نہ کوئی شخص مجھے نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، نہ کوئی شخص میری دستگیری کر سکتا ہے۔ نہ کارسازی کر سکتا ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ سب میری طرح عاجز، مسکین اور محتاج ہیں۔ بالفاظ دگر اس کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ بلاشبہ میں محتاج یعنی فقیر ہوں اور ہر شخص میری ہی طرح فقیر ہے اس یقین کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ شخص حقیقی معنی میں موحد یا مومن یا قلندر بن جاتا ہے یعنی اس میں شان فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد یہ صداقت اس پر واضح ہو جاتی ہے۔ کہ مجھ میں جس قدر صفات ہیں سب خدا کی عطا کردہ ہیں اور میں کچھ نہیں ہوں مگر مظہر ذات حق ہوں میری زندگی اور میرے اعمال سے اسی وجود حقیقی کی قوتوں کا ظہور ہو رہا ہے یہ یقین اس کی روح میں اس قدر بلندی پیدا کر دیتا ہے۔ کہ اس کا سر کسی ہستی کے سامنے نہیں جھک سکتا۔ کیوں؟ اس

رلئے کہ اسے یہ یقین حاصل ہو چکا ہے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا حقیقی معنیٰ میں کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عاشقاں جز خدا ہیچ نیست
(سعدی)

جملہ معشوق است و عاشق پردہ ع
زندہ معشوق است و عاشق مردہ ع

فقر کا اصطلاحی مفہوم: فقر کا اصطلاحی مفہوم اقبال نے سب سے پہلے جاوید نامہ کے ان اشعار میں پیش کیا۔

جز بقرآں ضیغمی روباہی است | فقر قرآں اصل شاہنشاہی است
فقر قرآں اختلاط ذکر و فکر | فکر را کامل ندیدیم جز بہ ذکر

انہوں نے فقر کا یہ مفہوم (کہ وہ اختلاط ذکر و فکر کا دوسرا نام ہے) قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے:

وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۝ (۱۸۹۔۱۹۰)

اور آگاہ ہو جاؤ کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت صرف اللہ ہی کیلئے ہے (اسکے علاوہ نہ کوئی مالک ہے نہ حاکم۔ اور اللہ ہی ہر شئی پر قدرت رکھتا ہے بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقلمندوں کیلئے بڑی

سی نشانیاں (خدا کی ہستی پر بہت سی دلیلیں) ہیں (یہ عقلمند کون ہیں؟) وہ جو ذکر کرتے رہتے ہیں اللہ کا کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (یعنی ہر حال میں) اور غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں (اور جب وہ ایسا کرتے ہیں، تو بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے اس کائنات کو عبث یا بیکار نہیں پیدا کیا۔

اس آیت میں دو لفظ آئے ہیں ذکر (یذکرون) اسی سے مشتق ہے، اور فکر (یتفکرون) اسی سے بنا ہے، اقبال نے انہی دو لفظوں سے فقر کا اصطلاحی مفہوم پیدا کیا ہے۔ مگر ان دو لفظوں کا مفہوم واضح کرنے سے پہلے ان کی نحوی تحقیق ضروری ہے۔

ذکر کی تعریف:۔ ماہرین فن نے ذکر کی تعریف یوں کی ہے۔

استحضار اللہ فی القلب واستغراق الجوارح فی اداء الفرائض علی الدوام لغایۃ تخصیصہ وحبہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے قلب میں حاضر کرنا (مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر حال میں اور ہر جگہ حاضر و ناظر، علیٰ کل شیٔ شہید یقین کرنا) اور اس کی بیحد تعظیم اور اس سے بے انداز محبت کی بنا پر نہایت پابندی کے ساتھ اس کے عاید کردہ فرائض ادا کرنے کے لئے اپنے تمام اعضائے جسمانی کو وقف کار کر دینا (یعنی ہر وقت اس کے احکام کی بجا آوری میں مشغول رہنا کامل توجہ کے ساتھ)

واضح ہو کہ ذکر کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً

(۱) ذکر لسانی یعنی زبان سے اپنے محبوب کا ذکر کرنا اس کا نام لینا۔ اس کے نام کا ورد کرنا اس کی صفات یا خوبیوں کا زبان سے اظہار کرنا، اس کے نام کی مالا جپنا چنانچہ تسبیح و تحمید و تمجید و تہلیل و تکبیر وغیرہ

یہ سب ذکر لسانی کی مختلف صورتیں ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زبان سے ذکر کرنا (مالا پھیرنا یا تسبیح گھمانا) ذکر کی ابتدائی شکل یا پہلی منزل ہے جو شخص غلطی سے اسی منزل کو انتہائی منزل سمجھ لے وہ ساری عمر ابتدائی منزل ہی میں رہیگا جس طرح وہ شخص جو آمدنامہ یا خالق باری کو فارسی ادبیات کی آخری

لہ الیشور بھگت کبیر مہاراج نے ایسے ہی لوگوں کو متنبہ کرنے کیلئے یہ دوہا کہا تھا :۔

مالا پھیرت جگ بھیو، پایو نہ من کا پھیر

کر کا منکا چھانڈ دے من کا منکا پھیر

اے مورکھ! تجھے مالا پھیرتے جگ بیت گئے مگر تو اپنے نفس امارہ (من) کی حیلہ جوئیوں سے آگاہ نہ ہو سکا اپنے ان ہاتھوں کی مالا (تسبیح) کو پھینک دے اور اس کے بجائے نفس امارہ کو مغلوب کر کیونکہ جب تک من (نفس امارہ) شانت (مطمئن) نہ ہو جائے محبوب کا دیدار نہیں ہو سکتا جس طرح جب تک سطح آب ساکن نہ ہو جائے تمہیں اپنا عکس نظر نہیں آسکتا اور جسے دیدار نصیب نہ ہو اس کا جیون ہی اکارت گیا چنانچہ اقبال لکھتے ہیں :۔

بر مقام خود رسیدن زندگی است

ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

ہم کبیر کے اس دعویٰ کو ذیل میں قرآن سے ثابت کرتے ہیں :۔

(ا) مقصود حیات لقاء رب ہے (مَنْ کَانَ یَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ الخ ۔

(ب) لقاء رب جیتے جی ہونا چاہیئے کیونکہ

مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی"

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا ۔

(ج) مگر یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نفس مطمئن نہ ہو جائے ۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۔

کتاب سمجھ لے وہ کبھی ہرگز دیوان بیدل اور کلیات جامی سے مستفید نہیں ہو سکتا

(ب) ذکر قلبی: یعنی اپنے محبوب کو دل میں یاد کرنا اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اسی کا تصور کرنا (اسی کا دھیان کرنا) اس کی یاد سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا۔ یہ منزل ذکر لسانی سے اونچی ہے کیونکہ دھیان سے گیان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور گیان (معرفت) کی بدولت عاشق میں معشوق کی صفات کا عکس جلوہ گر ہونے لگتا ہے۔

(ج) ذکر بالجوارح:۔ یہ ذکر کی آخری اور اعلیٰ صورت ہے جب محبوب کی محبت دل میں گھر لیتی ہے اور ریشہ ریشہ میں سما جاتی ہے تو عاشق اپنے طرز عمل (اعمال) سے اپنی محبت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے شریعت کی زبان میں اسے اتباع رسول کہتے ہیں اور اسی اتباع کی بدولت عاشق صادق مقام محبوبیت پر پہونچ جاتا ہے

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ ٥ (۳-۳۱)

اے رسول! آپ مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو اس کا ثمرہ یہ ملے گا کہ اللہ تمہیں محبوب بنا لے گا۔

صحابہ کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات عمل (جہاد) کو ذکر کی بہترین صورت یقین کرتے تھے۔

ذکر کے معانی:۔ قرآن حکیم نے ذکر کو مختلف معانی میں استعمال کیا ہے جن سے مذکورہ بالا اقسام کا ثبوت بآسانی مل سکتا ہے۔

(۱) ذکر بمعنی قرآن مثلاً: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ٥

بلا شبہ ہم نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم خود اسکے یقینی محافظ ہیں

(۲) ذکر بمعنی استحضار الشیٔ فی الذھن یعنی کسی بات یا واقعہ کو ذہن میں حاضر

کرنا یا کسی واقعہ کو یاد کرنا یا اس پر غور کرنا مثلاً

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ الخ (۲ ـ ۴۰)

اے بنی اسرائیل یاد کرو ان احسانات کو جو میں نے تم پر کئے۔

(۳) ذکر بمعنی زبان سے اللہ کا نام لینا یعنی ذکر لسانی مثلاً

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ (۸۷ ـ ۵)

اور ذکر کیا اپنے رب کے نام کا (رب کا نام لیا) اور اسکے بعد نماز پڑھی۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۸ ـ ۲)

بیشک مومن تو وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جائے تو اس کی عظمت کے تصور سے ان کے دل کانپنے لگیں۔

(۴) ذکر بمعنی دل میں یاد کرنا۔ یعنی ذکر قلبی مثلاً

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً الخ (۷ ـ ۲۰۵)

اور یاد کیجئے اپنے رب کو اپنے دل میں بہت گڑگڑا کر ڈر کر۔

(۵) ذکر بمعنی نصیحت یا وعظ یا پند مثلاً وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ

بیشک ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان کر دیا ہے۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ (۸۷ ـ ۹)

پس آپ نصیحت کیجئے اگر (ان کو) نصیحت نفع دے۔

(۶) ذکر بمعنی عبرت حاصل کرنا تھا۔ مثلاً

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ الخ

کیا انسان کبھی اس بات کو یاد نہیں کرتا دغور نہیں کرتا تاکہ عبرت حاصل کر سکے کہ ہم نے اسکو پیدا کیا اس سے پہلے اور وہ نہیں تھا کچھ بھی (۱۹ ـ ۶۷)

(۷) ذکر بمعنی شدید قسم کی محبت کرنا یعنی کسی کی یاد میں مستغرق رہنا مثلاً

قَالُوْا تَاللّٰہِ تَفْتَؤُا تَذْکُرُ یُوْسُفَ حَتّٰی تَکُوْنَ حَرَضًا الخ

انہوں نے کہا بخدا تم تو سدا یوسف ہی کی یاد میں مشغول رہو گے یہاں تک کہ جھُر جھُر کے از کار رفتہ ہو جاؤ گے (۱۲ - ۸۵)

(۸) ذکر بمعنی تذکرہ یعنی داستان بیان کرنا ۔ مثلاً

ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَکَرِیَّا (۱۹ - ۲)

یہ تذکرہ ہے تیرے رب کی رحمت کا اپنے بندے زکریا پر ۔

(۹) ذکر بمعنی رابطہ قلبی یا تعلق خاطر مثلاً ۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ الخ (۲۴ - ۳۷)

ایسے لوگ کہ نہیں غافل کرتی ان کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے

(۱۰) ذکر بمعنی نماز یا عبادت مثلاً

(الف) فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (۶۲ - ۹)

تو دوڑو ذکر الٰہی (نماز) کی طرف اور چھوڑ دو خرید و فروخت ۔

(ب) فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ الخ (۲ - ۱۹۸)

تو یاد کرو اللہ کو مزدلفہ میں قیام کر کے ۔

(۱۱) ذکر بمعنی اطاعت یا اتباع قانون ایزدی ۔

(الف) وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا الخ (۲۰ - ۱۲۴)

اور جو شخص میرے قوانین کی اطاعت سے روگردانی کریگا تو بلاشبہ اسکی زندگی تنگی اور پریشانی میں گزرے گی ۔

(ب) فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ۔ (۲ - ۱۵۲)

تم میرے احکام کی تعمیل کرو میں اسکے صلے میں تمہیں مغفرت اور ثواب عطا کرونگا ۔

(۱۲) ذکر بمعنی خشیت الٰہی کا احساس یعنی ہر وقت خدا کو حاضر ناظر جان کر اس کی حضوری میں زندگی بسر کرنا ۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ (۲۰ - ۲۴۲)
اے موسیٰ تم دونوں (تو اور تیرا بھائی) میری آیات لیکر مصر جاؤ اور دیکھو کسی وقت کسی حال میں میری یاد میں کوتاہی یا تقصیر نہ کرنا۔

اگر ناظرین ذکر کے ان تمام معانی پر غور کرینگے تو یقیناً بآسانی اس نتیجہ پر پہونچ جائیں گے کہ قرآن حکیم کی رو سے "ذکر" انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے ذکر کے مفہوم میں ذکر، یاد، تلاوت قرآن نماز عبادت رابطہ قلبی، محبت اطاعت عمل صالح (جہاد) اتباع شریعت، عبرت پذیری، محویت، استغراق، تذکیر، نصیحت، وعظ و پند اور معیت الٰہی کا احساس، یہ تمام تصورات داخل ہیں بالفاظ دگر انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ذکر کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

فکر کی تعریف .. فکر کی تعریف علماء نے یوں کی ہے :۔

احضار المعرفتین او المعارف لا ستنتاج معرفۃ اخریٰ

یعنی ذہن انسانی جن دو یا زیادہ صداقتوں کی معرفت حاصل کر چکا ہے ان کو بدیں غرض پیش نظر رکھنا کہ ان کی بدولت تیسری چیز کی معرفت حاصل ہو سکے مثلاً ہمیں یہ دو صداقتیں پہلے سے معلوم ہیں۔

(ا) الآخرۃ ابقی من الدنیا یعنی آخرت دنیا کے مقابلہ میں زیادہ باقی رہنے والی ہے

(ب) الابقیٰ اولیٰ بالانتخاب یعنی جو شئی سب سے زیادہ باقی رہنے والی ہے وہی اس کی مستحق ہے کہ اس کا انتخاب کیا جائے۔

جب ہم نے ان دو صداقتوں (معرفتوں) کو اپنے ذہن میں حاضر کیا (اور ان پر تفکر کیا) تو ہم منطقی طور سے اس نتیجہ پر پہونچے کہ

فالآخرۃ اولیٰ بالانتخاب یعنی لا محالہ بہر صورت آخرت اس لائق ہے کہ دنیا کے مقابلہ میں اس کا انتخاب کیا جائے۔

اللہ کے کسی رسول نے ہم سے کہا۔ کہ الآخرۃ خیر لک من الاولیٰ۔
اگر ہم نے اس صداقت محض سن کر تسلیم کر لیا۔ تو یہ تقلید ہے لیکن اگر ہم نے خود اس مسئلہ پر غور و فکر کی اور اپنی قوت مفکرہ کی بدولت مسلمات کو اس طرح مرتب کیا کہ وہی نتیجہ برآمد ہو گیا۔ جو رسول تلقین کرتا تھا تو یہ فکر یا تفکر ہے

ذکر اور فکر میں حدِ فاصل :۔ یہ ایک طویل بحث ہے ذیل میں چند اشارات درج کئے جاتے ہیں۔

(الف) ذکر میں معارف تو حاصل ہوتے ہیں مگر استنتاج نہیں ہوتا اور فکر کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ معارف سے نتیجہ نکالا جائے۔

(ب) فکر کا تعلق محض ذہن (MIND) یا قوت مدرکہ سے ہے مگر ذکر کا تعلق ذہن اور جوارح (اعضائے جسمانی) دونوں سے ہے۔

(ج) ذکر میں فکر کی شان یا صفت بھی پائی جاتی ہے مگر فکر میں ذکر کی صفات نہیں پائی جاتیں۔

(د) دنیا میں ہر شخص ذکر (محبت، تذکرہ) یادگاری اور محبت کر سکتا ہے لیکن فکر کی استعداد یا صلاحیت ہر شخص میں نہیں پائی جاتی بالفاظ دگر، ذکر کی نعمت عام ہے فکر کی دولت خاص ہے۔

(ہ) ذاکر، مقلد ہوتا ہے مگر، مفکر محقق کا لقب پاتا ہے۔

(و) فکر، ذکر کی خادمہ ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ
ذکر کے بغیر معرفت نہیں ہو سکتی اور معرفت کے بغیر محبت محال ہے۔

(ز) ذکر کرتے رہنے سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔
فکر کرتے رہنے سے معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔

ذکر اور فکر کی کارفرمائی :۔ عاشق کی فکر یا اپنے محبوب کی ذات سے متعلق ہو گی

یا اپنی ذات سے جب وہ اپنی ذات میں غور کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

(۱) محبوب کے مقابلہ میں میری کوئی ہستی نہیں ہے۔

(۲) مجھے ایسا کوئی کام نہیں کرنا جو محبوب کی مرضی کے خلاف ہو۔

(۳) بالفاظ دیگر اپنی مرضی (خواہش نفس) کو محبوب کی مرضی میں فنا کر دینا چاہیے۔

لیکن جو شخص حق تعالیٰ کو اپنا محبوب بناتا ہے وہ لامحالہ اس کی پیدا کردہ کائنات میں غور و فکر کرے گا۔ کیونکہ حق تعالیٰ تو نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ بالفاظ دیگر ذکر، محبت لے ایسے فکر پر مائل کیا۔

اندریں حالات عاشق کی زندگی اس نہج پر بسر ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت اپنے محبوب کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ (یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا الخ) اور ہر وقت کائنات (مخلوقات) میں غور و فکر کرتا رہتا ہے۔

(یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ) اور جب وہ بیک وقت ذکر اور فکر پر عامل ہوگا تو لامحالہ پکار اٹھے گا۔ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا"

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ

جب وہ اپنی ذات میں غور و فکر کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ میری تمام قوتیں اور میرے تمام جوارح سب اطاعت محبوب کیلئے وقف ہو جائیں

لہ فنا "تصوف کی اصطلاح ہے اس سے فنا ذات مراد نہیں ہے بلکہ اتباع یا اطاعت مراد ہے۔ یعنی اپنی خواہشات کو محبوب حقیقی کی مرضی کے تابع کر دینا اور جب ایسا ہوتا ہے تو عاشق کے اندر صفات رذیلہ زائل ہونے لگتی ہیں اور اسی زوال کا اصطلاحی نام تزکیہ ہے مرشد رومی فرماتے ہیں:۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

کیونکہ اس سے بہتر ان کا کوئی اور مصرف نہیں ہو سکتا ؎

جب وہ کائنات میں غور کرتا ہے تو ہر ذرہ میں اسے اپنے محبوب کا جمال نظر آتا ہے، اور اسکی معرفت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جوں جوں معرفت بڑھتی ہے محبت میں بھی شدت ہوتی جاتی ہے۔

چونکہ وہ ہر شئی میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھتا ہے اسلئے وہ مومن اور کافر دونوں پر شفیق ہو جاتا ہے ؎

ذکر کی وسعت:۔ اگر غور سے دیکھو تو عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات اور سلوک یعنی دین اسلام کے پانچوں پہلو ذکر کی آغوش میں آجاتے ہیں۔ اگر شک ہو تو آیات مذکورہ بالا کو دوبارہ پڑھ لیا جائے۔ گویا دین اسلام ذکر کا دوسرا نام ہے۔

ذکر الہٰی کسی انسان کو تعلیم و تعلم، تجارت و صنعت و حرفت، کسب معیشت، نکاح، حیات اجتماعی، تدبیر منزل، جہاد بالسیف یا حکمرانی سے باز نہیں رکھتا کیونکہ یہ جملہ امور خود از قبیل ذکر ہیں۔

اب اس ذکر کے ساتھ فکر کو شامل کر دو اور پھر غور کرو کہ اب انسان کی زندگی کا کونسا شعبہ ان دونوں کی گرفت سے باہر رہ گیا؟ اسی لئے اقبال نے فقر کو، دین اسلام کا دوسرا نام قرار دیا ہے۔

آج ہماری خانقاہوں اور مسجدوں میں جو ذکر ہو رہا ہے وہ ذکر کی محض ابتدائی

؎ نیاوردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست (نظامی)

؎ در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چرا است
از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است (لا اعلم)

صورت ہے یعنی ذکر لسانی یا ذکر قلبی۔ بیشک یہ بھی لازمی ہے مگر مسلمان وہ ہے جو شریعت حقہ کے تمام احکام کی تعمیل کرے۔ یعنی ذکر لسانی کے بعد ذکر بالجوارح (جہاد) بھی کرے۔

جس طرح زبان کا ذکر یہ ہے کہ زبان سے اللہ اللہ کہا جائے اسی طرح دماغ کا ذکر یہ ہے۔ کہ کائنات میں فکر کی جائے۔ اور اسی طرح ہاتھ کا ذکر یہ ہے کہ جہاد بالسیف کیا جائے۔ وقس علیٰ ھذا۔

خلاصہ داستان:۔ ذکر کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ عاشق (ذاکر) کے تمام اعضائے جسمانی اپنے اپنے فرائض ادا کرنے میں مشغول رہیں۔ یعنی مختصر لفظوں میں ذکر، بجا آوری، احکام الٰہی کا دوسرا نام ہے۔ اور فکر کا مفہوم (لکما صحتاًحح) یہ ہے۔ کہ عاشق اپنے محبوب کی معرفت حاصل کرے جس قدر علم میں اضافہ ہوگا اسی قدر محبت میں شدت ہوگی۔ لے

ان دونوں کے اختلاط سے شان فقر پیدا ہو جاتی ہے اور دنیا میں ذات رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) اس شان فقر کی سب سے بڑی مظہر ہے یہی وجہ ہے۔ کہ آپ قیامت تک تمام عاشقوں (مسلمانوں) کے لئے کامل نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہیں۔

جب عاشق کائنات میں فکر کرتا ہے۔ تو اسے معرفت الٰہی حاصل ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ بتدریج مگر یقینی طور سے اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ مظاہر کائنات کے پس پردہ ایک علیم وقدیر وحکیم

لے گرچہ عین ذات را بے پردہ دید
رَبِّ زِدْنِی از زبان او چکید
(اقبال)

ہستی کا اقرار فرماتا ہے

اور جب وہ اپنے نفس میں فکر کرتا ہے تو اسے معرفت فرائض حاصل ہو جاتی ہے۔ اور ذکر الٰہی فرائض کی بجا آوری کا اصطلاحی نام ہے۔

اسی لئے اقبال نے لکھا ہے۔

ع   فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

یعنی جب تک انسان اپنے نتائج افکار کے تقاضوں پر عمل نہ کرے (شریعت حقہ کا اتباع نہ کرے) اس وقت تک ان نتائج افکار سے اس کو کوئی فائدہ یا نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔

مثلاً ہم نے غور و فکر کے بعد یہ معلوم کیا۔ کہ زید کی صحت اس بات پر موقوف ہے کہ اسے فلاں صحت بخش مقام میں رکھا جائے لیکن ہم اس علم پر عمل نہ کریں تو محض ہمارا علم (فکر) زید کو صحت سے بہرہ مند نہیں کر سکتا۔

بالفاظ دگر محض استنتاج کرتے رہنا انسان کے لئے مفید نہیں ہو سکتا غور و فکر کے بعد جو نتائج معلوم ہوں ان پر عمل کرنا بھی اشد ضروری ہے کیونکہ

---

(۱) چو شمع از پئے علم باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت   (سعدی)

اسی مضمون کو اکبر الہ آبادی نے یوں ادا کیا ہے۔

نظام عالم بتا رہا ہے کہ ہے اک اس کا بنانے والا
ظہور آدم دکھا رہا ہے کہ ہے کوئی دل میں آنے والا

منشی تلوک چند محروم نے بھی اسی مضمون کو بڑے دلکش اور دلنشیں انداز میں باندھا ہے

معدوم اسے نہ جان جو ہے مستور   ظلمت کے مقابلہ میں موجود ہے نور
اے منکر ذات حق ذرا آنکھیں کھول   فانی ہم ہیں تو کوئی باقی ہے ضرور

عمل (تعمیلِ احکام) ہی سے عاشق اپنے محبوب کی نظروں میں عزت حاصل کر سکتا ہے۔ جو عاشق اپنے فرائض کی بجا آوری سے غافل رہتا ہے وہ محبوب کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ لہ

ان تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ جب تک ذکر شامل نہ ہو فکر کامل نہیں ہو سکتی اس نکتہ کو بانداز دگر یوں سمجھو:۔

فکر دراصل ایمان صحیح کا اور ذکر، عمل صالح کا دوسرا نام ہے اور سب جانتے ہیں کہ وہی ایمان انسان کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے جس کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔

نکتہ:۔ انسانی شخصیت کے دو پہلو ہیں:۔

علمی یا شعوری پہلو۔ جذباتی پہلو اور ارادی یا عملی پہلو۔

فکر اس کے علمی پہلو کی تربیت کرتی ہے۔

ذکر اس کے جذباتی اور عملی پہلو کی تکمیل کرتا ہے۔

شعور جذبات اور عمل کے مجموعہ کو انسان کہتے ہیں۔

فکر اور ذکر کے مجموعہ کو فقر کہتے ہیں۔

گویا فقر، انسانی شخصیت کے تینوں پہلوؤں کی آبیاری کرتا ہے۔

اور چونکہ اسلام ایمان اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔

اس لئے فقر اسلام ہی کا دوسرا نام ہے۔

حرف آخر:۔ فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اور ذکر، فرائض کی بجا آوری کا نام ہے اس

لہ رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

لئے جب عاشق اپنے فرائض منصبی کو بقدر طاقت تولیش بجالاتاہے تو اسے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ کہ میں نے اپنے محبوب (حق تعالیٰ) کے احکام کی تعمیل کر دی یقیناً وہ مجھ سے راضی ہو جائیگا۔
اسی صداقت کو قرآن حکیم نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔
اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳ - ۲۸)
آگاہ ہو جاؤ کہ صرف اللہ کے احکام کی تعمیل ہی سے انسانوں کے قلوب کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔
اور یہ بات کون نہیں جانتا کہ حق تعالیٰ کے دیدار اور اس سے ملاقات کی نعمت کبریٰ اور دولت عظمیٰ (جو درحاصل مقصد حیات ہے) اسی شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جس کا نفس مطمئن ہو چکا ہو۔
يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً
اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف واپس آجا اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے۔ اور وہ تجھ سے راضی ہے۔
نوٹ: مرشد رومی نے بھی دفتر ششم میں یہی تعلیم دی ہے کہ ذکر، فکر سے افضل ہے اور اس کے بغیر فکر کامل نہیں ہو سکتی چنانچہ فرماتے ہیں۔

این قدر گفتیم باقی فکر کن ۔۔۔ فکر اگر جامد بود رو ذکر کن
ذکر آرد فکر را در اہتزاز ۔۔۔ ذکر را خورشید این افسردہ ساز

یعنی نیکی کا مفہوم اس قدر تو میں نے سمجھا دیا اب اس کی روشنی میں مزید غور و فکر تو خود کر لے۔ اور اگر تیری فکر جامد (ناقص) ہے تو اس کو زندہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ ذکر کر۔ (عشق الٰہی اختیار کر) کیونکہ ذکر میں یہ خاصیت ہے کہ وہ فکر کو متحرک (زندہ) کر دیتا ہے۔ اور اس کی بدولت قلب

پر منکشف حقائق ہونے لگتا ہے۔ لہذا تو ذکر کو فکر کے حق میں بمنزلہ خورشید سمجھ لے خورشید میں دو وصف ہیں ایک یہ کہ وہ اشیا کو منور کر دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ جامد اشیاء کو متحرک (زندہ) کر دیتا ہے۔ اسی طرح تیرا ذکر تیری فکر کو بھی منور کر دے گا اور متحرک بھی۔ ۱۲

ذکر کی افضلیت کا ثبوت یہ بھی ہے۔ کہ فکر کی بدولت معارف تو حاصل ہو سکتے ہیں مگر محبوب کے دل میں عاشق سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقابلہ میں ذکر سے معارف بھی حاصل ہوتے ہیں اور محبوب بھی محب کی طرف مائل ہو جاتا ہے یعنی ذکر میں کشش کی قوت بھی ہے جو فکر میں مطلق نہیں پائی جاتی۔ قرآن کریم کی یہ آیت میرے دعویٰ پر شاہد ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (۲ - ۱۵۲)

لفظی ترجمہ تو یہ ہے۔ کہ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا لیکن مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت کرو (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) میں تم سے محبت کروں گا۔

تشریح تفقر از کلام اقبال :- اقبال نے بال جبریل اور ضرب کلیم میں جو اشعار فقر کی تشریح کے سلسلہ میں لکھے ہیں۔ وہ سب تو اس جگہ نقل نہیں کر سکتا۔ لیکن چند اشعار بغرض ایضاح مقصد اس جگہ درج کئے دیتا ہوں:-

(۱) فقر، افلاس، بیکسی، عاجزی، یا بیچارگی کا نام نہیں ہے اسلامی زاویہ نگاہ سے فقیر وہ ہے۔ جس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے مگر وہ اللہ کے لئے سب کچھ ترک کر دیتا ہے۔ وہ اس لئے زمین پر نہیں سوتا کہ اس کے پاس سامان راحت نہیں ہوتا بلکہ اس لئے کہ سامان راحت کی اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اس لئے اگرچہ صورتاً فقر اور رہبانیت یکساں ہیں

مگر معناً دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

(۲) صاحب فقر، راہب کی طرح سکون پرست نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ جد و جہد (جہاد) میں مصروف رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کی تمام مخفی طاقتوں کو آشکار (عریاں) کرے مسلمانوں کے زوال کا اصلی باعث بھی یہ ہے۔ کہ وہ فقر کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہو گئے۔

یہ فقر مرد مسلمان نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی

(۳) فقر انسان کے اندر بے پناہ قوت اور شجاعت پیدا کر دیتا ہے کیونکہ اس کی بدولت مرد مومن پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ

لا موجود الا اللہ

یعنی حقیقی معنی میں (در اصل) اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ یہ عالم تو وہم و طلسم و مجاز ہے[1] اسکی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے فی الجملہ جب کوئی بذات خود موجود ہی نہیں تو پھر کسی ہستی سے خوف کیسا؟

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلب سلیم
قبضہ میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدر کرارؓ

[1] نقطہ پرکار حق، مرد خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز (اقبال)

[2] اشارہ بجانب تیغ فقر ۱۲

(۴) فقر، انسان کو دونوں جہان سے بے نیاز کر دیتا ہے کیونکہ فقر کی بدولت اس کا مقصود صرف اللہ ہو جاتا ہے:

خاکی و نوری نہاد بندہ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

(۵) جس شخص میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے وہ مظہر صفاتِ ایزدی بن جاتا ہے مثلاً اس کا ہاتھ، اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

(۶) اسلامی فقر، انسان کو غیر معمولی عظمتوں کا مالک بنا دیتا ہے:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی

(۷) فقر کی بدولت مردِ مومن زمانہ پر حکمران ہو جاتا ہے:

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

(۸) جس قوم میں شانِ فقر پیدا ہو جائے وہ کائنات میں کسی کی محکوم نہیں ہو سکتی

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

(۹) فقر سے انسان میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں:

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی — یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار — اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی

(۱۰) فقر کی بدولت انسان اللہ کی ہستی پر برہان بن جاتا ہے اور اس میں جلال و

جمال کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن ۔۔۔ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ۔۔۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ان تصریحات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال کا تصور فقر دراصل ان تمام کمالات عقلی و اخلاقی و روحانی کا جامع ہے جو اتباع شریعت سے ایک انسان کے اندر پیدا ہو سکتے ہیں۔ قرآن حکیم کی رو سے مقتضیات یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفات ایزدی کا رنگ پیدا کرلے۔ اور یہ رنگ فقر کی بدولت پیدا ہو سکتا ہے۔ جو فکر اور ذکر کے امتزاج کا دوسرا نام ہے۔ فکر سے محبوب حقیقی کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور ذکر انسان کو اس محبوب حقیقی کی بارگاہ تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر انسان کے دل میں عشق کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور عشق میں یہ طاقت ہے کہ محبوب کو خود سے ملا دیتا ہے بقول اقبال:-

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
اٹھتے ہیں حجاب آخر کرتے ہیں خطاب آخر

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اس فصل کی شرح ناظرین کرتے ہیں:-

خلاصہ مطالب:- اس فصل میں چھ بند ہیں:-

پہلے بند میں اول فقر کی ماہیت بیان کی ہے اور اس کے عناصر ترکیبی کی تشریح کی ہے۔ بعد ازاں فقر کی خصوصیات واضح کی ہیں:-

دوسرے بند میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ فقر ترک دنیا کا نام نہیں ہے بلکہ ؏ ترک ایں دیر کہن تسخیر او

تیسرے بند میں فقر کافر اور فقر مومن میں جو فرق ہے اسے واضح کیا ہے

چوتھے بند میں مسلمانوں کو اپنے اندر عزت دین پیدا کرنے کی تلقین کی ہے
پانچویں بند میں مسلمانانِ عالم کے زوال پر مرثیہ خوانی کی ہے۔
چھٹے بند میں عصر حاضرہ کی مادہ پرستی اور اس کے ملحدانہ رجحانات کو ظاہر کیا ہے۔ اور مسلمانوں کو احتساب خویش کی دعوت دی ہے۔

پہلا بند

تمہید:۔ ہم قبل ازیں اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ قرآن حکیم نے بندوں کو "فقیر" قرار دیا ہے۔ یعنی ہم سب اپنے وجود اور اس کے توابعات (حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام وغیرہ) کے لئے حق تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ ہمارا وجود خانہ زاد نہیں ہے۔ بلکہ حق تعالیٰ کا عطا کردہ یعنی مستعار ہے۔ وجود اور تمام صفات وجودیہ اصالتاً اور حقیقتاً صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت ہیں۔ یعنی اس کا وجود ذاتی اور حقیقی ہے برعکس اس کے ہمارا وجود ظلی اور مجازی ہے۔

لہ اس حقیقت کو سب سے پہلے شیخ اکبر نے واضح کیا ہے اور ان کے بعد حضرت مجدد الف ثانی نے اس کو مبرہن کیا چنانچہ فرماتے ہیں:۔

(۱) وجود مبدا ہر خیر و کمال است و عدم منشا ہر نقص و شر۔ پس وجود مر واجب را ثابت باشد و عدم نصیب ممکن بود۔

(۲) ممکن را وجود ثابت کردن فی الحقیقت شریک کردن است او را در ملک و ملک حق تعالیٰ

(۳) اگر علمائے ظواہر ازیں دقیقہ آگاہ می گشتند ہرگز ممکن را وجود ثابت نمی کردند۔

(ماخوذ از مکتوب ۱۰۰ جلد دوم طبع نولکشور)

جب یہ صداقت ایک مسلمان کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے کہ در اصل اللہ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی موجود نہیں ہے (لاموجود الا اللہ) تو وہ قدرتی طور پر ماسوی اللہ سے قطع نظر کرکے صرف اللہ کو اپنی محبت کا مرکز بنا لیتا ہے۔ اور یہی عقیدہ فقر کا سنگ بنیاد ہے۔ یعنی جب یہ عقیدہ دل میں راسخ ہو جاتا ہے۔ کہ حق کے سوا حقیقی معنی میں کوئی موجود نہیں ہے تو مسلمان حقیقی معنی میں موحّد بن جاتا ہے[ل]۔ اقبال نے ذیل کے اشعار میں اسی صداقت کو واضح کیا ہے۔

آں مسلمانے کہ بیند خویش را — از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیر کائنات آگاہ اوست — تیغ لاموجود الا اللہ اوست (مسافر)

— — . — — . — —

تو اے ناداں دل آگاہ دریاب — بخود مثل نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش — زلاموجود الا اللہ دریاب (ارمغان)

اب ہم اس بند کا مطلب ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:۔

پہلا اور دوسرا شعر:۔ اقبال دنیا دار دل سے سوال کرتے ہیں کہ جانتے ہو

(بقیہ ص ۳۵۱)

ان تصریحات کا مطلب یہ ہے کہ ممکنات کا وجود اصلی اور حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلی اور مجازی ہے یعنی ممکنات اپنے وجود اور توابعات وجود کے لئے حق کے محتاج ہیں۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰہِ ۵ (۳۵ - ۱۵)

اے لوگو تم سب اپنے وجود کے لئے اللہ کے محتاج ہو ۱۲

[ل] یہی وجہ ہے کہ تمام عرفاء نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ وحدت الوجود کو تسلیم کئے بغیر کسی مسلمان کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا ۱۲۔

فقر کی ماہیت کیا ہے؟ پھر خود جواب دیتے ہیں کہ فقر حسب ذیل خصوصیات کا نام ہے

(۱) نگاہ راہ بیں

(۲) دل زندہ

(۳) کار خویش را سنجیدن

(۴) بر لا الہ پیچیدن

نگاہ راہ بیں کا مطلب یہ ہے کہ فقیر کو وہ بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جس کی بدولت وہ حق تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے بصیرت سے مراد ہے صحیح علم یعنی صاحب فقر (مرد مومن) کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کائنات میں حق تعالیٰ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ اس لئے اسے چھوڑ کر غیر کی طرف متوجہ ہونا سراسر نادانی ہے۔

(۲) دل زندہ سے یہ مراد ہے کہ جب مومن (صاحب فقر) حق تعالیٰ کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے تو عشق الٰہی کی بدولت اس کا دل مہبط انوار بن جاتا ہے بالفاظ دگر اس کا دل غیر اللہ کی محبت سے یکسر خالی ہو جاتا ہے اور جب مسلمان کے دل میں اللہ جلوہ گر ہو جاتا ہے تو اس کی تجلیات کی بدولت اس کا دل زندہ ہو جاتا ہے۔ اقبال نے دل کے منور ہو جانے کو زندہ ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔

صوفیائے کرام کی تعلیم یہ ہے کہ

غیر اللہ کی محبت دل کو مردہ کر دیتی ہے۔

اللہ کی محبت اس کو زندہ کر دیتی ہے۔

اقبال چونکہ صحیح اسلامی تصوف کے مبلغ اور علمبردار ہیں اس لئے انہوں نے وہی لکھا ہے جو ان سے پہلے تمام پاکان امت نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں سپرد قلم فرمایا تھا۔

(۳) کار خویش را سنجیدن سے مراد ہے اپنے اعمال (حرکات) سکون، قول، فعل،

اور خیال) کو شریعت (رضا الہی) کی ترازو میں تولنا یعنی اپنی پوری زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنا۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ فقیر (مومن) کی زندگی از سرتاپا شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہے[1]

(۱۴) بر کالا اللہ پیچیدن :- یعنی توحید کے ساتھ مطابقت کلی پیدا کرنا یا توحید کے اقتضا پر عمل کرنا حقیقی معنی میں موحد بن جانا بایں طور کے اپنے خیال قول اور فعل (پوری زندگی) سے عقیدہ توحید کا اظہار اور اثبات کرنا اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔[2]

لا الٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں
تا ز اندام تو آید بوئے جاں

واضح ہو کہ اقبال نے یہاں لا الٰہ گفتن نہیں کہا۔ بلکہ "بر حرف لا الٰہ پیچیدن" کہا ہے۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

لا الٰہ گفتن سے مراد ہے محض زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہنا جس طرح آج ساری دنیا کے مسلمان کہہ رہے ہیں۔

بر لا الٰہ پیچیدن سے مراد ہے لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم پر عمل کرنا اور اسلام دراصل توحید کے اقرار کے بعد اس کے مفہوم یا اقتضا پر عمل کرنے کا نام ہے جب تک ایک مسلمان توحید کے اقتضا پر عمل نہ کرے وہ حقیقی معنی میں موحد نہیں ہو سکتا۔

توحید الٰہی کا اقتضا (مفہوم) کیا ہے؟ یہ کہ موحد حق کے سوائے کسی انسان کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے گا۔ کسی انسان کے نافذ کردہ قانون کی اطاعت نہ

---

[1] خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید (سعدی)

[2] مسلمان بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

کرے کسی کو آقا مالک صاحب اقتدار یا نفع و نقصان کا مالک نہ سمجھے۔ کسی کو مشکل کشا، دستگیر کارساز یا حاجت روا نہ جانے کسی سے کوئی توقع یا امید نہ رکھے۔

کیوں؟ اسلئے کہ ہر شخص (بادشاہ ہو یا نواب) اپنی حقیقت یا ذات کے اعتبار سے فقیر الی اللہ (اللہ کا محتاج) ہے تو ایک مسلمان یہ سوچتا ہے کہ میں اس شخص کے آگے کیوں ہاتھ پھیلاؤں۔ جو میری ہی طرح محتاج ہے۔ اس لئے میں کسی شخص کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرونگا۔ کسی کو حاجت روا تسلیم نہیں کرونگا کسی کو اپنا آقا نہیں بناؤں گا کسی کی اطاعت نہیں کروں گا۔

اس کے بعد تشکر کی اعلیٰ منزل آتی ہے۔ وہ یہ کہ صاحب فقر اس نکتہ پر غور کرتا ہے کہ

(ا) ہر شخص اپنے وجود کے لئے حق کا محتاج ہے۔

(ب) یعنی ہر شخص اپنی حقیقت یا ذات کے اعتبار سے معدوم ہے۔ لیکن چونکہ اُسے حق تعالیٰ نے موجود کر دیا۔ اسلئے وہ موجود ہو گیا۔[1]

(ج) لہذا اس کا وجود ذاتی یا اصلی نہیں ہے بلکہ مستعار یا ظلی ہے۔

(د) اس لئے اگرچہ اسے بھی موجود کہہ سکتے ہیں مگر اس کا وجود حق تعالیٰ کے وجود کی طرح یا اس کی مثل نہیں ہے دونوں کے وجود میں فرق ہے کیونکہ حق تو بذات خود موجود ہے۔ (واجب الوجود ہے) اور انسان حق تعالیٰ کے موجود کرنے سے موجود ہوا ہے۔ (ممکن الوجود ہے)

(ہ) یعنی انسان کا وجود حقیقی معنی میں وجود نہیں ہے بلکہ محض مجازی معنی میں

---

[1] ممکن یا محتاج کہتے ہی اس کو ہیں جو بذات خود معدوم ہو واجب یا غنی کے موجود کر دینے سے موجود ہو جائے۔

وجود کہلاتا ہے۔

لہذا انسان حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے محض مجازی معنی میں موجود ہے۔

بالفاظ دیگر ہم اسے معدوم تو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ نظر آتا ہے اور موجود اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ بذات خود موجود نہیں ہے۔

(د) اس لئے اس کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلی یا وہمی ہے [1]

(ی) لہذا جب انسان دراصل موجود ہی نہیں ہے محض نمود بے بود کا مصداق ہے۔ یعنی نظر تو آتا ہے مگر دراصل موجود نہیں ہے جس طرح حلقہ آتش میں جو گردش سے پیدا ہوتا ہے محسوس و مشہود تو ہوتا ہے مگر درحقیقت موجود نہیں ہے تو پھر اس سے رابطہ قائم کرنا اسے اپنی تمناؤں کا مرکز بنانا اسے حاکم حکمراں، مالک، بادشاہ، آقا، معطی، مانع، نافع، ضار یا صاحب اقتدار سمجھنا سراسر

---

[1] امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی بھی یہی فرماتے ہیں۔

نزد فقیر عالم عبارت از عدمات است کہ اسماء و صفات واجب جل سلطانہ در خانہ علم درانجا منعکس گشتہ و در خارج آں عدمات بایجاد حق سبحانہ بآں عکوس بوجود ظلی موجود شدہ۔

(مکتوب اول جلد دوم ص ۱)

"آنچہ منکشف فقیر است آنست کہ ایں عرصہ، عرصہ وہم است و ایں صور و اشکال کہ دراں عرصہ است صور و اشکال ممکنات است کہ صنع خداوندی در مرتبہ حس و وہم ثبوتے پیدا کردہ است۔ (مکتوب ۶۴ جلد سوم ص ۱۱۱)

عالم را موہوم می گویم نہ بآں معنی کہ عالم مخترع و مجعول وہم است .. بلکہ بایں معنی کہ حضرت حق سبحانہ عالم را در مرتبہ وہم خلق کردہ است .. و مرتبہ وہم عبارت از نمود بے بود است کہ در رنگ دائرہ کہ از نقطہ جوالہ در وہم ناشی گشتہ است کہ نمودے دارد بے بود۔ مکتوب ۶۸ جلد سوم ص ۱۱۱

حماقت ہے اور یکسر جہالت ہے۔

جب یہ حقیقت دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ تو مرد مومن ماسوی اللہ سے بکلی قطع تعلق کر لیتا ہے۔ اور صرف اللہ کو اپنا الٰہ یعنی معبود مطلوب، مقصود محبوب اور مرکز توجہ بنا لیتا ہے۔ ساری کائنات اس کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتی ہے وہ جس مظہر جس حیوان یا جس انسان کو دیکھتا ہے تو فوراً دل میں کہتا ہے۔ کہ یہ محض نمود بے بود ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے نظر اس لئے آرہا ہے کہ اسے خدا نے موجود کر دیا ہے۔ ورنہ بذات خود تو معدوم ہے[ا] ابھی حق تعالیٰ کی صفت حیات کی تجلی رک جائے ابھی یہ مظہر فنا ہو جائے۔ یعنی اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے۔ معدوم تھا۔ معدوم ہو جائے۔

جب مومن اس مقام پر پہونچ جاتا ہے۔ تو حقیقت کائنات اس پر عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور وہ خود بخود پکار اٹھتا ہے۔ لا موجود الا اللہ۔

واضح ہو کہ جب تک لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی معنی اور مفہوم جو لا موجود الا اللہ ہے۔ مسلمان کے دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہو جائے۔ وہ حقیقی معنی میں موحد نہیں بن سکتا۔ جب ایک مسلمان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس میں شان فقر پیدا ہو جاتی ہے۔

فقر کیا چیز ہے؟ فقر اس عقیدہ کا نام ہے کہ اللہ کے سوا کائنات میں کوئی ہستی بذات خود یعنی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ اس لئے کوئی ہستی اس لائق نہیں کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ یا اس سے کوئی توقع کی جائے۔ یا

ا طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن
(ضرب کلیم)

کسی قسم کی قدرت یا قوت منسوب کی جائے۔ یا کسی درجہ میں بھی اسے مؤثر سمجھا جائے واضح ہو کہ جب تک انسان ما سوی اللہ کو کسی اعتبار سے بھی اللہ کا شریک سمجھتا رہے گا۔ وہ شرک کی خباثت اور نجاست سے پاک نہیں ہو سکتا اور جب تک ایک شخص مشرک رہتا ہے تو وہ پاک نہیں ہو گا۔ وہ موحد نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے صوفیائے کرام نے یہ تعلیم دی ہے۔ کہ جس طرح کوئی شخص صفات یا ذات کے اعتبار سے خدا کا شریک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص وجود کے اعتبار سے بھی خدا کا شریک نہیں ہو سکتا۔

اگر شرک فی الصفات اور شرک فی الذات محال ہے تو شرک فی الوجود بدرجہ اولیٰ محال ہے۔ اگر کوئی شخص صفات یا ذات میں خدا کا شریک نہیں ہو سکتا تو وجود جیسی بنیادی شے میں اس کا شریک کیسے ہو سکتا ہے[1]؟

ان تصریحات سے ثابت ہوا۔ کہ جب تک لا الٰہ الا اللہ کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ لا موجود الا اللہ اس وقت تک شرک کی کامل نفی نہیں ہو سکتی یعنی مسلمان حقیقی معنوں میں موحد نہیں ہو سکتا۔

جب ایک مسلمان حقیقی معنوں میں موحد بن جاتا ہے یعنی اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ کہ لا موجود الا اللہ تو

(۱) وہ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا بالفاظ دگر اپنی زندگی کو قرآن کی ترازو میں تول کر بسر کرتا ہے۔

(۲) اس کا دل محبت الٰہی سے معمور ہو جاتا ہے یعنی زندہ ہو جاتا ہے۔

(۳) اسے خدا تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہو جاتا ہے یعنی اس کی نگاہ "

---

[1] تو بھی موجود اور حق بھی موجود
ظالم! یہ شرک و بت پرستی کب تک (امجد حیدر آبادی)

ملہ ہیں" ہو جاتی ہے۔

یہی فقر کی حقیقت ہے۔ اور اقبال نے اپنی مختلف تصانیف میں اسی حقیقت کو مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اگر کسی شخص میں شان فقر پیدا ہو جائے تو وہ جو کی روٹی کھانے کے باوجود خیبر کا قلعہ فتح کر سکتا ہے۔ دراصل اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت علیؓ میں یہ طاقت فقر کی بدولت ہی پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے جو شخص غیر معمولی روحانی کمالات حاصل کرنے کا آرزومند ہو اسے اپنے اندر یہی شان فقر پیدا کر لینی چاہیے۔

چوتھا شعر:۔ کہتے ہیں کہ فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا، کا دوسرا نام ہے اور یہ صفت فقر دراصل متاع مصطفےٰ ہے ہم اس کے امین ہیں۔

اس شعر میں اقبال نے تین باتیں بیان کی ہیں۔

(۱) فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا ہے۔

(۲) یہ صفت دراصل متاع مصطفےٰ ہے۔

(۳) ہم (مسلمان) صرف اس کے امین ہیں۔

ذیل میں ان تینوں باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

(۱) ذوق و شوق کنایہ ہے عشق سے اور تسلیم و رضا سے مراد ہے عاشق صادق کا اپنی مرضی اور اپنی خواہش کا معشوق کی مرضی کے تابع کر دینا۔ اور یہ منطقی نتیجہ ہے عشق کا۔ یعنی عشق اور تسلیم و رضا لازم و ملزوم ہیں

لہ اسی کو تصوف کی اصطلاح میں مقام فنا سے تعبیر کرتے ہیں:۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود

بندہ مومن قضائے حق شود

(اقبال)

جب تک ایک عاشق اپنی مرضی معشوق کی مرضی کے تابع نہ کر دے وہ عاشق ہی نہیں کہلا سکتا۔ اور اگر ایک شخص اپنی مرضی کسی کی مرضی کے تابع کر دے تو سمجھ لو کہ وہ اس پر عاشق ہے۔ بات یہ ہے کہ عشق کا خاصہ ہے دوئی کو مٹا دینے یا عاشق اور معشوق کو ایک کر دینے کا۔ عشق کی دنیا میں دوئی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جب تک دل میں دوئی کا تصور باقی ہے عشق میں خامی ہے عشق کی انتہا یہ ہے کہ عاشق خود معشوق بن جائے یا باصطلاح قرآنی اس میں معشوق کا رنگ پیدا ہو جائے چنانچہ اقبالؔ نے آئندہ شعر ہی خود اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

فقر مومن چیست؟ تسخیر جہات
بندہ از تاثیر او مولی صفات

پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ فقر دراصل عشق الٰہی کا نام ہے اور عشق کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عاشق میں شیوہ تسلیم و رضا پیدا ہو جاتا ہے دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ دراصل فقر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متاع حیات ہے یعنی حقیقی معنی میں صرف آپ ہی صاحب فقر ہیں۔

لہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے

صِبْغَةَ اللّٰهِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ہ

قبول کیا ہم نے اللہ کا رنگ اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے اور ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں (۲ — ۱۳۸)

اللہ کے رنگ سے دین اسلام مراد ہے مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کی اتباع کرنے سے انسان میں صفات ایزدی کا عکس پیدا ہو سکتا ہے اسی اتباع کامل کو اقبال نے فقر سے تعبیر کیا ہے ۱۲۰

اس کی تشریح یہ ہے کہ عشق کے لئے معشوق کی معرفت ضروری ہے. بے دیکھے کوئی کسی پر عاشق نہیں ہو سکتا. چونکہ آپ نے بواسطہ جبریل حق تو کی معرفت حاصل کرلی. اس لئے عاشق کا لقب دراصل آپ ہی کو سزاوار ہے.

آپ سے بڑھ کر کسی انسان کو اس حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا کہ انسان فقیر ہے یعنی اپنے وجود کے لئے خدا کا محتاج ہے.

جس طرح وجود دراصل اللہ تو کی صفت ہے اور صرف اسی کے لئے اصالتاً ثابت ہے ہمارا وجود اس کا عطا کردہ ہے یعنی وجود ہمارے لئے صرف امانتاً ثابت ہے اسی طرح فقر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اصالتاً ثابت ہے. ہمارے لئے صرف امانتاً ثابت ہے یہ مطلب ہے اس مصرع کا

نگر ما امینیم ایں متاع مصطفیٰ است

یعنی جس طرح ہمارا وجود ہمارا نہیں ہے ہم اس کے مالک نہیں ہیں بلکہ حق تو کا عطا کردہ ہے یعنی ہم اس کے امین ہیں. اسی طرح ہمارے اندر جو شان فقر پائی جاتی ہے یہ ہماری ملک (حاصل کردہ) نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ ہے یعنی ہم اس کے امین ہیں. مطلب یہ ہے کہ یہ نعمت ہم کو

ف چونکہ حق تو کی جمیع صفات عین ذات ہیں اس لئے میں نے وجود کے لئے صفت کا لفظ استعمال کیا ہے. بات یہ ہے کہ اس کی ذات عین وجود ہے اور وجود عین ذات ہے دونوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے. لیکن انسان کی ذات اور اس کے وجود میں فرق ہے وہ یہ کہ ذات عارض ہے وجود معروض ہے صوفیائے کرام کا مسلک یہی ہے چنانچہ عارف جامی فرماتے ہیں:۔

ہستی بقیاس عقلی اصحاب فہود	جز عارض اعیان و حقائق نہ نمود
لیکن مکاشفات ارباب شہود	اشیا ہمہ عارض اند و معروض وجود

(لائحہ چہاردہم)

عرفان اتباع رسول سے حاصل ہو سکتی ہے خلاصہ کلام اینکہ :۔
(ا) وجود وہ نعمت ہے جو ہمیں حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے ۔
(ب) فقر وہ دولت ہے جو ہمیں حضور نے ارزانی فرمائی ہے ۔
بالفاظ دیگر :۔ اگر خدا نہ ہوتا تو ہم وجود سے سرفراز نہ ہوتے ۔
اور اگر آپ نہ ہوتے تو ہم کمالات وجود سے بہرہ ور نہ ہوتے ۔
چونکہ کمالِ زندگی کا حصول عشق رسول پر موقوف ہے اس لئے اقبال نے عشق رسول کو بجا طور پر شرط ایمان قرار دیا ہے ۔

طبع مسلم از محبت قاہر است
مسلم از عاشق نباشد کافر است

پانچواں شعر :۔ فقر کی بدولت انسان پاکیزگی اور روحانیت کے اعتبار سے فرشتوں پر تفوق حاصل کر سکتا ہے اور کائنات کی مخفی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔ ان دونوں باتوں کی وضاحت یہ ہے کہ
(۱) فرشتوں میں انکار یا نافرمانی کا مادہ موجود ہی نہیں ہے لہذا اگر وہ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں تو اس میں ان کا کوئی کمال نہیں ہے ۔ لیکن انسان میں نافرمانی کا مادہ موجود ہے اس لئے اگر وہ ہمت اور اختیار سے کام لے کر اپنی نفسانی خواہشات کو تابع احکام الٰہی کر دے تو بلاشبہ مستحق تحسین و آفرین ہے لہذا فرشتوں پر اس کی افضلیت از روئے عقل ثابت ہو گئی ۔
(۲) فقر کی بدولت انسان زمان و مکان پر غالب آ سکتا ہے ۔ اور جس شخص کو زمان و مکان پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے یہ ساری کائنات اس کی تابع فرمان ہو جاتی ہے ۔ اب رہی یہ بات کہ فقر کی بدولت انسان زمان و مکان پر کس طرح غالب آ جاتا ہے قال سے تعلق نہیں رکھتی اس لئے لفظوں کے ذریعہ سے نہ کہوں گا ۔

سمجھا سکتا ہے۔ تو کسی کی سمجھ میں آسکتی ہے اس کا تعلق حال سے ہے۔ یعنی اپنے اندر شان فقر پیدا کرو پھر تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ زمان و مکان پر کیسے قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔

پہلی مثال:۔ ایک سائنسدان (ماہر فن طبیعات) آپ سے کہتا ہے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن برتناسب خاص مل جاتے ہیں تو پانی بن جاتا ہے اب اگر آپ اس سے دریافت کریں کہ کیسے بن جاتا ہے تو وہ اس کا جواب یہی دیگا۔ کہ ماہر فن سے ان کے ملانے کا طریقہ سیکھو۔ پھر خود ملا کر دیکھ لو تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ کہ کیسے بن جاتا ہے۔

دوسری مثال:۔ آپ سرکس میں ایک عورت کو تار پر رقص کرتے دیکھتے ہیں اور حیران ہو کر اس سے دریافت کرتے ہیں کہ تو باریک تار پر کس طرح کھڑی ہو سکتی ہے؟ تو وہ اس کا جواب یہی دیگی کہ تم خود تار پر ناچنے کی مشق کر لو۔ تمہیں خود معلوم ہو جائیگا۔ کہ میں کس طرح کھڑی ہو سکتی ہوں۔

اسی طرح اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ انسان زمان و مکان کو کسی طرح مسخر کر سکتا ہے تو اس کا جواب یہی ہے کہ کسی ماہر فن (عاشق رسول) سے اس کا طریقہ سیکھ لو اس کے بعد اس کی مشق کرو تمہیں خود معلوم ہو جائیگا۔ کہ انسان زمان و مکان پر کیسے غالب آجاتا ہے۔

جسے عرف عام میں تصوف کہتے ہیں وہ در اصل تسخیر زمان و مکان کا عملی طریقہ ہے۔ اور جو شخص اس کا طریقہ بتاتا ہے اسے مرشد طریقت کہتے ہیں۔ مولینا نظام الدین بدایونی اسی طریقہ کو سیکھنے کے لئے حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رح کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور جب انہوں نے شیخ کی صحبت میں رہ کر زمان و مکان کو مسخر کر لیا۔ تو مولا نظام الدین بجائے کے بجائے محبوب الٰہی سلطان

المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے لقب سے چاردانگ عالم میں مشہور ہوگئے اور قیامت تک ان کی شہرت اسی طرح قائم رہیگی انشاء اللہ

چونکہ تسخیر زمان و مکان کا طریقہ کتابوں (قیل وقال) کے بجائے صرف مرد کامل کی صحبت اختیار کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے اسی لئے مرشد رومیؒ نے طالب حق کو یہ وصیت فرمائی ہے۔

قال را بگذار و مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

خود اقبال نے بھی اپنے روحانی مرشد کی تقلید میں اپنی قوم کو یہی مشورہ دیا ہے

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دیں از نظر[۱]

چھٹا شعر:- بر مقام دیگر انداز و ترا الخ مقام دیگر سے عالم ملکوت یا عالم روحانیت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فقر کی بدولت انسان مادی قیود سے آزاد ہو کر عالم ملکوت کی سیر کر سکتا ہے۔ یہ وہ عالم ہے جو زمان و مکان سے بالاتر ہے اسی مضمون کو انہوں نے یوں ادا کیا ہے ؎

ہستی او ہے جہات اندر جہات
او حریم و در طوافش کائنات

دوسرے مصرع میں زجاج کنایہ ہے۔ ضعف و عاجزی سے اور الماس کنایہ ہے۔ قوت اور سطوت سے مطلب یہ ہے کہ فقر کی بدولت انسان میں بھولی

---

[۱] اکبر الہ آبادی نے بھی یہی بات کہی ہے :-

ن کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا (اکبر)

طاقت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیری رح کی زندگی اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر ہے آخر وہ کونسی قوت تھی۔ جس کے پیش نظر انہوں نے اُس شہر کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ جہاں نہ کوئی ان کا دوست تھا نہ مددگار، نہ کوئی آشنا تھا نہ غمگسار؟ بلکہ یہ وہ شہر تھا جہاں کا حکمراں ان کا مخالف تھا۔ لیکن انہوں نے دشمنوں کی چھاتی پر بیٹھ کر مونگ دلنے شروع کر دیے! یعنی اُس ناسازگار ماحول میں اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ اجمیر کے بتکدہ میں بیٹھ کر انہوں نے اسلام کی وہ شمع روشن کی جس نے سارے ہندوستان کو منور کر دیا۔

آئندہ دس اشعار میں اقبال نے صاحب فقر کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان اشعار کا مطلب مجموعی طور پر لکھتا ہوں :-

(۱) کہتے ہیں کہ مرد درویش (صاحب فقر) کی طاقت کا سرچشمہ صرف قرآن عظیم ہوتا ہے۔ یعنی اس کتاب پر عمل کرنے سے اس میں یہ غیر معمولی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ کلیم کنایہ ہے۔ کائنات سے یعنی مرد درویش زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہوتا ہے۔

(۲) وہ اگرچہ بہت کم گفتگو کرتا ہے (کم گوید یعنی کمی گوید) لیکن اس کا وجود سینکڑوں ہزاروں انسانوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے (دم سے سانس بھی مراد ہو سکتی ہے اور صحبت اور ہستی بھی)

(۳) وہ ضعیف اور پست ہمت لوگوں میں ہمت اور حوصلہ پیدا کر دیتا ہے

(۴) وہ سلاطین وقت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے بوریے کی ہیبت اور سطوت سے تخت شاہی کانپنے لگتا ہے یعنی شاہان وقت اس کے سامنے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی دہلوی کی زندگی اس شعر کی صداقت پر شاہد ہے سلطان جلال الدین خلجی، سلطان علاؤ الدین خلجی اور سلطان قطب الدین مبارک خلجی تینوں بادشاہ ہوئے ہیں حضرت موصوف کو اپنے دربار میں سلام کیلئے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ مگر انہوں نے کسی بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی (الف) جلال الدین خلجی نے پیغام بھیجا کہ اگر میری واپسی پر آپ میرے سلام کو نہ آئے تو میں آپ کو زبردستی طلب کرونگا۔ آپ خاموش ہو گئے۔ جب وہ واپس آیا تو دہلی سے کچھ فاصلہ پر خیمہ زن ہوا۔ خدام نے عرض کی کہ شاید کل آپکو دربار میں جانا پڑیگا۔ آپنے فرمایا ہنوز دلی دور است۔ چنانچہ رات کے وقت یہ بادشاہ لشکر ہی کے محل کے نیچے دب کر مر گیا (ب) علاؤ الدین خلجی نے چند مرتبہ درخواست کی کہ دربار میں تشریف لائیے۔ لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ مجبوراً اس نے کہلا بھیجا کہ کسی دن میں خود حاضر ہو جاؤنگا۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ کہ بادشاہ سے کہہ دینا کہ فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں جب تم ایک دروازے سے داخل ہو گے میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤنگا (ج) مبارک خلجی نے بھی آپ کو کئی مرتبہ اپنے دربار میں طلب کیا اور جب آپ نے پیہم انکار فرمایا۔ تو اس بدبخت نے کہلا بھیجا کہ اگلے چاند کی پہلی تاریخ کو اگر حاضر نہ ہوئے تو میرے سپاہی آپ کو کشاں کشاں حاضر دربار کریں گے۔ آپ خاموش ہو گئے چند روز کے بعد چاند رات آئی آپ کے خادم خاص خواجہ اقبال کا بیان ہے کہ اس رات کو نصف شب کے قریب ایک خاص حالت میں چھت پر ٹہل رہے تھے۔ اور یہ شعر ورد زبان تھا۔

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش
با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

صبح کو خبر آئی کہ گذشتہ شب سلطان کے محبوب غلام خسرو خاں (ہندو بچہ) نے

لہ یہ فقرہ اسی زمانہ سے ضرب المثل ہو گیا ہے نیز ممکن الوقوع بات کیلئے بولا جاتا ہے۔

اپنے آقا کو قتل کر دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

(۵) وہ اپنے جذب باطن (جنوں) کی بدولت انسانوں کے دلوں میں جوش و خروش کا طوفان برپا کر دیتا ہے۔ اور انہیں سلاطین کے جبر و قہر سے آزاد کر دیتا ہے

(۶) وہ ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے جس میں زبردست (شاہین) زیردست (حمام) سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی دولتمند یا صاحب ثروت آدمی کی کمزور کو ستانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

فاروق اعظمؓ کی زندگی اس شعر کی بہترین تفسیر ہے۔ آپ کے عہد خلافت میں بلا مبالغہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ بخوف طوالت شواہد درج کرنے سے اجتناب کرتا ہوں۔ ناظرین الفاروق کا مطالعہ کریں۔

(۷) اس کا دل عشق الٰہی (جذب و سلوک) کی بدولت قوی ہو جاتا ہے اور اسی لئے وہ سلاطین کے سامنے بلا خوف و خطر یہ کلمہ حق کہہ دیتا ہے کہ اسلام ملوکیت کا دشمن ہے۔ اسلئے میں تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم نہیں کرتا۔

اسلام ملوکیت کا مخالف اس لئے ہے۔ کہ ملوکیت اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام کی ضد ہے اس کی وضاحت یہ ہے۔ کہ

ملوکیت، انسانوں سے یہ کہتی ہے کہ ملوک کے سامنے سر تسلیم خم کرو۔

اسلام، انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرو۔

چونکہ انسان ایک وقت میں ایک ہی آقا یا حاکم کی اطاعت کر سکتا ہے اسلئے اسلام بجا طور پر یہ تعلیم دیتا ہے کہ

لا ملوکیت فی الاسلام

یعنی اسلام میں ملوکیت کی گنجائش قطعاً نہیں ہے۔

جہاں تک علم کا تعلق ہے سب لوگ عالم ہوں یا عامی اس حقیقت سے

آگاہ ہیں۔ کہ اسلام نے ملوکیت کو حرام قرار دیا ہے۔ مگر سلاطین زمانہ کے منہ پر اس حقیقت کے اظہار کی جرأت صرف صاحب فقر میں پیدا ہو سکتی ہے۔

(۸) اس کے وجود سے ملت اسلامیہ میں دینی حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی ہیبت سے بڑے بڑے فرعونوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔

(۹) اور جب تک کسی قوم میں ایک صاحب فقر بھی موجود رہتا ہے تو وہ قوم دنیا میں ذلیل و خوار یا مفتوح اور محکوم نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد اقبال یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو اس آئینہ میں اپنی حالت دیکھ! مطلب اس مصرع کا یہ ہے کہ اپنے اندر یہی شان فقر پیدا کر   ع   تا ترا بخشند سلطان مبیں

یعنی اے مسلمان اگر تو اپنے اندر شان فقر پیدا کر لے تو کارکنان قضا و قدر تجھے غلبہ و اقتدار (سلطان مبین) عطا کر دیں گے۔

آخری شعر میں فقر کی ایک جامع اور مانع تعریف پیش کی ہے کہتے ہیں

لہ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ ملوکیت کے نشہ میں سرشار ہو کر اپنی اصلیت کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنے طرز عمل سے خدا کا مدعی بنجاتا ہے یعنی جس طرح فرعون نے زبان سے کہا تھا کہ میں خدا ہوں۔ وہ اپنے طرز عمل سے لوگوں پر یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ میں تمہارا خدا ہوں۔ دنیا کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ بادشاہ اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ سمجھتا ہے ذیل میں صرف ایک مثال درج کرتا ہوں۔ جب ہمایوں نے چانپانیر (گجرات) کے قلعہ کا محاصرہ کیا تو اسکی فوج میں بہت سے ہاتھی بھی تھے قلعہ فتح کرنے کے بعد اس نے ظہر کی نماز قلعہ کی مسجد میں ادا کی۔ شامت کے مارے امام نے پہلی رکعت میں سورۃ الفیل پڑھی چونکہ ہمایوں ہاتھی لے کر آیا تھا اسلئے اس نے یہ سمجھا کہ امام نے مجھ پر طنز و تشنیع کی ہے نتیجہ اس غلط فہمی کا یہ نکلا کہ جب امام نے سلام پھیرا تو شاہ دین پناہ نے حکم دیا کہ اس گستاخ ملازم کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈالدیا جائے تاکہ دوسروں کے لئے سامان عبرت مہیا ہو سکے ۱۲۔

(۱) حکمت یعنی پاکیزہ ترین اخلاقی نصب العین

(۲) قوت یعنی بہترین سیاسی نظام

حکمت کیا ہے؟ یہ فقر کی شان دلنوازی کا دوسرا نام ہے یا یوں سمجھو کہ فقر سے انسان میں پاکیزہ ترین اخلاقی اور روحانی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بدولت انسان اپنا نصب العین حاصل کر سکتا ہے۔ اور وہ نصب العین جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں یہ ہے کہ انسان میں خدائی صفات کا عکس پیدا ہو جائے

قوت کیا ہے؟ یہ اسی فقر کی شان بے نیازی کا دوسرا نام ہے یعنی فقر کی بدولت انسان میں شان بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے (بے نیازی کیا ہے؟ انسان کا بندوں سے بے نیاز ہو جانا) اور جب وہ بندوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔

بالفاظ دیگر فقر کی بے نیازی سے دین میں قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس قوت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان کسی بادشاہ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا

اس شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

(ا) فقر ہی سے مسلمان میں شان دل نوازی پیدا ہوتی ہے[1]۔ اور اس شان دل نوازی کی بدولت اس کا وجود بنی آدم کے حق میں باعث رحمت ہو جاتا ہے۔ اور یہی حکمت دین ہے کہ دوسروں کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرو۔

(ب) فقر ہی سے مسلمان میں شان بے نیازی پیدا ہوتی ہے اور اس شان بے نیازی کی بدولت وہ ایسا نظام حکومت قائم کرتا ہے جو بنی آدم کے حق میں موجب برکت ہو جاتا ہے۔ یعنی اس حکومت میں کوئی شخص کسی پر ظلم

---

[1] اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے: مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا۔ مروت حسن عالمگیر ہے مردان غازی کا

نہیں کر سکتا۔ اور دین میں جس قدر قوت پیدا ہوتی ہے وہ اسی شانِ بے نیازی کی بدولت پیدا ہوتی ہے کیونکہ جب مسلمان خدا کے علاوہ کسی انسان کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ دین اسلام کو قوت اور سر بلندی نصیب ہو جاتی ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ دین اسلام کی تمام باطنی اور ظاہری خوبیاں فقر ہی کے اندر پوشیدہ ہیں۔

دوسرا بند :۔ اس بند کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کی غرض و غایت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ دنیا میں اسلام کو غالب کرنے کے لئے اپنی تمام قوتوں کو وقف کر دے (تاکہ اس میں خدا کا بول بالا ہو سکے اسلامی حکومت قائم ہو سکے) جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو کر اللہ کی اطاعت کر سکیگا۔ قرآن حکیم کی یہ آیت اس دعویٰ (تصور) کی صداقت پر شاہد ہے۔

هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ (۹۔ ۳۳)	یقیناً اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دیکر دنیا میں بھیجا۔ تاکہ وہ اسکو تمام دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں (یعنی مشرک ضرور مخالفت کرینگے۔

لکھتے ہیں کہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق تعالےٰ نے تمام روئے زمین کو میرے لئے مسجد بنا دیا ہے لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج مسلمانوں کی یہ مسجد دوسروں کے قبضہ میں ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو انتہائی کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ اپنے آقا و مولیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مسجد پر دوبارہ قابض ہو سکیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمام روئے زمین میری مسجد ہے اس ارشاد بلیغ کے دو مطلب ہیں:۔

پہلا اور ظاہری مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے یا سجدہ کرنے کے لئے مسجد کی احتیاج نہیں ہے۔ وہ بھی اللہ کے (بندے) ہیں اور یہ زمین بھی اللہ کی ملکیت ہے اس لئے وہ جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ان کی عبادت کسی عمارت کے وجود پر موقوف نہیں ہے۔

اگر مندر نہ ہو تو کوئی ہندو "دیوی" کے درشن نہیں کر سکتا اسی طرح اگر گرجا نہ ہو تو کوئی عیسائی اپنی مقدس رسوم مذہبی ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک مسلمان ہر جگہ (جب وقت نماز آجائے) ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو سکتا ہے[1]۔

دوسرا اور باطنی مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ ساری دنیا کو (تمام روئے زمین کو) مسجد بنا دو۔ یعنی ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم کر دو۔ تاکہ ہر جگہ اللہ ہی کا قانون نافذ ہو سکے۔ اور ہر شخص آزادی کے ساتھ اللہ کے سامنے سر جھکا سکے کوئی انسان کسی کو اللہ کی عبادت سے باز نہ رکھ سکے۔ یا اس کی اذان یا نماز پر کوئی پابندی عائد نہ کر سکے[2]۔

---

[1] مذاہب عالم قبل اسلام میں معبد کی قید موجود تھی۔ مثلاً کوئی ہندو مندر (بتخانہ) کی چار دیواری سے باہر نکلکر اپنی پوجا پاٹ نہیں کر سکتا اسی طرح نصاریٰ کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے مراسم مذہبی گرجے کی مقدس عمارت کے اندر بیٹھ کر ادا کریں حضور نے یہ کہکر تمام روئے زمین میری مسجد ہے مسلمانوں کو اس پابندی سے آزاد کر دیا ہے

[2] چونکہ مسلمانوں نے ہندوستان میں اللہ کی حکومت کے بجائے اپنی حکومت قائم کر کے دال کنور کو ملکہ ہندوستان بنا دیا۔ اسلئے غیرت الٰہی نے سکھوں کو غافل مسلمانوں کی تعذیب پر مامور کر دیا۔ اور

ابتدائی دوسرا مفہوم (جو حقیقی مفہوم ہے) مسلمانوں کے پیش نظر رہا چنانچہ انہوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت محض اس لئے الٹ دیئے کہ اللہ کے بندے ان خداؤں کی غلامی سے آزاد ہو سکیں۔ لیکن جب مسلمان ... خود ملوکیت کے غلام ہو گئے تو صرف پہلا مفہوم دماغوں میں باقی رہ گیا۔

اقبال کا ملت اسلامیہ پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس کے افراد کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اور بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ اے مسلمانو! آج تمہارے آقا و مولیٰ کی مسجد کافروں کے قبضہ میں ہے اٹھو! اور اسے ان کے قبضہ سے نکالو۔ یعنی تمام روئے زمین کو اپنے تصرف میں لے آؤ۔ تاکہ قرآن حکیم کی وہ پیشگوئی پوری ہو سکے۔ جو لیظہرہٗ میں پوشیدہ ہے۔

چونکہ ایک عرصہ سے مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ سرد ہو چکا ہے اور ان کی ذہنیت ترک جہان کی طرف مائل ہو چکی ہے۔ اس لئے اقبال نے بجا طور پر انہیں متنبہ کیا ہے۔ کہ

اے کہ از ترک جہاں گوئی، مگو
ترک ایں دیر کہن تسخیر او

یعنی اے مسلمان! تو ترک دنیا کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ کیوں؟ اس لئے تو اسلام کا پیرو ہے۔ وہ ترک جہاں کی بجائے تسخیر جہاں کا حکم دیتا ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ اسلام کی رو سے ترک جہاں کا مفہوم ہی تسخیر جہاں

(پچھلے صفحہ سے آگے) اسا سے پنجاب میں بانگ اذان پر پابندی لگا دی بلکہ اٹھارہویں صدی کے آخر اور رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں سکھوں نے پنجاب کی اکثر مسجدوں کو خون خنزیر سے آلودہ کیا اور نسخہ ہائے قرآن کو لاہور کے گردو اندوں کی پیشرجیاں بنایا (دیکھو سفرنامہ مسٹر بیل (BELL) مطبوعہ لندن ۱۸۳۸ء)

ہے۔ ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت کی جاتی ہے۔

واضح ہو کہ دنیا کے اکثر مشہور مذاہب مثلاً جین دھرم، بودھ دھرم ہندو دھرم اور مسیحیت کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ

(الف) مادہ؛ ناپاک ہے کیونکہ بدی اس کی ذات میں داخل ہے۔

(ب) اس لئے دنیا بھی (جو سراسر مادی ہے) ناپاک ہے۔

(ج) اس لئے ترک دنیا لازمی ہے۔ اس کے بغیر انسان روحانی ترقی نہیں کر سکتا۔

اس مفروضہ کی رو سے ترک دنیا کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا اور علائق دنیوی سے یکسر قطع تعلق کر لینا چاہیئے۔ یعنی ترک دنیا کے معنی ہیں واقعی ترک دنیا لفظاً و معناً۔

لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ یا دنیا ناپاک نہیں ہے چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ط (۶ - ۷۳)	اللہ وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بمصلحت خاص پیدا کیا۔

چونکہ قرآن حکیم کی رو سے تخلیق کائنات بالحق ہے اس لئے یہ دنیا قبیح شر یا ناپاک نہیں ہو سکتی۔

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تخلیق میں مصلحت الٰہی یہ ہے کہ انسان جو خلیفۃ اللہ ہے اُسے مسخر کرے تاکہ اس میں حکومت الٰہیہ قائم کر کے خود اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کر سکے۔

اسلئے قرآن حکیم انسان کو حکم دیتا ہے کہ پہلے اس دنیا کو مسخر کرو پھر اس میں خدا کا قانون نافذ کرو۔

جس وقت انسان دنیا میں خدا کا قانون نافذ کریگا۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ دیکھے گا کہ وہ اس کی تمام اذتوں کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ترک کر دے گا۔ مثلاً اس کے قبضہ میں کروڑوں روپے ہونگے مگر وہ بیت المال کی سے صرف اتنی رقم لے گا۔ جو اس کی جائز ضرورتوں کیلئے کافی ہو سکے بالفاظ دگر، وہ دنیا کا مالک ہوتے ہوئے اللہ کے لئے دنیا کو ترک کر دیگا یعنی ترک دنیا اسلام میں بھی ہے مگر اس کا مفہوم ہے تسخیر دنیا۔ اب پڑھو یہ مصرعہ۔

ترک ایں دیر کہن تسخیر او

اگلے شعر میں اقبال نے خود اس شعر کی وضاحت کی ہے کہتے ہیں کہ اسلام کی رو سے دنیا سے چھٹکارا حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ اسے اپنے قبضہ میں لے آؤ۔ پھر اسے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ترک کر دو۔

بغرض اسپ تمھیں ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں مگر یہ تمہیں اسکی دلفریبی سے نجات نہیں دے سکتے کیونکہ انسان کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب تک وہ کسی شئے کو حاصل نہیں کر لیتا اس وقت تک اس کی آرزو اس کے دل سے نہیں نکل سکتی۔ یعنی بظاہر ترک دنیا کے باوجود وہ مادیات میں پھنسا رہتا ہے۔

لیکن اسلام چونکہ عین فطرت ہے اس لئے وہ تمہیں یہ حکم دیتا ہے۔ کہ اسے مسخر کرو۔ اور جب وہ تمہارے قبضہ میں آجائے تو اسے اللہ کی خوشنودی کے لئے ترک کر دو۔ اس طرح تم دنیا میں رہتے ہوئے مادیات سے بالاتر ہو جاؤ گے۔

ترک دنیا کا اسلامی مفہوم ذہن نشین کرنے کے بعد اقبال پھر مسلمان سے مخاطب ہوتے ہیں کہ اے مسلمان یہ جہان آب و گل، یہ مادی دنیا تو "صید مومن" ہے یعنی اللہ نے یہ دنیا پیدا اسی لئے کی ہے کہ تو اسے

مسخر کرے۔ لہٰذا تیرا یہ کہنا کہ "دنیا ترک کردو" ایسا ہی خلافِ عقل ہے۔ جیسا کسی کا باز سے یہ کہنا کہ اپنے صید کو ترک کردو۔

کہتے ہیں کہ میں آج تک نہ سمجھ سکا کہ مسلمان ان تمام حقائق سے آگاہ ہونے کے باوجود ترکِ دنیا کی طرف کیسے مائل ہوگیا۔

کیا اُس شاہین کی زندگی قابلِ افسوس نہیں ہے۔ جو شاہین ہو کر شکار سے مجتنب ہو جائے۔؟ اور فضائے نیلگوں میں پرواز کے بجائے اپنے آشیانے میں سرنگوں بیٹھا رہے۔

تیسرا بند:۔ یہ بہت غور طلب ہے کیونکہ اس میں اقبالؔ نے فقرِ مومن اور فقرِ کافری میں جو فرق ہے اسے نہایت دل نشین انداز میں واضح کیا ہے۔

(۲) اسلامی فقر یا فقرِ مومن کیا ہے؟ خود جواب دیتے ہیں کہ فقرِ مومن تو تسخیرِ کائنات کا دوسرا نام ہے یعنی اسلامی فقر مسلمانوں کو تسخیرِ کائنات پر آمادہ کرتا ہے مومن اس کائنات کو کیسے مسخر کرسکتا ہے؟ جواب دیتے ہیں کہ اسلامی فقر سے مسلمان کے اندر صفاتِ ایزدی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ کائنات کو مسخر کرسکتا ہے۔

فقرِ کافر (غیر اسلامی فقر) کیا ہے؟ جنگل میں جا کر خلوت نشین ہو جانا یعنی کافر بظاہر تارک الدنیا ہوتا ہے مگر دراصل متروک الدنیا ہوتا ہے وہ خود دنیا ترک نہیں کرتا۔ درحقیقت دنیا اُسے ترک کر دیتی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اُس کے قبضۂ قدرت اور حیطۂ اقتدار میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس کے مقابلہ میں مومن، حقیقی معنی میں ترکِ دنیا کرتا ہے یعنی دنیا

اس کے تصرف میں ہوتی ہے مگر وہ اُسے ذاتی فوائد کے لئے استعمال نہیں کرتا وہ اگر چاہے تو سونے کے برتنوں میں کھانا کھا سکتا ہے مگر وہ چونکہ مادیات کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس لئے نانِ جویں پر قناعت کرتا ہے۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے اس کے قدموں میں ہوتے ہیں مگر وہ قوم کی اجازت کے بغیر اپنے استعمال کے لئے بیت المال سے دو تولے شہد بھی نہیں لیتا۔ اس کے قبضہ میں دیبا و حریر کے ملبوسات ہوتے ہیں مگر وہ ایسی قمیص پہنتا ہے۔ جس پر بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے ہیں۔

اور اس ترک دنیا کے باوجود شاہانِ عالم اس کے نام سے لرزہ بر اندام ہو جاتے ہیں۔ اور خالد جانباز جیسا نامور سپہ سالار اس کے حکم سے سرمُو انحراف نہیں کر سکتا۔ وہ لاکھوں انسانوں پر حکومت کرتا ہے مگر غلّے کی بوری اپنے کاندھے پر اٹھا کر ایک غریب بدو کے خیمہ میں پہنچاتا ہے۔ رضی اللہ عنہ

چونکہ کافر کا فقر اسے دنیا سے فرار کی تعلیم دیتا ہے اسلئے وہ کسی غار میں جا کر خلوت نشین ہو جاتا ہے اور اپنی تمام زندگی بحالتِ سکون بسر کر دیتا ہے لیکن مردِ مومن چونکہ احتساب کائنات کرتا ہے اور اس سلسلہ میں اُسے یقینی طور پر باطل سے برسرِ جنگ ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے اس کی زندگی سکون کے بجائے مسلسل جدوجہد ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ اکثر حالات میں میدانِ جنگ میں شہادت ہی ہوتا ہے ؎

کافر اور مومن دونوں طالبِ خدا ہوتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ کافر

؎ یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ میرا اشارہ جناب فاروق اعظمؓ کی طرف ہے جن سے بہتر حکمران چشم فلک نے آجتک نہیں دیکھا۔

؎ یہی وجہ ہے کہ جین دھرم بودھ دھرم اور ہندو دھرم میں ہندو کیلئے کوئی لفظ نہیں یہ مذاہب راہِ خدا میں جان دینے کے تصور ہی سے ناآشنا ہیں۔

ترکِ دنیا کے ذریعہ سے اُسے حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن مومن اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی خودی کو سچائی کی فسان (سان) پر تیز کرتا ہے یعنی مومن، قرآن (حق) کی تعلیمات پر عمل کر کے اپنی خودی کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے اور جب خودی پختہ ہو جاتی ہے تو وہ باطل کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتا ہے۔

بالفاظ دگر کافر، خدا کو سکون غار میں تلاش کرتا ہے لیکن مومن اس کو جنگ میں ڈھونڈھتا ہے۔

فقر کافر یعنی غیر اسلامی فقر کی تعلیم یہ ہے کہ خودی، باطل یا فریب یا مایا ہے اس لئے اسے فنا کر دو لیکن اسلامی فقر اس کے برعکس یہ تلقین کرتا ہے کہ خودی حق ہے اس لئے اس کی تربیت کر کے مرتبہ کمال تک پہنچا دو۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے ؎

آں خودی را کشتن و واسوختن

ایں خودی را چوں چراغ افروختن

یعنی فقر کافرانہ (غیر اسلامی فقر) خودی کو فنا کر دینے یا نیست و نابود کر دینے کا نام ہے مگر فقر مومنانہ (اسلامی فقر) اسے مرتبہ کمال تک پہنچا دینے کی تلقین کرتا ہے جہاں پہنچکر وہ مثل چراغ منور ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ ہندوستان کے تمام مذاہب اور مدارس فکر کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ زندگی سراپا دکھ، مصیبت، رنج و غم ہے اس لئے یہ دنیا اپنی ذات کے اعتبار سے شر (EVIL) ہے

(۱) ہندو دھرم، بودھ دھرم اور جین دھرم تینوں مذہبوں کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ دنیا بدی کا گھر ہے ہم یہ تو نہیں جانتے کہ ہم اس قید میں کیونکر داخل ہو گئے لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس سے رہائی کیونکر

حاصل کر سکتے ہیں۔

(۲) ان تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم کا نقطہ آغاز "خدا" نہیں ہے بلکہ ذاتی تجربہ یا مشاہدہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(ا) انسانی زندگی دکھ سے معمور ہے کلیش سے بھرپور ہے۔

(ب) دنیا باعتبار ذات سراپا شر اور بدی اور برائی ہے۔

(ج) اس کی بنیاد خواہش زیست پر ہے

(د) اس لیے انسان کے دکھ کا بنیادی سبب "خواہش" ہے

(ہ) لہذا خواہش آرزو، تمنا یا ارادہ کو فنا کر دو۔

(۳) ہندوستان کے تمام مدارس فکر کی بنیاد دکھ کے احساس پر ہے۔ چنانچہ سانکھ کریکا مصنف لکھتا ہے۔

دکھ ترے ابھی گھاتت جگّیاس تد سے گھاتک ہیتو،

یعنی فلسفیانہ غور و فکر کا آغاز دکھ کی تین قسموں کے احساس سے ہوتا ہے ہندو فلسفہ میں دکھ کی تین قسمیں ہیں۔

۱ ادھیا تمک یعنی ذہنی یا روحانی دکھ۔

(۲) ادھی بھوتک یعنی جسمانی دکھ۔

(۳) ادھی دیوک یعنی حادثاتی یا اتفاقی یا عارضی دکھ۔

(۴) اس قنوطیت (PESSIMISM) کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ "تیاگ" کو بہترین طرز حیات یقین کیا جائے واضح ہو کہ تیاگ کو عرف عام میں ترک دنیا یا رہبانیت کہتے ہیں۔

لہ شوپن ہاور (جرمنی فلسفی) کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ دنیا سراسر شر ہے اور یہ خواہش زیست (WILL TO LIVE)

(۵) رہبانیت کے مشہور علمبردار سوامی وویکانند کا مشہور قول ہے کہ میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ دنیا کیسے معرض وجود میں ہو گئی؟ کوئی فلسفہ اس گتھی کو نہیں سمجھا سکتا لیکن میں اس جیلخانہ سے رہائی پانے کا طریقہ ضرور جانتا ہوں اور رہائی پانا ہمارے لئے اشد ضروری ہے۔

(۶) مکمل طور پر ترک کر دینا ہی زندگی کا بلند ترین آورش (نصب العین) ہے اس کو اصطلاح میں سنیاس کہتے ہیں۔

(۷) اسی لئے ان تمام مذاہب نے تجرد (عورت سے بیگانگی) کو تاہل گرہستی یا نکاحی زندگی سے افضل قرار دیا ہے۔

(۸) اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر تجرد اور ترک دنیا کو دستور حیات بنا لیا جائے تو پھر فوج، حکومت سلطنت تجارت صنعت وحرفت، اسکول، کالج فیکٹریاں کارخانے دفاتر، سینما اوپیرا تھیٹر، رقص وسرود، ہاکی، کرکٹ، فٹ بال غرضکہ زندگی کی ساری گہما گہمی اور رونق ہی ختم ہو جائیگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر برہمچریہ (تجرد) کی بدولت دنیا میں توالد وتناسل کا سلسلہ بند ہو جائے تو

واضح ہو کہ سوامی جی نے جو کچھ کہا ہے یہی ویدانت فلسفہ کی الف ب تے ہے اس کے برعکس اسلامی تصوف (فلسفہ وحدۃ الوجود) کی تعلیم یہ ہے کہ (ا) یہ دنیا حق کے اسماء صفات کی تجلیات ہیں جس کا دوسرا نام ہے بقول شیخ اکبر وجود مطلق بتقاضائے صفت جود خویش بصورت اعیان ثابتہ جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔ (ب) یہ دنیا جیلخانہ نہیں ہے بلکہ حق کی صفت جود وکرم کا ظہور ہے

من نکردم خلق تا سودے کنم — بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

اسلئے وحدۃ الوجود کے اسلامی عقیدے کو ویدانت فلسفہ سے ماخوذ سمجھنا دونوں سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ ۱۲

اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے : اگر اس طرح سارے انسانوں کو مکتی حاصل ہو جائے تو پھر اور باقی ہی کیا رہ جاتا ہے جسکی آرزو کیجائے؟ اگر دنیا ختم ہو جائے تو دوسرے لفظوں میں مقصد زندگی حاصل ہو جائے گا[1]

نوٹ :- متی کی انجیل ۱۹ ـ ۱۰ تا ۱۲ میں مخنثوں کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں (۱) جو ماں کے پیٹ سے نامرد پیدا ہوتے ہیں (۲) جن کو دوسرے لوگ مخنث (ہیجڑا) بنا دیتے ہیں (۳) جو آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے خود اپنے آپ کو (مخنث) نامرد بنا لیتے ہیں۔ نیز اکرنتھیوں ۷ ـ ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ پولس نے بھی تجرد کو تاہل پر ترجیح دی ہے چنانچہ ۷ ـ ۷ میں وہ کہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ میری ہی طرح زندگی بسر کریں۔۔۔ پھر ۷ ـ ۸ میں کہتا ہے کہ میں غیر شادی شدہ افراد اور رانڈ عورتوں سے یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ میری طرح رہیں تو بہتر ہے خلاصہ کلام یہ کہ مسیحیت نے بھی ہندو دھرم کی طرح رہبانیت ترک کر دینا اور تجرد کو گرہستی زندگی سے بہتر قرار دیا ہے۔

(۶) ہندوستان کے تمام مذاہب نے باستثنائے چارواک مت، قنوطیت اور رہبانیت کی تعلیم دی ہے چنانچہ مسٹر کے این مترا اپنے مقالہ، قنوطیت اور زندگی کا نصب العین میں لکھتے ہیں۔ کہ ہمارے (ہندی) مذاہب اور ہمارے فکر میں تصور خدا " قدر مشترک نہیں ہے۔ بلکہ قنوطیت اور رہبانیت قدر مشترک ہے اور یہی ہمارے کلچر کا سنگ بنیاد ہے یہی ہماری تہذیب کی روح ہے۔ ویدانت جس میں وحدت الوجود کی تعلیم دی گئی ہے سانکھ درشن جس میں خدا کا انکار کیا گیا ہے۔ نیائے اور ویشیشک جس میں خدا محض نمت کارن (علت فاعلی) ہے۔ مہایان بدھ دھرم جس میں خدا کے علاوہ روح (نفس

---

[1] دیکھو مسٹر کے این مترا کا مضمون شائع شدہ در ویدانت کیسری ۱۹۲۵ء

ناطقہ) کا بھی انکار کیا ہے۔ اور جین دھرم تو صاف لفظوں میں خالق وصانع کائنات کا منکر ہے۔ یہ تمام مذاہب تین بنیادی اصول پر متفق اور متحد ہیں۔

اصل اوّل:۔ زندگی سراپا دکھ اور عذاب ہے۔

اصل دوم:۔ ہمارے دکھ کا کارن (سبب) آرزو ہے جسے ترشن (اتھاہ) کہتے ہیں۔

اصل سوم:۔ مقصد حیات اس دکھ کا ناش کرنا۔

خلاصہ کلام ایںکہ مقصد حیات میں کامیابی صرف تیاگ (رہبانیت) سے ہو سکتی ہے۔ اور تیاگ (رہبانیت) کا مطلب ہے خواہش کو فنا کر دینا۔ یعنی اپنے آپ کو فنا کر دینا۔

؎ ایں خودی را کشتن و واسوختن

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم ہندوستان کے مختلف مذاہب کی راہبانہ تعلیم کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:۔

ہندو دھرم:۔ ہندو دھرم میں جس قدر فلسفیانہ مدارس فکر قائم ہوئے سب نے زندگی کو ایک قسم کی قید قرار دیا ہے۔ یعنی روح انسانی سابقہ گناہوں کی وجہ سے جسم کی قید میں ہو کر سزا بھگت رہی ہے شریر (جسم) آتما (روح) کے لئے بمنزلہ قید خانہ ہے۔ اس لئے جب تک روح اس قید خانہ سے ہمیشہ کے لئے رہائی حاصل نہ کرلے۔ ہمارے دکھ کا خاتمہ ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ترک دنیا (رہبانیت) کے ذریعہ سے روح اور جسم کے اس تعلق کو ختم کر دینا چاہیئے۔ یعنی

؎ ایں خودی را کشتن و واسوختن

(الف) دکھ کا سبب، بندھن (ربط جسم و روح) ہے۔

(ب) اور یہ بندھن ٹوٹ نہیں سکتا جب تک کرم (عمل) کا سلسلہ جاری ہے

(ج) اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا جب تک آرزو (ترشنا) باقی ہے۔

(د) اس لئے آرزو کو ختم کر دو۔ زندگی خود بخود ختم ہو جائیگی کیونکہ جب آتما اس جسم کی قید سے آزاد ہو جائے گی۔ تو نجات ہو جائیگی اور نجات یافتہ روح دوبارہ جسم کی قید میں ہرگز نہیں آسکے گی یعنی پھر اس پر دنیاوی زندگی کا اطلاق نہیں ہو سکے گا بالفاظ دگر دنیاوی زندگی کا خاتمہ بالخیر ہو جائیگا۔

یا یوں کہیے۔ کہ ہندو دھرم کی رو سے زندگی ایک بڑی لعنت ہے اسلئے ہر عقلمند آدمی کا فرض منصبی (اخلاقی آدرش یا نصب العین) یہ ہے کہ وہ اس لعنت سے نجات حاصل کرے اور ظاہر ہے۔ کہ یہ مقصد صرف نفی حیات ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ زندہ رہتے ہوئے کوئی شخص بھی زندگی کے لوازم دکھ درد، رنج و غم، تلخی پریشانی (بیست کلیشی) سے نجات نہیں پا سکتا۔ زندگی نام ہی ہے دکھ کے غیر مختتم سلسلہ کا حیات نام ہی ہے غم و اندوہ کی مسلسل داستان کا۔ لہذا جس طرح ممکن ہو اس زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ [۱]

---

[۱] درحقیقت تو نروان کی یہ تعلیم سراسر غیر اسلامی ہے اسی لئے اقبال نے اپنی ساری عمر اسکے خلاف جہاد میں بسر کر دی ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اقبال اس تصوف کے خلاف ہیں جو اسلامی نہیں بلکہ غیر اسلامی ہے جو ترک دنیا رہبانیت، خلوت گزینی، سکون، بے عملی اور مایوسی، مسکینی اور محرومی کی تعلیم دیتا ہے چنانچہ وہ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں اے مرد خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل، جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید، جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد۔ یعنی اسلام اس تصوف کا حامی نہیں ہے جو انسان کو بے عمل اور خلوت نشین اور تارک الدنیا بنا دے اسکے برعکس اسلامی تصوف شہنشاہ کو سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیری اور سلطان المشائخ سلطان نظام الدین اولیاء جیسی بنا دیتا ہے

چنانچہ پورو مانسا درشن کی تعلیم یہ ہے کہ موکش (نجات) نام ہے دھرم اور ادھرم (حرکت اور سکون) کے خاتمہ کی بدولت جسم کا پورے طور سے فنا ہو جانا۔ جو شخص موکش کا طالب ہے وہ سب سے پہلے کرم (اعمال) کا خاتمہ کرتا ہے۔ بعد ازاں کامل ریاضت اور صحیح علم کی بدولت جسمانی زندگی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ [1]

جین دھرم :- جین دھرم کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی اور شخصیت دونوں کی نفی کر دی جائے۔ کیونکہ یہ زندگی دکھ اور مصیبت ہے۔ اور دکھ سے نجات پانا ہی مقصد حیات ہے اور چونکہ دنیا سے علاقہ یا سمبندھ رنج و غم کا سبب ہے۔ اس لئے ترک دنیا بہترین طرز زندگی ہے۔

جین دھرم نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اپنے جذبات پر قابو حاصل نہ کر سکے۔ اور ریاضت (ترک لذات) پر بھی قادر نہ ہو سکے تو اُسے خودکشی کر لینی چاہیئے۔

؎ اں خودی را کشتن و واسوختن

ذیل میں ایک جینی راہب کی زندگی کا پروگرام درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ جین دھرم میں زندگی اور شخصیت کو فنا کر دینا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ بلکہ یہی مقصد حیات ہے

ڈگمبر جینی راہب کے لئے ضروری ہے کہ برہنہ رہے لوٹے، مور چھل اور کتابوں کے علاوہ کوئی سامان اپنے پاس نہ رکھے۔ زمین پر سوئے۔ دن رات میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھائے وہ بھی کھڑے ہو کر جسم کے بال

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو تاریخ فلسفہ ہند جلد دوم صفحہ ۲۲۳ مولفہ ڈاکٹر سر رادھا کرشن مطبوعہ لندن ۱۹۲۷ء

اپنے ہاتھ سے اکھیڑے کسی جاندار کو ایذا نہ پنچائے کبھی شادی نہ کرے۔ روپے پیسے کو ہاتھ نہ لگائے بلا ضرورت گفتگو نہ کرے اپنے دل کو نفرت اور محبت کے جذبات سے خالی کرے۔

بودھ دھرم:۔ بودھ دھرم دراصل راہبانہ نظام ہے اور دنیا میں رہبانیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے۔ کہ زندگی سراسر دکھ ہے۔ نہ خدا ہے نہ روح۔ جسے عرف عام میں روح کہتے ہیں۔ وہ دراصل گیان دھارا (شعور کا تسلسل) ہے۔

ہماری ہستی کا سبب خواہش زیست ہے۔ لہذا نجات (مکتی) اس کی نفی کا نام ہے۔ پیدا ہونا سب سے بڑا گناہ ہے لہذا نروان (نیستی) سب سے بڑا نصب العین ہے۔ خواہشات کو فنا کر دو تاکہ پیدائش کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ نروان کا مطلب ہے۔ بجھ جانا یا ٹھنڈا ہو جانا۔ [1]

نجات کے لیے تجرد (عورت سے دور رہنا) شرط ہے کیونکہ عائلی زندگی سے خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ اور خواہش سے انسان بار بار پیدا ہوتا ہے۔ خواہش کو فنا کر دو۔ تاکہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے یعنی

ع آں خودی را کشتن و واسوختن

اسلامی اور غیر اسلامی فقر میں امتیاز کے بعد اقبال یہ کہتے ہیں کہ جب صاحب فقر (مومن) خودی کی مخفی طاقتوں کا مظاہرہ کرتا ہے تو زمین و آسمان میں لرزہ پڑ جاتا ہے آئندہ شعر میں "فقر عریاں" کی مثال دی ہے۔ کہ جنگ بدر اور جنگ حنین میں مسلمانوں کو جو کامیابی ہوئی وہ اسی لئے کہ انہوں نے خودی کا مظاہرہ

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھو تاریخ فلسفہ ہند جلد اول ص ۳۶۲ تا ص ۳۸۲ مولفہ ڈاکٹر سر رادھا کرشن مطبوعہ لندن ۱۹۲۷ء

کیا تھا۔ بالفاظ دگر، کافر کا فقر اسے غار کی طرف لے جاتا ہے۔ جہاں وہ خلوت میں بیٹھ کر اپنی شخصیت کو فنا کر دیتا ہے لیکن مومن کا فقر اسے میدان جنگ میں لے جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنی شخصیت کا مظاہرہ کرتا ہے زندہ رہا۔ تو غازی اور مارا گیا تو شہید، یعنی دونوں صورتوں میں اس کی جیت ہوتی ہے۔

آخری شعر میں اس تاریخی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ کہ جب سے مسلمانوں نے میدان جنگ میں اپنی شان فقر کا مظاہرہ کرنا ترک کر دیا تو انکی زندگی میں شان جلال بھی باقی نہ رہی۔

چوتھا بند :- عصر حاضر کے مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی پر ماتم کرتے ہیں کہ افسوس! آج فقر (لا الٰہ) کی تلوار کسی مسلمان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ مسلمان، غیر اللہ کی محبت اپنے دل سے نکال دیں۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو کب تک یہ بے غیرتی کی زندگی بسر کرتا رہے گا؟ یہ زندگی تو دراصل موت ہے۔

اللہ کا بندہ وہ ہے جو اپنے آپ کو دوبارہ پیدا کرے یعنی اپنے اندر شان فقر پیدا کرے۔ جب مسلمان اپنے اندر شان فقر پیدا کرے گا تو گویا دوبارہ پیدا ہو جائیگا۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نور حق کی روشنی میں دیکھے۔ نور حق کی روشنی میں دیکھنے کا مطلب ہے اپنے اندر ایمان کامل پیدا کرنا۔

بالفاظ دگر وہ اپنے آپ کو اس معیار پر جانچے جو آنحضرت صلعم نے اسکے لئے مقرر فرمایا ہے۔ اور وہ معیار حقیقی تو سوا سکے نہیں مسلمان حقیقی

معنی میں مومن اس وقت ہوتا ہے جب حضور کی محبت تمام محبتوں پر غالب آجائے۔ جب مومن میں یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے یعنی وہ دنیا جس میں انسانوں کے قانون کے بجائے اللہ کا قانون نافذ ہوتا ہے۔

پانچواں بند۔ افسوس مسلمان قوم پر کہ دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایک عرصہ سے اس میں میر و سلطان تو پیدا ہو رہے ہیں مگر کوئی درویش (صاحب فقر) پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمانان عالم کی موجودہ حالت ناگفتہ بہ ہے۔

چہ ایں قیامت اندرون سینہ بہ

اب ہندوستان کے مسلمان نوجوان[1] کی حالت یہ ہے کہ

(۱) وہ اپنے مستقبل سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں اور اس کی خاص وجہ یہ ہے۔ کہ مدتوں سے ان میں کوئی مرد باخدا پیدا نہیں ہوا ہے جو ان کے اندر ذوق یقین اور جذبۂ جہاد پیدا کر سکتا ہو۔

(۲) فقدان یقین کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قوت دین سے بدظن ہو گئے۔ یعنی اب ان کے دلوں سے یہ حقیقت محو ہو چکی ہے کہ اگر ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں۔ تو دوبارہ کفار پر غالب آ سکتے ہیں۔

واضح ہو کہ قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں مسلمانوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳ — ۱۳۹)

اگر تم اپنے اندر سچا ایمان پیدا کر لو تو بلاشبہ تم ہی غالب رہو گے۔

---

[1] اقبال نے یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں لکھی تھی جب پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ لہذا اس بند کو پڑھتے وقت اسی زمانہ کو مدنظر رکھیے۔ ۱۲

چونکہ وہ ایمان سے محروم ہیں۔ اس لئے خود ہی اپنے رہزن بن گئے ہیں یعنی ان کی ذلت اور محکومی کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ ذوق یقین سے بیگانہ ہیں۔

نیز صدیوں سے یہ ذلیل و خوار قوم عشق رسول (سوز اندروں) کے بغیر زندگی بسر کر رہی ہے واضح ہو کہ اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں مسلمانوں کی ذلت اور محکومی کا یہی ایک سبب بیان کیا ہے۔ کہ ان کے قلوب عشق رسول سے خالی ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ارمغان حجاز میں لکھتے ہیں ؎

مسلمان چرا زار و زبوں و خوار اند | شبے پیش خدا بگریستم زار
دلے دارند و محبوبے ندارند | ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم

چونکہ ان کے قلوب محبت رسول سے خالی ہو چکے ہیں اس لئے ان کی حالت یہ ہے کہ

ع پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق

یعنی ان کا حوصلہ پست ہو چکا ہے طبیعت ادنیٰ چیزوں کی طرف مائل ہے اور مذاق بگڑ گیا ہے یعنی نیکی اور بدی میں امتیاز نہیں کر سکتے۔

چونکہ ان کے مذہبی پیشوا خود عشق رسول کی نعمت سے محروم ہیں اس لئے ان کے حلقہ ہائے درس و تدریس میں سب کچھ ہے مگر عشق رسول کی تعلیم نہیں ہے۔

عقائد کی خرابی (زشتی اندیشہ) نے انہیں زندگی کے ہر شعبہ میں ذلیل و رسوا کر رکھا ہے اور اسی لئے وہ فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہیں بلکہ اپنے آپ سے بیزار ہیں۔

چونکہ وہ اپنے مقام سے بیگانہ ہیں یعنی چونکہ وہ اس حقیقت سے ناآشنا

ہیں کہ اللہ نے انہیں ساری قوموں کا سردار بنایا ہے اسلئے ان میں انقلاب برپا کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

واضح ہو کہ اسلام دراصل ایک انقلاب آفریں نظام حیات کا نام ہے یعنی اسلام اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیتا ہے کہ دنیا کو ملوکیت کی لعنت سے آزاد کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان شمشیر کف ہو کر ملوکیت کو دنیا سے مٹا دیں۔ بالفاظ دگر دنیا میں انقلاب برپا کردیں لیکن یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب مسلمان اپنے منصب اور مقام سے آگاہ ہو اور آگاہی اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ اس آیت کے مفہوم پر غور کریں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (۳ — ۱۱۰)

اے مسلمانو! تم بہترین امت ہو جو پیدا کی گئی ہے بنی آدم کے فائدے کے لئے۔ (تمہارا فرض منصبی یہ ہے کہ تم لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔ اور تمہارے اندر یہ طاقت اسلئے پیدا ہوئی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔

گویا اللہ تعالےٰ نے ہمیں اس لئے پیدا کیا تھا۔ کہ ہم انسانوں کو نیکی کا حکم دیں اور بدی سے روکیں۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم خود دوسروں کے غلام ہیں، محکوم ہیں بلکہ قوت لایموت کے لئے کافروں کے ممنون احسان ہیں۔

ہم دوسروں کو تو بدی سے کیا روک سکتے ہیں خود ہر قسم کی بدکاری کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ اس معاملہ میں دنیا کی کوئی قوم ہماری

برابری نہیں کر سکتی [۱] - اخلاقی پستی کے اعتبار سے ہم شرّ امّۃ کے مصداق ہیں ۔

چونکہ مسلمان مرد مجبور (اللہ کا دوست) کی صحبت اختیار نہیں کرتے اس لئے مایوس، شکستہ دل اور صداقت سے بیگانہ ہوگئے ہیں اس زمانہ کے مسلمان " رد کردہ مولا " یعنی مردود بارگاہ ایزدی ہیں ۔ نیز مفلس اور اپنے فرائض سے غافل ہیں ۔

ان کی حالت یہ ہے ۔ کہ نہ ان کے پاس دولت ہے جو کوئی بادشاہ اس کے حصول کی غرض سے ان کی طرف متوجہ ہو اور نہ ان کے قلوب میں ایمان کا نور ہے جس سے محروم کرنے کے لئے شیطان ان کی جانب مائل ہو !

ان کی دینی اور روحانی پستی کا یہ عالم ہے کہ جو شخص ان کی اصلاح کا مدعی ہے جو یہ کہتا ہے کہ مجھے اللہ نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا ہے ۔ جو یہ کہتا ہے کہ روحانیت کے اعتبار سے میں کسی ولی (مثلاً بایزید بسطامی) سے کم نہیں ہوں ۔ جو یہ کہتا ہے کہ خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے وغیرہ ذالک . . . اس کا حال یہ ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کو رحمت ایزدی قرار دیتا ہے . . . وہ لرد فرنگی (انگریز کا مرید ہے . . . انگریزی حکومت کی بقا کے لئے دست بدعا ہے . . . انگریزوں کو اولی الامر منکم کا مصداق سمجھتا ہے . . . اور اپنی جماعت کو برطانیہ کا "خود کاشتہ پودا" قرار دیتا ہے ۔

---

[۱] تفصیل کا تو موقع نہیں ہے ۔ صرف اسی بات سے ہماری اخلاقی پستی کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ کہ ہمارے علاوہ دنیا کی کوئی قوم اپنی عبادت گاہوں سے جوتیاں نہیں چراتی اور نہ کسی قوم کے مرد عورتوں کی سی وضع و قطع اختیار کرتے ہیں ۱۲

اس شخص نے مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ اگر تم انگریزوں کی غلامی پر قانع رہو گے تو دین اسلام کو بہت رونق حاصل ہو جائیگی اور زندگی کے طالب ہو تو خودی سے بیگانگی اختیار کر لو۔ یہ ہے اس تعلیم کا خلاصہ!

اس نے حکومت اغیار کو رحمت قرار دیا اور انگریز حکومت (کلیسا) کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے کرتے مر گیا۔ یہ ہے اس کی اصلاح کا مرقع

چھٹا بند:۔ اے مسلمان! اے وہ مسلمان جو ذوق وشوق یعنی عشق رسول سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ عصر حاضر نے تیرے اور تیری قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

عصر ما، ما را ز ما بیگانہ کرد

یعنی اس دور مادیت نے دجو ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بدولت مستحکم ہوا) ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ اور جب ہم اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے قلوب جمال مصطفےٰ یعنی سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھی خالی ہو گئے۔ یعنی مادیت نے ہمیں اس قدر اندھا کر دیا کہ اب ہمیں سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ اگر حضور ہماری نگاہوں میں محبوب ہوتے تو ہم حضور کے دشمنوں سے سوالات نہ کرتے (ان کے آگے دست سوال دراز نہ کرتے) ان کا لباس، ان کی وضع قطع اور ان کی زبان اختیار نہ کرتے۔ مختصر یہ کہ ان کی غلامی پر رضامند نہ ہوتے۔

لے آج سے سو سال پہلے تک ہمارے اسلاف اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ

مگر دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

مگر خدا بھلا کرے، غفران مآب آنریبل سر سید احمد خاں بہادر ستارہ ہند کا

لیکن جب ہمارے سینے عشق رسول کے سوز سے محروم ہو گئے تو آئینہ سے جوہر آئینہ بھی رخصت ہو گیا!

اس مصرع میں آئینہ کنایہ ہے مسلمان سے اور جوہر آئینہ کنایہ ہے عشق رسول سے۔

افسوس تو نے اس عصر مادیت کی روح کو نہ پہچانا تو نے یہ نہ سمجھا کہ انگریزی حکومت تجھے تہذیب و تعلیم کے پردے میں دین سے بیگانہ بنا رہی ہے اس لئے تو کالج میں داخل ہوتے ہی اپنی ہستی سے بیگانہ ہو گیا یعنی تہذیب مغرب کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔

چونکہ اس مادی تہذیب کے طلسم (پیچاک) میں گرفتار ہو کر دین اسلام سے بیگانہ ہو گیا اس لئے اس دین کی سربلندی کے لئے جد و جہد کی کوئی آرزو تیرے دل میں پیدا نہ ہو سکی۔

اے مسلمان! دین اسلام سے بیگانگی کا یہ شیوہ ترک کر دے۔ تو کیوں از خود رفتہ ہو گیا ہے؟ ذرا اپنی حالت کا جائزہ تو لے۔ ذرا ایک گھڑی کیلئے اپنے غیر سے (انگریزی تہذیب سے) قطع تعلق تو کر!

تو کب تک خوف و ہراس میں زندگی بسر کرے گا۔۔۔ اپنا مقام پہچان

(بقیہ صفحہ ۳۹۰)

اور خان بہادر مولوی بشیر الدین کا جنہوں نے علی گڑھ اور اٹاوے میں انگریزی درسگاہ قائم کر کے مسلمانوں کو ترقی کی چاٹ لگا دی چنانچہ اکبر الہ آبادی نے ان بزرگوں کی خدمت میں یوں خراج تحسین ادا کیا ہے ؎

یہ کیوں کہتے ہو اے بھائی نہ سلجھے ہے نہ مانا ہے
خدا کے فضل سے اب تو علی گڑھ ہے اٹاوا ہے

اور عزت کی زندگی بسر کرنے کا سامان کر۔

جب سربلندی کی صورت (شاخ بلند) موجود ہے تو ذلت کی زندگی (شاخ نگوں) پر کیوں قناعت کر رہا ہے۔

اے مسلمان! تو شاہین ہے اس لئے زاغ و زغن کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ مت کر بلکہ

تو بشتن را تیزی شمشیر دہ
باز خود را در کف تقدیر دہ

یعنی پہلے اپنی خودی کو پختہ کر (اور خودی کی پختگی عشق رسول پر موقوف ہے) اس کے بعد سرگرم عمل ہو جا۔ یعنی باطل کا مقابلہ کر اور نتیجہ خدا (تقدیر) پر چھوڑ دے۔

واضح ہو کہ اس شعر میں اقبال نے صحیح اسلامی زندگی کی تصویر کھینچ دی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوتا تو وہی ہے جو خدا چاہتا ہے (اسی کا نام تقدیر ہے) مگر اسلام نے ہمیں یہ تعلیم بھی تو دی ہے کہ مسلمان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی سی تدبیر ضرور کرے اور حتی المقدور جد و جہد کے بعد نتیجہ یا فیصلہ یا انجام خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دے۔ انسان مشیت ایزدی (تقدیر) کو تو بدل نہیں سکتا مگر اپنی سی جد و جہد تو بہر حال و بہر صورت کر سکتا ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ اقبال نے اس شعر میں تدبیر انسانی اور تقدیر ایزدی دونوں کو بڑی خوبی کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے اسلام نہ تو انسان کو مجبور محض قرار دیتا ہے اور نہ قادر مطلق۔ پہلی صورت میں شریعت باطل ہو جاتی ہے اور دوسری صورت میں خدا بیکار ہو جاتا ہے اسلئے قرآن نے تدبیر

اور تقدیر میں ایک خوشگوار امتزاج پیدا کر دیا ہے جس کی بدولت خدا کی خدائی بھی برقرار رہتی ہے اور انسان کی آزادی بھی برقرار رہتی ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ ایمان، جبر اور اختیار کے درمیان ہے

چنیں فرمودہ سلطان بدر است

کہ ایمان درمیان جبر و قدر است

اے مسلمان! میری بات پر یقین کر کہ تیرے اندر ایک سیل بے پناہ پوشیدہ ہے یہ سیل کنایہ ہے عشق رسول سے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تو عاشق رسول یعنی صحیح معنی میں مسلمان بن جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی حکومت تیرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

لیکن اس نکتہ کو بھی یاد رکھ کہ سیلاب کا وقار اس کی ناآسودگی یعنی مسلسل حرکت (سیلان) پر موقوف ہے۔ جو سیلاب کسی جگہ یا کسی وقت رک جائے وہ اپنی ہستی اسی وقت اور اسی جگہ کھو دیتا ہے پھر اس پر سیلاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا یعنی وہ سیلاب ہی نہیں رہتا بلکہ تالاب (ساکن پانی) بن جاتا ہے اور سب جانتے ہیں۔ کہ سیلاب اور تالاب میں آسمان و زمین کا فرق ہے

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اسی طرح مسلمان نام ہے مرد مجاہد کا جو ہر وقت اور ہر جگہ جد و جہد میں مصروف رہتا ہے اگر وہ جہاد ترک کر دے تو پھر اس پر مسلمان یا مومن مجاہد کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یعنی وہ مسلمان ہی نہیں رہتا کافر بن جاتا ہے[1] اسی

---

[1] یہی وجہ ہے کہ فتح علی خاں (سلطان ٹیپو شہید) تادم آخر جہاد کرتا رہا اور اس مرد مومن نے نظام علی خاں (نظام حیدرآباد) کی نصیحت قبول کرنے کے بجائے سپاہی کی موت قبول کی نتیجہ یہ نکلا کہ آخر الذکر ۱۷۹۹ء میں ہمیشہ کیلئے مر گیا اور سلطان کے نام کی نوبت ابھی تک دکن میں بج رہی ہے اور ہمیشہ بجتی رہے گی۔ ۱۲

نکتہ کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

ع۔ یک نفس آسودنش نابودن است

یعنی جس طرح سیلاب ساکن ہو جائے تو نابود ہو جائے گا اسی طرح اگر مسلمان ساکن (جہاد) سے غافل ہو جائے تو مسلمان کی حیثیت سے اس کا وجود ختم ہو جائے گا یہ دوسری بات ہے کہ وہ پاکستانی یا ایرانی یا مصری یا ترکی کی حیثیت سے زندہ رہے اور امریکن امداد کے سہارے زندگی کے دن پورے کرتا رہے۔

آخر میں یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! شاید میرے بعد صدیوں تک تو "مرد فقیر" پیدا نہ ہو جو تمہیں اس دلنشین انداز میں تمہارے دین کے حقائق و معارف سے آگاہ کر سکے۔

یہ سچ ہے کہ نہ میں ملا ہوں نہ فقیہہ اور نہ میں نے سلوک طے کیا ہے یہ بھی سچ ہے کہ میں عالم بے عمل (تیز بین وسست گام) ہوں۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ میرے سینہ میں ایسا دل ہے جو ہر وقت قوم کے غم میں مضطرب رہتا ہے یعنی میں ہر وقت اپنی قوم کے غم میں گھلتا رہتا ہوں۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

اس لئے عشق رسول کی آگ سے جو میرے سینہ میں بھڑک رہی ہے اپنا حصہ لے لو۔

ع۔ بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

فصل ہشتم

مردِ حُر

تمہید :۔ اگرچہ اقبال نے گذشتہ فصل میں زیرعنوان فقر، صاحب فقر کی صفات بھی واضح کر دی ہیں مگر اس کے مقام کی اہمیت اس امر کی متقاضی ہوئی کہ وہ اس کے لئے بھی ایک مستقل باب باندھیں چنانچہ اس فصل میں انہوں نے بعنوان مردِ حر اس کے مقام کی مزید توضیح کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض مضامین کی تکرار ہو گئی ہے مثلاً گذشتہ فصل میں انہوں نے یہ لکھا ہے۔

با سلاطین در فتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر

اس فصل میں انہوں نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے۔

بادشاہان در قباہائے حریر
زرد رو از سہم آں عریاں فقیر

واضح ہو کہ اقبال کی رائے میں اسلامی تعلیمات کی غایت یہ ہے کہ انسان میں شان فقر پیدا ہو جائے یہ مقام، زندگی کی معراج ہے یعنی اس مقام پر پہنچ کر انسان میں صفات ایزدی منعکس ہو جاتی ہیں اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں مسلمانوں کو یہی پیغام دیا ہے کہ اپنے اندر شان فقر پیدا کرو۔ اور چونکہ اسلامی تصوف نام ہے اس پروگرام کا جس پر گامزن ہو کر

انسان میں یہ شان بالفعل پیدا ہو جاتی ہے اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ
دراصل اقبال نہ شاعر ہیں نہ فلسفی نہ متکلم بلکہ تصوف کے علمبردار ہیں
چنانچہ ذیل کی رباعی میں انہوں نے اپنی اس بنیادی حیثیت کو خود واضح
کر دیا ہے۔

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم حدیث عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکان امت ترا با شوخی رندانہ گفتم

مطلب ان کا یہ ہے کہ میں نے اپنی تصانیف میں شاعری نہیں کی ہے بلکہ
[illegible] عشق میری فکر کا نتیجہ
نہیں ہے بلکہ جو کچھ میں نے بزرگان دین (پاکان امت) سے سنا ہے اسی
کو شعر کے دلکش لباس میں (با شوخی رندانہ) ان کے سامنے پیش کر دیا ہے
بالفاظ دگر جو کچھ انہوں نے کشف المحجوب، عوارف المعارف، فتوح
الغیب، مرصاد العباد، قوت القلوب، لطائف اشرفی، لوائح جامی، کشکول
فوائد الفواد اور سب سے بڑھ کر مثنوی میں پڑھا۔ اسی کو اپنے الفاظ میں نظم کر دیا ہے۔
اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ ایسا کرنے سے یہ شرح اپنی حدود سے متجاوز
ہو جائے گی تو میں اقبال کی ہر تعلیم کا ماخذ اور منبع مذکورہ بالا کتابوں سے
نکال کر دکھا دیتا۔ اس لئے میں صرف ایک مثال دینے پر اکتفا کرتا ہوں
اقبال نے جاوید نامہ میں لکھا ہے:۔

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گرد خود گردندہ چوں پرکار باش

یہ شعر سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کے
اس ارشاد سے ماخوذ ہے۔

بحث در تزکیہ افتاد، بر لفظ مبارک راند کہ کمال (تزکیہ) از چہار چیز پیدا می شود اعنی قِلّةُ الکلام و قلّة الصحبة مع الانام و قلّة المنام۔

واضح ہو کہ اقبال نے صاحب فقر کو مختلف خطابات سے یاد کیا ہے مثلاً مرد حق، مرد مومن، قلندر، فقیر، درویش خدامست، صاحب دل، اور مرد حر۔ اس فصل میں انہوں نے مرد حر کی اصطلاح استعمال کی ہے اور مرد حر سے ان کی مراد وہ شخص ہے جس نے غیر اللہ کے طلسم سے آزادی حاصل کر لی ہو۔ اور میں بیان کر چکا ہوں کہ غیر اللہ کی غلامی سے وہی شخص رہائی حاصل کر سکتا ہے جو کلمہ طیبہ

لا الٰہ الا اللہ

کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو گیا ہو اس کا حقیقی مفہوم یہ ہے:۔

(۱) اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی الٰہ نہیں ہے

(۲) الٰہ کہتے ہیں اسے جو واجب الوجود ہو یعنی از خود موجود ہو۔

(۳) یعنی اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی مستی از خود موجود نہیں ہے

(۴) یعنی کسی کا وجود ذاتی، اصلی اور حقیقی نہیں ہے۔

(۵) یعنی اللہ کے سوا سب کا وجود مستعار، ظلی اور مجازی ہے۔

(۶) یعنی جس طرح کوئی شخص ذات و صفات میں اللہ کا شریک نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص وجود میں بھی اس کا شریک نہیں ہے

(۷) یعنی لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم کی رو سے جس طرح شریک فی الذات محال ہے اسی طرح شریک فی الوجود بھی محال ہے۔

(۸) یعنی اگر کسی کو شریک فی الوجود سمجھا جائے تو وہ اللہ یا دو خدا

واجب الوجود یعنی از خود موجود ثابت ہو جائیں گے۔

(۹) اور لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم صاف لفظوں میں دوسری کسی ہستی کو واجب الوجود یعنی از خود موجود تسلیم کرنے سے مانع ہے۔

(۱۰) اس لئے کوئی ہستی ذات کے علاوہ وجود میں بھی اللہ کی شریک نہیں ہو سکتی۔ یہی لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی مفہوم ہے جسے شیخ اکبر اور مجدد الف ثانی نے لا موجود الا اللہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اب پڑھو اقبال کے اس شعر کو:۔ تا نہ رمز لا الٰہ آید بدست

بندہ غیر اللہ را نتواں شکست

یعنی جب تک انسان لا الٰہ الا اللہ کے رمز (حقیقی مفہوم) سے آگاہ نہ ہو۔ اس وقت تک وہ غیر اللہ کی قید سے نہیں نکل سکتا بالفاظ دگر جب تک ایک شخص پر یہ حقیقت منکشف نہ ہو کہ اللہ کے سوا اس ساری کائنات میں کوئی ہستی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے اسوقت تک وہ غیر اللہ کے طلسم سے رہائی نہیں پا سکتا۔

واضح ہو کہ جس بات کو میں نے کلمہ طیبہ سے ثابت کیا ہے موجودہ سائنس سے بھی اسی بات کا ثبوت مل رہا ہے اسکی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) سوال یہ ہے کہ مادہ کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں سائنسدانوں نے مادہ کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ مادہ مرکب ہے۔ ذرات (MOLECULES) سے اور یہ مرکب ہیں ATOMS یعنی سالمات سے۔

جب سالمہ کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان سے شعاعیں نکلتی ہیں جن کو برق پارے ELECTRONS کہتے ہیں یہ برق پارے مادی

نہیں ہیں ۔۔

ان پر از روئے ماہیت مادہ یا جسم SUBSTANCE کا اطلاق نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ برقی پارہ دراصل بجلی کا چارج ہے اس سے ثابت ہوا کہ مادہ دراصل کوئی مادہ شئی نہیں ہے ۔

لیکن ہمارا سوال بدستور قائم ہے یعنی یہ کہ برقی پارہ یا برق کیا ہے ؟ سائنسدان اس کے جواب میں کہتا ہے کہ من نمی دانم یعنی میں برق کی ماہیت سے آگاہ نہیں ہوں ۱ے

ہم اس سے کہتے ہیں کہ کچھ تو بتاؤ ۔ تو وہ کہتا ہے کہ میرا قیاس یہ ہے کہ برق کی اصل توانائی ENERGY ہے ۔

یعنی جسے ہم مادہ کہتے ہیں وہ دراصل توانائی ہے جو ایک غیر مادی شئی ہے یعنی سائنس نے مادہ کے مستقل وجود کو باطل کر دیا ۔

برٹرینڈ رسل (عصر حاضر کے مشہور فلسفی اور سائنسدان) کا قیاس یہ ہے ۔ کہ کائنات کی حقیقت یا تو برقی پارے ہیں یا سالمات فعل یا ایتھر ۔ اور یہ تینوں غیر مادی اشیا ہیں ۔

کوانٹم نظریہ کی رو سے مادہ اور توانائی ایک ہی شئی کے دو مختلف نام ہیں فی الجملہ مادہ تو باطل ہو گیا اس کی جگہ توانائی، اصل کائنات قرار پائی ۔ اب سوال یہ ہے کہ توانائی کیا ہے ؟ اور ہم اس لفظ سے کیا سمجھتے ہیں ؟

ہر عقلمند آدمی اس سوال کا یہی جواب دیگا ۔ کہ توانائی کسی توانا ہستی کی صفت ہے یعنی کوئی توانا (قادر مطلق) ہستی اپنی توانائی کا مظاہرہ کر رہی ہے

۱ے ہر ایک بات پہ کہتا تھا من نمی دانم
یہ بات سچ ہے کہ اکبر بڑا ہی عالم تھا

اس سے ثابت ہوا کہ کائنات اُس توانا ہستی کی توانائی کی مظہر یا جلوہ گاہ ہے توانائی کو عرفِ عام میں صفت کہتے ہیں یعنی اس کائنات کی حقیقت اس ہستی کی صفات کی تجلیات ہیں اور جو لوگ آشنائے راز ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ تجلیات پیہم رونما ہوتی رہتی ہیں اور اسی رونمائی کا دوسرا نام یہ کائنات ہے

جو بات سائنس دانوں پر آج بیسویں صدی میں منکشف ہوتی ہے شیخ اکبر نے اسی حقیقت کو ساتویں صدی ہجری میں واضح کر دیا تھا۔ کہ حقائق ممکنات دراصل اسماء و صفات کی تجلیات ہیں۔

شیخ اکبر کی تقلید میں اقبال نے بھی اسی صداقت کا اعلان کیا ہے۔ انداز بیان مختلف ہے مگر مفہوم ایک ہی ہے۔

اقبال کا مسلک یہ ہے کہ مادہ اور روح میں اصلیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے جو کچھ فرق نظر آتا ہے وہ صرف کیفیت کا ہے۔ یہ کائنات سالمات مادی کی غیر شعوری حرکت سے لے کر فکر انسانی کی باشعور حرکت تک کچھ نہیں ہے مگر انائے کبیر (حق تعالیٰ) کا جلوہ ذات ہے اور اسی صداقت کو صوفیائے کرام

لا موجود الا اللہ

سے تعبیر کرتے ہیں۔

باز آمدم بر سر مطلب: جب مسلمان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات میں کوئی ہستی از خود موجود نہیں ہے تمام انسان اپنے وجود اپنی ہستی اپنی ذات اپنی صفات اور اپنی زندگی کے تسلسل کے لئے اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں تو وہ سب انسانوں سے قطع نظر کر لیتا ہے

نتیجہ یہ ہوتا ہے جب وہ تکبیر کائنات (کائنات کی حقیقت) سے آگاہ

ہو جاتا ہے تو خود اس کی ضمیر کی گہرائیوں سے یہ صدا بلند ہوتی ہے بلے

لا موجود الا اللہ

اس مقام پر پہنچ کر یہ صداقت اس کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ کہ جب ہر شخص اپنے وجود اپنی ذات اور اپنی صفات (مثلاً قدرت، علم، ارادہ) کے لئے اللہ کا محتاج ہے تو پھر کسی میں کیا طاقت ہے کہ مجھے کچھ دے سکے یا کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکے

جہاں یہ حقیقت مومن پر منکشف ہوئی اسی وقت وہ غیر اللہ کے طلسم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یعنی مردِ حر بن جاتا ہے

ایک ضروری بات کی وضاحت اور کر دوں تو اس تمہید کو ختم کروں وہ یہ ہے کہ اقبال نے مردِ حر کی جس قدر صفات بیان کی ہیں وہ دنیائے اسلام میں نہ تو کسی منطقی میں پائی جاتی ہیں نہ متکلم میں نہ فلسفی میں نہ مورخ میں نہ ادیب میں نہ فقیہہ نکتہ دان میں نہ واعظ رنگیں بیان میں نہ خطیب ما میں نہ مدرس میں . . . . .

اگر پائی جاتی ہیں تو ان بزرگوں میں جن کے نام سے اس زمانہ کے مدعیان اصلاح میں بھی ہو جاتے ہیں جن کے مدرسے سے ان حضرات کا سرخیر

لے ازضمیر کائنات آگاہ اوست

تیغ لا موجود الا اللہ اوست

لے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ (۱۸ – ۳۹)

جو اللہ چاہتا ہے وہی ظہور میں آتا ہے وجہ یہ ہے کہ جب تک اللہ کسی کو قوت عطا نہ کرے کسی کو قوت نصیب ہی نہیں ہو سکتی (کیونکہ کوئی شخص از خود تو موجود ہی نہیں ہے)

بالکل خالی ہے یعنی خواجگان چشت یا خواجگان نقشبندیہ یا بزرگان سلسلہ قادریہ یا سہروردیہ مثلاً حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیری؟ یا قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی یا سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء یا شیخ شیوخ عالم حضرت بابا فرید گنج شکر اجودھنی یا شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (کثر اللہ تعالیٰ امثالہم).

اس بات سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اقبال نے ہمیں حکماء فلاسفہ، متکلمین اور واعظین کی پیروی کے بجائے اپنی بزرگوں (مردان حر) کی اتباع کا مشورہ دیا ہے چنانچہ اس فصل کی شرح میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جائے گی اب ہم اس فصل کی شرح ہدیہ ناظرین کرتے ہیں

پہلی صفت:۔ مرد حر باطل کے مقابلہ میں محکم ہوتا ہے یعنی اس کے پائے ثبات کو کسی حالت میں بھی لغزش نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کے پیش نظر رہتا ہے۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ (۲۰ — ۶۷)

ہم نے موسیٰ سے کہا مت ڈر۔ بیشک تو ہی (ان باطل پرستوں پر) غالب آئیگا اس سے معلوم ہوا کہ مرد حر میں انبیاء کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم (جو نعمت فقر سے محروم ہیں) میدان جنگ میں مضطرب (مرتجیب) ہو جاتے ہیں مگر وہ ثابت قدم (سربکف) رہتا ہے۔

دوسری صفت:۔ مرد حر چونکہ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم سے آگاہ ہوتا ہے اس لئے وہ کسی بادشاہ کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتا۔ (یعنی اس میں شان بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے) بلکہ بادشاہ اپنی مجلس سے اس کے آستانے پر حاضر ہوتے ہیں مثلاً حضرت میاں میر کبھی شاہجہان کے دربار

میں نہیں گئے. ہاں شاہجہان ان کے دربار میں حاضر ہوا تھا.

تیسری صفت :- وہ باطل کے مقابلہ میں ایسی ثابت قدمی دکھاتا ہے کہ جو لوگ اس کے ساتھ ہوتے ہیں ان میں بھی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے.

چوتھی صفت :- جب اسے راہ خدا میں شہادت نصیب ہوتی ہے تو مرنے کے بعد اسے وہ زندگی حاصل ہو جاتی ہے جو دنیاوی زندگی سے پائندہ تر ہوتی ہے.

یہ مضمون قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے :-

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ ط بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ ٥ (۲ ۔ ۱۵۴)

اور جو لوگ راہ خدا میں مارے جائیں ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے (کہ راہ خدا میں شہید ہو کر انسان حقیقی زندگی حاصل کر لیتا ہے)

مرد حر جب میدان جنگ میں اللہ اکبر کہتا ہے تو اس کا یہ نعرہ حرف و صوت سے بالاتر ہوتا ہے یعنی وہ شخص زبان سے یہ لفظ نہیں کہتا بلکہ دل سے کہتا ہے.

اس کے بعد کہتے ہیں کہ جو شخص (راہ خدا میں مشکلات (سنگ راہ) کو آسان (زجاج) سمجھتا ہے وہ درویش، بادشاہوں سے اپنی عظمت کا اعتراف کرا لیتا ہے

اے مخاطب! اسی کی تلقین (صہبا) کی بدولت تیرے دل میں ہمت (گرمی) پیدا ہو سکتی ہے. اور تیری زندگی (جوئے تو) اس کی شخصیت (دریائے او) کی تاثیر سے پایۂ تکمیل کو پہونچ سکتی ہے.

پانچویں صفت :- اگرچہ وہ بے سروسامان ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود سلاطین عالم اس کی ہیبت سے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں صرف ایک مثال

درج کرتا ہوں۔

۵۵ سلطان محمود بیگڑا والئی گجرات اس شان و شوکت کا بادشاہ تھا کہ پچپن سال تک حکومت کی۔ مگر کسی معرکہ میں شکست نہیں کھائی جونا گڑھ اور پاواگڑھ جیسے ناقابل تسخیر قلعے فتح کیے۔ اس کی سلطنت مغربی ساحل سے لیکر وسط ہند تک اور اجمیر سے لیکر خاندیش تک وسیع تھی۔ سارے ہندوستان میں کوئی بادشاہ اس کا مد مقابل نہیں تھا۔ لیکن جب وہ حضرت شاہ عالم (نبیرہ مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری) کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو ان کی ہیبت سے اس پر لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔

چھٹی صفت:- ہم لوگ دین کے اسرار و رموز صرف کتابوں میں پڑھ لیتے ہیں لیکن وہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم تو صرف کتابوں میں پڑھ کر یا دوسروں سے سن کر یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ خدا ہے اور وہ اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے مگر وہ دراصل خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتا ہے۔ گویا وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے چونکہ اسے خدا سے براہ راست تعلق پیدا ہو جاتا ہے اس لئے

یک اندرون خانہ ما بیرون در

ظاہر ہے کہ گھر کا حال اسی کو معلوم ہوتا ہے جو گھر کے اندر جا سکے جو شخص دروازے کے باہر بیٹھا ہوا ہے اسے اندر کا حال کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے خدا کی ہستی پر کامل یقین ہوتا ہے۔

اس کے بعد اقبال عام مسلمانوں کا اس کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں کہ ہم تو کافروں سے دوستی کرتے ہیں اور ان کو خوش کرنے کے لئے اپنا ایمان بھی بیچ دیتے ہیں لیکن وہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق ہوتا ہے یعنی کفر اور

کفار دونوں سے بیزار بلکہ برسرِ پیکار ہوتا ہے۔

ہم بادشاہوں کی غلامی کرتے ہیں اور دولتِ ایمان سے محروم ہوتے ہیں مگر وہ مستِ الست ہوتا ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں غرق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا دھواں (جسم) ہماری آگ (روح) سے زیادہ منور اور روشن ہوتا ہے۔

ہم کبھی نصاریٰ سے طالبِ امداد ہوتے ہیں۔ اور کبھی بت پرستوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ لیکن وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھتا۔

مختصر یہ کہ ہم سب انگریزوں کے غلام ہیں مگر .. [illegible] کے سوا کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔ اور چونکہ وہ حقیقی معنی میں مومن ہوتا ہے اس لئے

او نہ گنجد در جہانِ رنگ و بو

یعنی وہ دنیا میں کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتا۔ کسی انسان کو خاطر میں نہیں لاتا بالفاظ دگر وہ ساری دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

ہم جب تک زندہ رہتے ہیں روزی کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی حالت میں ہزاروں حسرتیں دل میں لئے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن اس کی نظر میں موت زندگی کے خاتمہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مقاماتِ حیات میں سے ایک مقام یا منزل ہے۔ چونکہ ہم دنیا کے بندے ہیں اس لئے ہمارے حق میں موت انتہائی تلخ (ناگوار) ہوتی ہے۔ مگر وہ موت کو خود لبیک کہتا ہے اس کے لئے موت نہایت خوشگوار ہوتی ہے۔

اللہ کے بندے ہماری صحبت سے متنفر ہوتے ہیں بلکہ مضمحل ہو جاتے ہیں لیکن اس کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا پرست (رگِل) بھی حق پرست (صاحب دل) ہو جاتا ہے۔

ہماری زندگی محض قیاسات (ظن وتخمین) پر موقوف ہوتی ہے یعنی ہم صرف منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں مگر وہ باتیں کرنیکے بجائے عمل کرتا ہے۔

ہماری زندگی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں بسر ہوتی ہے مگر وہ اپنی زندگی باطل کا مقابلہ کرنے میں بسر کرتا ہے۔

ہم ضعیف (پرکاہ) اور ناتواں ہیں مگر وہ اپنی ضرب سے بڑے بڑے پہاڑوں سے پانی کی نہریں جاری کر دیتا ہے۔

اس مصرع میں تلمیح ہے حضرت موسےٰ کی اس ضرب کی طرف جسکی بدولت پتھر سے بارہ چشمے جاری ہو گئے تھے۔

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ط (۲ — ۶)

(ہم نے موسےٰ سے کہا اپنا عصا پتھر پر مارو) پس پھوٹ پڑے اس سے بارہ چشمے ۱۲

موازنہ کے بعد اب اقبال ہم سے یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تم دنیا میں سربلند ہونا چاہتے ہو تو سگانِ دنیا کی صحبت ترک کر کے مردانِ حر کی صحبت اختیار کرو۔ یہ نصیحت انہوں نے اس لئے کی ہے کہ انسان میں ایمان و یقین کا رنگ کتابوں، لیکچروں اور خطبوں سے پیدا نہیں ہو سکتا دنیائے اسلام میں جس قدر مردانِ حر گزرے ہیں سب نے مردانِ حر کی صحبت اٹھائی تھی۔ محض کتابوں سے کوئی شخص مردِ حر نہیں بن سکتا۔

فی الجملہ اقبال مسلمان سے خطاب کرتے ہیں:۔

(۱) اے مسلمان! اگر تو دین اور دنیا میں سربلندی اور عزت کا طالب ہے

تو سگان دنیا کی صحبت سے دور بھاگ ۔ جس طرح تیر کمان سے بھاگتا ہے اور کسی مرد حر سے پیمان محبت استوار کر لے ۔

ع خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

عجیب و غریب مصرع ہے کہتے ہیں کہ تو اس کی خاطر اپنا گھر ویران کر دے اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تیرا گھر آباد ہو جائیگا ۔ اس مصرع کی دلکشی اس کے اسلوب بیان میں مضمر ہے جسے عرف عام میں مناقضہ (PARADOX) کہتے ہیں ۔ یعنی شاعر اپنی بات کو اس انداز سے کہتا ہے ۔ جو بظاہر مہمل یا خلاف عقل معلوم ہوتی ہے ۔

مطلب اس مصرع بلیغ کا یہ ہے ۔ کہ اے مخاطب! تو اپنی زندگی کو اس کے قدموں پر نثار کر دے ... اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے تابع کر دے شاعرانہ انداز میں یوں سمجھ لو کہ اپنے آپ کو اس کی محبت میں برباد کر دے نتیجہ یہ نکلے گا کہ تجھے ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی ۔

اگر مثال درکار ہو تو صدیق اکبرؓ کا نمونہ تیرے لئے کافی ہے انہوں نے حضورؐ کے ارشاد پر اپنا سارا اثاث البیت حضورؐ کے قدموں پر نثار کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا گھر ہمیشہ کے لئے آباد ہو گیا ۔ آج ان کا گھر ہر مومن کے دل میں بنا ہوا ہے اور قیامت تک اسی طرح بنا رہے گا ۔

(۲) اے مسلمان! تو شومئی تقدیر (جور فلک) کا شکوہ مت کر ۔ کسی اللہ والے (زندہ مرد) کی صحبت اختیار کر لے ۔ تاکہ تجھے بھی زندگی نصیب ہو جائے ۔

صحبت از علم کتابی خوشتر است

صحبت مردان حُر آدم گر است

(۳) مطلب یہ ہے کہ انسان خواہ ساری عمر کتابیں پڑھتا رہے مگر اپنی حقیقت

سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ انسان صرف مردانِ حر کی صحبت میں بیٹھ کر انسان بنتا ہے۔ یعنی صرف ان کی صحبت کی تاثیر سے اس پر اپنی حقیقت واضح ہو سکتی ہے اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں تو خدا کا نائب یا خلیفہ ہوں مجھ میں اس کی صفات کا عکس جلوہ گر ہے میں تو اشرف المخلوقات ہوں [1]

واضح ہو کہ اقبال نے یہ شعر مرشد رومیؒ اور دیگر بزرگانِ دین و پاکانِ امت کی تعلیمات سے متاثر ہو کر لکھا ہے تمام اولیائے امت نے صحبت مرشد کی ضرورت اور اہمیت واضح کی ہے کیونکہ کتابوں سے دماغ تو منور ہو سکتا ہے مگر دل کا چراغ صرف اللہ والوں کی صحبت سے جل سکتا ہے۔

جلا دیتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس اُن کی

الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں (اقبال)

ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کو اعلیٰ سے اعلیٰ ولی پر جو فضیلت حاصل ہے۔ اس کا اصلی سبب یہ شرفِ صحبت ہی تو ہے۔ مہاجرین اور انصار (صحابہ کرام) کے مجد و شرف کا باعث کیا ہے۔ محض یہ امر کہ انہوں نے سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی تھی۔

یہ سچ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے نہ مراقبے کئے نہ چلے نہ ہر روز قرآن ختم

---

[1] جو لوگ بزرگانِ دین کی صحبت سے محروم رہتے ہیں وہ ساری عمر اپنی حقیقت سے بیگانہ رہتے ہیں وہ قرآن اور حدیث میں بیشک یہ پڑھتے ہیں کہ آدم خلیفۃ اللہ ہے۔ مگر اس کا مفہوم ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہوتی جس سے اہلِ دنیا کو یہ معلوم ہو سکے کہ یہ حضرات اللہ کے خلیفہ ہیں۔ ان کا اللہ سے کوئی تعلق ہے جس طرح ایک عامی دنیا طلبی میں گرفتار رہتا ہے اسی طرح یہ علماء بھی دنیا کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں ۱۲

کیا، نہ ہر رات ایک ہزار نوافل پڑھے نہ ایک لاکھ مرتبہ ذکر خفی کیا اور نہ دو لاکھ بار درود پڑھا۔ وغیرہ ذالک۔ لیکن آنجناب کا مرتبہ اور مقام تمام اولیائے امت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ محض یہی تو ہے کہ آنجناب نے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیا اثر سے فیض حاصل کیا تھا۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھلائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آداب فرزندی (اقبال)

ہم بخوف طوالت صرف مثنوی سے چند اشعار لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں:۔

یک زمانے صحبت با اولیاء — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگ صخرہ و مرمر بوی — چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی (دفتر اول)

اے مخاطب! مرد حر معرفت الٰہی کا دریا ہے۔ پس اگر تو معرفت (پانی) کا طالب ہے۔ تو پرنالے (علمائے ظاہری) کے بجائے دریا (اولیاء) سے پانی (معرفت) حاصل کر۔

مرد حر کی صفت یہ ہے کہ بزم (روز صلح) میں وہ اپنی پاکیزہ اور معارف سے لبریز گفتگو کی بدولت، تیرے دل کو اس قدر شگفتہ کر دے گا جس طرح باد بہار چمن کو شگفتہ کر دیتی ہے۔

اور رزم (روز کیں) میں وہ اپنی تلوار کی مدد سے اپنی شہادت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اور وہ ایسا اس لئے کرتا ہے کہ وہ اپنی تقدیر سے آگاہ ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مومن کی تقدیر ہی یہ ہے کہ وہ اپنی جان راہ خدا میں قربان کرکے، ابدی زندگی حاصل کرے۔

آخری تین اشعار میں اقبال نے مکرر صحبت مرشد اختیار کرنے کی تلقین کی ہے کہتے ہیں:۔

اے مخاطب! میں تیرے قربان جاؤں (سرت می گردم)، تو ہم طالبان دنیا سے اس طرح دور بھاگ جس طرح کڑی کمان سے تیر۔ اور ان (مردحق) کا دامن مضبوطی سے تھام لے بلکہ نہایت درجہ عقیدت کے ساتھ تھام! کیوں؟ اسلئے کہ

می نروید تخم دل از آب و گل
بے نگاہ از خداوندان دل

جب تک صاحبان دل کی نگاہ تجھ پر نہیں پڑے گی تیرا دل زندہ نہیں ہوسکتا یہ شعر مثنوی کے ان اشعار سے ماخوذ ہے:۔

آنکہ او ہر خار را گلشن کند ۔۔۔ آنکہ او ہر کور را روشن کند
تا رہی از فتنۂ آخر زماں ۔۔۔ دامن او گیر زد تر بے گماں

آخری شعر میں اقبال نے اس مبحث کی روح کھینچ کر رکھ دی ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو نے کسی اللہ والے (مردحق) کی صحبت نہ اٹھائی اور یونہی پہلے کسی ہفتہ وار اخبار، بعد ازاں کسی ماہوار رسالہ کی ایڈیٹری کرتے کرتے کسی اسلامی جماعت کا امیر بن گیا۔ اور خود کسی کے ہاتھ پر بیعت کئے بغیر دوسروں سے بیعت لینے لگا۔ تو یاد رکھ کہ اس دنیا میں تیری قیمت اتنی بھی نہ ہوگی جتنی گھاس کے ایک تنکے کی ہوتی ہے اقبال کا یہ شعر کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے دیکھ لیجئے۔

حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیری، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر اجودھنی، حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی دہلوی، حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی، حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز (والی گلبرگہ دکن) حضرت مخدوم علی احمد صابر

گلبرگہ اور حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی نے اپنے آپ کو کسی کے دامن سے وابستہ کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بھی ان بزرگوں کا نام کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں محبت اور عقیدت کے جذبات موجزن کر دیتا ہے۔ اور آج بھی ان کا آستانہ مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنے آپ کو کسی کے دامن سے وابستہ نہیں کیا اور محض اپنی تحریر اور تقریر کے بل بوتے پر مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے تحریکیں جاری کیں اور پوسٹر شائع کئے ان میں سے کوئی بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

خلاصہ کلام اینکہ انسانوں کے قلوب میں عزت و احترام کے جذبات صرف انہی مقدس حضرات کے لئے موجزن ہوتے ہیں جنہوں نے کسی مرد حُر کی صحبت میں بیٹھ کر پہلے اپنی اصلاح اور اپنا تزکیہ نفس کر لیا ہو۔ اس کے بعد مسلمانوں کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا ہو۔ یہ وہ کلیہ ہے جس میں تیرہ سو سال سے کوئی استثنا ظہور پذیر نہیں ہوا ہے وجہ یہ ہے کہ چراغ تو چراغ ہی سے جل سکتا ہے اور شمع کسی شمع ہی سے روشن ہو سکتی ہے۔

فافہم و تدبّر

فصل نہم

در اسرار شریعت

تمہید :۔ یہ فصل اس کتاب کی جان ہے اس لئے بہت غور سے مطالعہ کے لائق ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شریعت (دین)، طریقت (تصوف) اور حکمت (فلسفہ) تینوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس فصل کی اہمیت ذہن نشین کرنے کے لئے ہر بند کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

پہلا بند :۔ چونکہ معیشت کا بنیادی مسئلہ دولت کا حصول اور حصول کی غایت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اقبال نے اسی نکتہ کو واضح کیا ہے۔ کہ اسلام میں کسب دولت مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مقصود بالعرض ہے۔

جو شخص اس نکتہ کو مد نظر نہیں رکھتا یعنی جو شخص دولت کو مقصود بالذات سمجھتا ہے وہ دولت کا غلام یعنی سرمایہ دار ہے اور اس کا وجود قوم کے حق میں سراسر موجب فساد ہے۔

ان حقائق کی تصریح کے بعد اقبال نے سرمایہ دار کی مذموم ذہنیت واضح کی ہے اور آخر میں بتایا ہے۔ کہ وہی منعم لائق تحسین ہے جو درویش صفت ہو۔

دوسرا بند:۔ دوسرے بند میں انہوں نے اکل حلال کی قدر و قیمت واضح کی ہے۔ اور ہمیں متنبہ کیا ہے۔ کہ جو قوم ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرتی ہے اس کی زندگی اس کے حق میں وبال بن جاتی ہے یعنی وہ اطمینان قلب سے محروم ہو جاتی ہے۔

اپنے دعوی کے ثبوت میں انہوں نے یورپین اقوام کی مثال دی ہے اور بتایا ہے کہ چونکہ ان کا زاویہ نگاہ ملحدانہ اور مادہ پرستانہ ہے (تہذیب مغرب مادیت پر مبنی ہے) اس لئے ان کی تہذیب دراصل آدم دری ہے۔

آخر میں ہمیں تلقین کی ہے کہ اس ملحدانہ نظام کو تہ و بالا کر دیں کیونکہ جب تک ایسا نہ ہوگا۔ دنیا میں دانش و تہذیب و دین کا قیام نا ممکن ہے۔

تیسرا بند:۔ یہ بند اس فصل کی جان ہے (جس طرح یہ فصل اس کتاب کی جان ہے) اس بند میں اقبال نے پہلے یہ بتایا ہے۔ کہ شریعت (دین) ہی وہ شمع ہے۔ جس کی روشنی میں انسان خیر و شر میں امتیاز کر سکتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے وہ اپنے نفع اور نقصان سے آگاہ ہو سکتا ہے

اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ شریعت کا منبع کہاں ہے؟ یہ بحث، حکمت قرآنی کے ایک غامض ترین پہلو پر مشتمل ہے۔ اور ہماری انتہائی توجہ کی مستحق ہے۔ چنانچہ میں اسے آئندہ اوراق میں وضاحت کے ساتھ لکھوں گا۔ تاکہ فکر اقبال کی عظمت ناظرین کے دلوں میں بخوبی جاگزیں ہو سکے اور انہیں یہ معلوم ہو سکے کہ میں کیوں اس کتاب کو اقبال کی تصانیف میں "دل" کا درجہ دیتا ہوں۔

چوتھا بند:۔ اس بند میں اقبال نے پہلے یہ بتایا ہے کہ طریقت کیا ہے۔ اور شریعت سے اس کا رابطہ کیا ہے۔ اس ضمن میں

انہوں نے فلسفہ مذہب کے بعض حقائق واضح کئے ہیں۔ اور جبر و اختیار کی گتھی کو بڑی دلکشی کے ساتھ سلجھایا ہے یہ بحث بھی بہت غور طلب ہے

اس کے بعد انہوں نے ہمیں تلقین کی ہے کہ ہم پوری قوت کے ساتھ دنیا میں شریعت اسلامیہ کی تبلیغ کریں۔ کیونکہ اسی شریعت کی بدولت دنیا میں وہ معاشی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبیں این است و بس

اس وقت دنیا میں بہت سے معاشی نظام مروج ہیں مگر ہر نظام میں انسان دوسروں کا محتاج ہے یہ خصوصیت صرف اسلامی نظام معیشت ہی کو حاصل ہے۔ کہ اس میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہو سکتا، لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس نظام کو دنیا میں قائم کریں تاکہ ایک طرف دنیا میں امن و امان قائم ہو جائے دوسری طرف اسلام کی فضیلت تمام ادیان پر واضح ہو جائے۔

آخر میں انہوں نے مسلمانوں کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے اور ہمیں یہ مشورہ دیا ہے کہ:۔

ع از عمل بنما کہ حق دار دست تست

چونکہ اس فصل کا مرکزی تصور یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام دنیا کے تمام معاشی نظاموں پر تفوق رکھتا ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس فصل کی شرح سے پہلے اسلامی نظام معیشت کی خصوصیات اور اس کی برتری کے پہلوؤں کو واضح کردوں تاکہ ناظرین کی نگاہ میں اقبال کا دعویٰ ثابت ہو سکے۔

اسلامی نظامِ معیشت

تمہید:۔ واضح ہو کہ دنیا میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے عقاید اور عبادات کے علاوہ انسانوں کو ایک مکمل معاشی نظام بھی عطا کیا ہے۔ اور چونکہ اس معاشی نظام کو نافذ کرنے کے لئے قوت (سیاسی اقتدار) شرط اولین ہے۔ اس لئے اسلام اپنے پیروؤں کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ وہ دنیا میں اس معاشی نظام کو نافذ کر سکیں جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

بجز کس نباشد در جہاں محتاج کس

اسلام نے عقائد اور عبادات (مذہب) کے علاوہ انسانوں کو معاشی نظام کیوں عطا کیا؟ اسلئے کہ اسلام کا مقصود یہ ہے کہ

(ا) انسان ماسوی اللہ (دوسرے انسانوں) کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔

(ب) لیکن اگر رزق (معیشت) کے سرچشمے انسانوں کے قبضہ میں ہوں۔ تو انسان دوسروں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے۔

(ج) اس لئے اسلام نے حکم دیا کہ ان سرچشموں کو انسانوں کے قبضہ سے نکال کر ملت (خلیفہ) کے قبضہ میں دے دیا جائے۔ یعنی اس طرح ملوکیت کا خاتمہ کر دیا۔

(د) مگر ان سرچشموں کو انسانوں کے قبضہ سے نکالنے کے لئے قوت (سیاسی اقتدار) شرط اولین ہے۔ اس لئے اسلام نے مسلمانوں کو تمکن فی الارض حاصل کرنے کا حکم دیا۔ کما قال اللہ:۔

وَلَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنصُرُهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ اَلَّذِينَ اِن مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ؕ (۲۲ ـــــ ۴۱)

اور یاد رکھو جو کوئی اللہ کی سچائی کی حمایت کرے گا۔ ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں کہ وہ یقیناً قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے (یہ مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کردیا (تمکین فی الارض عطا کردی) یعنی ان کا حکم چلنے لگا۔ تو نماز (کا نظم) قائم کریں گے زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے۔ لوگوں کو برائیوں سے روکیں گے۔

اس آیت نے واضح کردیا۔ کہ قرآن کے نزدیک مسلمانوں کے اقتدار و حکومت کا اصلی مقصد کیا تھا؟ فرمایا اگر ان مظلوم مسلمانوں کے قدم جم گئے تو کیا کریں گے؟ یعنی تمکین فی الارض کو کن کن مقاصد کے لئے کام میں لائیں گے۔؟ فرمایا کہ یہ لوگ نماز کا نظام قائم کریں گے۔ زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ لوگوں کو نیکی کا حکم دیں گے۔ برائیوں (زنا واغلت، شراب، قمار، غبن، خیانت، اکتناز، احتکار، رشوت، بلیک مارکیٹ اور دغا فریب سے روکیں گے یعنی مسلمانوں کے اقتدار، (حکومت) کا اصلی مقصد یہ تھا۔ کہ ظلم اور بدعملی کی جگہ عدل اور راستی کی مملکت قائم ہو جائے۔

(ترجمہ وحواشی سند رجہ ترجمان القرآن ازجناب مولانا ابو الکلام آزاد جلد دوم صفحہ ۱۲۵)

چونکہ معاشی نظام کا قیام سیاسی اقتدار پر موقوف ہے اس لئے اسلام بیک وقت ایک اخلاقی نصب العین یا دین بھی ہے۔ اور نظام الدولت یا سیاست بھی ہے۔ اور یہ دونوں شامل (دین ...)

اس طرح آپس میں مربوط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔[1]

اخلاقی نصب العین سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے۔ کہ خدائے واحد کی صفات کا رنگ اپنے اندر پیدا کرو۔

رنگ او بر کن مثال او شوی   درجہاں نقش جمال او شوی

اور ارباب علم سے مخفی نہیں ہے۔ کہ یہ نصب العین اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب دنیا میں ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کا غلام نہ ہو۔ کیونکہ غلام کا کوئی اخلاقی نصب العین نہیں ہو سکتا۔

ع   جب جھکا غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

سیاست سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام ایسا نظام حکومت قائم کرتا ہے جس میں کوئی انسان دوسرے انسانوں پر حکومت نہیں کر سکتا۔ تمام انسان صرف اللہ کے محکوم ہیں۔ اور خلیفہ یا امیر کا فرض یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کا قانون نافذ کرے خود بھی اس کی اطاعت کرے۔ اور قوم سے بھی اسی کی اطاعت کرائے تاکہ وہ اخلاقی نصب العین حاصل ہو سکے۔ اور سب جانتے ہیں۔ کہ نصب العین ہی مقصود حیات ہوا کرتا ہے بالفاظ دگر، انسان اپنے اندر خدائی صفات صرف اس وقت پیدا کر سکتا ہے جب دنیا میں ایسا سیاسی نظام قائم ہو۔ جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کا مطیع نہ ہو سب یکساں طور پر اللہ کے مطیع ہوں۔

---

[1] چونکہ اسلام دین اور ریاست کی ناقابل تقسیم وحدت کا نام ہے اسی لئے مرشد رومیؒ نے اقبال کو یہ حکم دیا ہے۔

معنی دین و سیاست باز گوئے
اہل حق را زیں دو حکمت باز گوئے

جب یہ سیاسی نظام قائم ہو جائیگا۔ تو وہ معاشی نظام نافذ ہو سکیگا جس کی رو سے خلافت ہر شخص کی معاشی ضروریات کی ذمہ دار ہوگی اور چونکہ رزق کے سرچشمے افراد کے بجائے خلافت کے قبضہ میں ہوں گے اسلئے کوئی شخص اپنی ضروریات زندگی کے لئے دوسرے کا محتاج نہ ہوگا۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبین این است و بس

رزق کے سرچشمے یوں تو بہت سے ہیں مگر وہ سب زر اور زمین کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ اسی لئے شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو دولت اور زمین پر مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی دولت اور اپنی زمین پر قابض و متصرف تو ہو سکتا ہے مگر ان کا مالک نہیں ہو سکتا۔ زر اور زمین (بلکہ ساری کائنات) کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے انسان یعنی مسلمان اللہ کی اس ملک کا امین ہے۔ اس لئے اس کا قبضہ اور تصرف دونوں شریعت کے حدود کے اندر رہ کر ہو سکتے ہیں اگر وہ اپنی مرضی کو دخل دیگا تو امانت میں خیانت کے جرم کا مرتکب ہوگا اور خلافت اس سے باز پرس کرے گی چنانچہ اقبال صاف لفظوں میں کہتے ہیں:-

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین
اس سے بڑھ کر ہو گا کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین (ارمغان حجاز)

جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس کی تائید میں اقبال کو پیش کرتا ہوں:۔

واضح ہو کہ اسلام میں دو حقیقت ایک ہی ہے جیسے ایک زاد بوم

نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو وہ حقیقت مذہب (CHURCH) نظر آتی ہے اور دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہی حقیقت مملکت (State) نظر آتی ہے۔ یعنی مذہب اور سیاست ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ کہ مذہب اور سیاست ایک ہی شئی کے دو رُخ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام ایک واحد اور ناقابل تجزی حقیقت ہے جو تمہارے زاویہ نگاہ کے بدلنے سے کبھی مذہب نظر آتی ہے۔ کبھی مملکت۔ یہ نکتہ بہت دقیق اور دور رس ہے۔ اسلام کی رو سے۔ مملکت انسانی تنظیم کے ذریعے زندگی کے روحانی پہلو کے تحقق کی کوشش کا دوسرا نام ہے

(تشکیل جدید مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۳۴ء صفحہ ۱۴۶)

اقبال نے اسی نکتہ دقیق کو صفحہ ۱۴۷ پر اس انداز سے بیان کیا ہے:۔

"ثقافت اسلامیہ نے اصول توحید کو وحدت عالم کے لئے سنگ بنیاد قرار دیا۔ اور اسلام ایک نظام دولت یا نظام عمرانی (POLITY) کی حیثیت سے کچھ نہیں ہے۔ مگر اسی اصولِ توحید کو بنی آدم کی عقلی اور جذباتی زندگی میں ایک عنصر فعال بنا دینے کا دوسرا نام ہے اسی لئے اسلام انسان کو یہ حکم دیتا ہے کہ اپنی وفاداری (اطاعت) کا مرکز اللہ کو بناؤ نہ کہ ملوکیت کو۔ یعنی بادشاہوں کے بجائے اللہ اور صرف اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرو۔

اور چونکہ اللہ ہی زندگی کی آخری روحانی بنیاد ہے اس لئے اللہ

ل یہ دعویٰ قرآن کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ (۵۳ - ۴۲)

اور تخلیق ہر شئی کی انتہا (آخرکار) تیرے رب ہی کی طرف ہے۔

سے وفاداری (اس کی اطاعت) دراصل انسان کی خود اپنی ہی مثالی فطرت سے وفاداری بن جاتی ہے۔ یعنی اللہ کی اطاعت عملی طور پر خود اپنی ہی فطرت کے تقاضوں کی تسکین کا دوسرا نام ہے۔

میں اس جگہ ان اقتباسات کی شرح تو سپرد قلم نہیں کر سکتا۔ لیکن اپنے موضوع کو واضح کرنے کے لئے حسب ذیل استنباط ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

اقبال کی رائے میں عقیدہ توحید الٰہی، وحدت عالم کے لئے بمنزلہ سنگ بنیاد ہے یعنی قرآن حکیم یہ اعلان فرماتا ہے کہ ساری کائنات میں اللہ تبارک و تعالےٰ کے سوا اور کوئی ہستی اس لائق نہیں ہے کہ اس کی اطاعت (عبادت) کی جائے یا اسے حاجت روا یا مشکلکشا یا دستگیر یا کارساز یا معطی یا مانع یا حاکم یا قاہر یا فرمانروا تسلیم کیا جائے اس کے سوا کسی انسان میں یہ طاقت نہیں کہ کسی انسان کو نفع یا نقصان پہونچا سکے یا کسی کو کچھ دے سکے۔ یا کسی سے کچھ لے سکے۔

لیکن یہ سوال یوجہ ہے کہ یہ عقیدہ انسانوں کی عقلی اور جذباتی زندگی میں

؎ اسی لئے صوفیائے کرام نے لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے۔

(۱) لا معبود الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

(ب) لا مطلوب و لا مقصود الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی مطلوب اور مقصود نہیں ہے

(ج) لا فاعل فی الحقیقۃ الا اللہ یعنی اللہ کے سوا درحقیقت کوئی فاعل نہیں ہے

(د) لا موثر فی الوجود الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی شخص اشیائے کائنات میں تاثیر پیدا کرنے والا نہیں ہے۔

(ہ) لا موجود فی الحقیقۃ الا اللہ یعنی اللہ کے سوا درحقیقت کوئی شئی (انسان حیوان شجر حجر وغیرہ) از خود موجود نہیں ہے۔ ۱۲

ایک زندہ حقیقت نا ایک فعال عنصر کیسے بنے؟ اقبال کہتے ہیں اور بالکل صحیح کہتے ہیں ہ (اور اسی لئے میں ان کو عصر حاضر میں روح اسلام کے سب سے بڑے راز دانوں میں اور قرآن حکیم کے سب سے بڑے مفسروں میں یقین کرتا ہوں) کہ جسے تم اسلام کا نظام الدولہ (POLITY) کہتے ہو (نظام الدولہ سے اقبال کی مراد ہے اسلام کا سیاسی اور معاشی نظام) وہ تمہارے اسی سوال کا تو شافی جواب ہے۔ قرآن نے تمہیں عقائد اور عبادات اور اخلاق کے علاوہ یہ سیاسی اور معاشی نظام جو عطا کیا ہے۔ اس کی غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کہ تمہیں اس طرح زندگی بسر کرنے کے مواقع بہم پہنچائے کہ تم کسی وقت اور کسی صورت اور کسی حال میں بھی غیر اللہ کے محتاج یا دست نگر نہ ہو سکو۔ اور ظاہر ہے کہ جب تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں غیر اللہ (بادشاہ شہنشاہ، آمر مطلق، ڈکٹیٹر، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، نواب، جاگیردار، زمیندار یا سرمایہ داروں کی غلامی سے آزاد ہو جاؤ گے تو خود بخود حقیقی معنی میں موحد بن جاؤ گے۔ یعنی عقیدہ توحید تمہاری عملی زندگی میں ایک حقیقت ثابتہ اور صداقت نیرہ بن جائے گا۔ یعنی تمہارے قول اور فعل (عقیدہ اور عمل) میں مطابقت کلی پیدا ہو جائے گی۔ بالفاظ دیگر تم حقیقی معنی میں مسلمان بن جاؤ گے اس وقت تم محض زبان سے لا الہ الا اللہ نہیں کہو گے بلکہ یہ صداقت عظمی تمہارے ہر عمل ہر فعل سے ظاہر ہو گی پھر تمہاری زندگی کے ہر شعبہ میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ پھر تمہاری حالت یعنی تمہاری زندگی میں جو مضحکہ خیز تضاد پایا جاتا ہے وہ بالکل مٹ جائیگا پھر یہ نہ ہوگا کہ جب تم مسجد میں جاؤ گے تو یہ اعلان کرو گے کہ اے اللہ ہم تیرے سوا کسی کی اطاعت نہیں کرتے ۔۔۔ اور جب مسجد کی چار دیواری سے باہر نکلو گے۔ تو یہ اعلان

کرو گے کہ ہم حکومت کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔

فی الجملہ اسلامی نظام الدولہ (سیاسی اور معاشی نظام کی غایت ہی یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام یا مطیع یا فرمانبردار یا دست نگر یا محتاج نہ ہو۔ اس نظام کو عرف عام میں شریعت کہتے ہیں اور اقبال نے اس فصل میں اسی شریعت کے اسرار بیان کئے ہیں۔ اور اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبین این است و بس

مبادا کسی مسلمان کے دل میں یہ شبہ گزرے کہ اقبال نے اشتراکیت کے روز افزوں سیلاب کا سد باب کرنے کے لئے اسلام کی یہ نئی تعبیر پیش کر دی ہے۔ میں اس جگہ اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تعبیر اقبال کے دماغ کی اپج (اختراع) نہیں ہے۔ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ (سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب غلام اور صحابی) نے بھی اہل ایران کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہیں۔ یہی جواب دیا تھا۔

ان اللہ ارسلنا لنخرج الناس من ظلمۃ الجہالۃ وجور الملوک الی عدل الاسلام و نور الایمان الخ۔

اے باشندگان عراق، بیشک اللہ نے ہمیں تمہارے ملک میں بھیجا ہے مگر اس لئے بھیجا ہے کہ ہم بنی آدم کو جہالت کی تاریکی اور بادشاہوں کے ظلم و ستم (ملوکیت) کی لعنت سے نجات دے کر اسلام کے عادلانہ (سیاسی اور معاشی) نظام اور ایمان (توحید الٰہی) کی روشنی میں داخل کر دیں الخ۔

(أ) اسلام ملوکیت کا دشمن ہے کیوں ؟

اس لئے کہ ملوکیت انسانوں کو انسانوں کا غلام بناتی ہے۔

(ب) اسلام کا مقصد کیا ہے ؟

ایسا عادلانہ سیاسی اور معاشی نظام قائم کرنا جس کی بدولت انسان دوسرے انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس

دوسری بحث

تمہید میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا کے مذاہب میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے۔ جس نے عقائد اور عبادات کے علاوہ ایک عملی معاشی نظام بھی پیش کیا ہے۔ اب اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ دیگر مذاہب نے معاشی نظام کیوں پیش نہیں کیا۔

وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ جین دھرم، بودھ دھرم، ہندو دھرم اور مسیحیت دنیا کے ان چاروں بڑے مذاہب نے رہبانیت کی تعلیم دی ہے یعنی نجات یا مکتی یا موکش کو ترک دنیا پر موقوف کیا ہے چونکہ رہبانیت اپنے بنیادی تصور کے اعتبار سے معیشت اور معاشرت کی ضد ہے اسلئے یہ مذاہب انسانوں کو کسی قسم کا معاشی نظام دے ہی نہیں سکتے تھے۔

دنیا میں بودھ دھرم رہبانیت (ترک دنیا) کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور میری تحقیق کے مطابق جین دھرم، ہندو دھرم اور مسیحیت یہ تینوں مذاہب

بودھ دھرم کی تعلیم رہبانیت سے متاثر ہوئے ہیں خصوصاً آخرالذکر مذہب کا راہبانہ نظام تو سراسر بودھ دھرم سے ماخوذ ہے اور بودھ دھرم میں ایک بھکشو (راہب) کے لئے لازمی ہے کہ وہ ساری عمر تجرد کی زندگی بسر کرے اور حسب ذیل اشیاء کے علاوہ کوئی چیز اپنے قبضہ میں نہ رکھے۔

خرقہ درویشی، کمربند، پیالہ، استرہ، سوئی تاگا اور چھلنی

جین دھرم بھی ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے جس کی طرف قبل ازیں اشارہ کرچکا ہوں کہ جینی سادھو تو خرقہ بھی نہیں پہن سکتا اس کے لئے برہنگی کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یہی حال ہندو دھرم کا ہے وہ بھی ویراگ، تیاگ اور سنیاس (رہبانیت) کو بہترین طرز حیات قرار دیتا ہے رہی موجودہ مسیحیت تو اس کے متعلق اقبال کا یہ شعر کافی ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری

ان مذاہب نے حصول دولت کو روحانی ترقی کے حق میں سم قاتل قرار دیا ہے۔ یعنی نفس کشی کو بہترین اخلاقی نیکی بتایا ہے۔

ان مذاہب کے مقابلہ میں مادیت اور اشتراکیت نے حصول دولت ہی کو مقصد حیات قرار دیا ہے چونکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی نہیں ہے اس لئے حتی المقدور دولت حاصل کرو۔ اور اسے ذاتی عیش و عشرت میں استعمال کرو۔ چونکہ تہذیب مغرب کی بنیاد ہی انکار خدا پر ہے اسلئے مغربی اقوام نے بھی حصول دولت کو مقصد حیات بنالیا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تمام اخلاقی اقدار کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور جائز و ناجائز حرام و حلال کی تمیز بالکل اٹھا دی ہے۔ بلکہ ان کے ضابطہ اخلاق کی رو سے

ہر وہ فعل اچھا ہے جس کے ذریعہ سے دولت حاصل ہو سکے۔

گر آدمی درندہ بے دندان و چنگ

خلاصہ کلام اینکہ دنیا کے بعض مذاہب نے مال و دولت کو مذموم قرار دیا۔ اور اس لئے رہبانیت کی تعلیم دی۔ ان کے مقابلہ میں بعض مذاہب نے مال و دولت کو محمود قرار دیا۔ اور اسلئے تکاثر (حصول دولت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے) کی تعلیم دی۔

اسلام نے جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے اسی طرح مال و دولت کے متعلق بھی ایسی تعلیم دی ہے جو افراط اور تفریط دونوں عیوب سے پاک ہے۔

قرآن حکیم نے ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید کی ہے جس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) کتاب اللہ نے مال کو فتنہ یعنی آزمائش قرار دیا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ط (۶۴-۱۵)

بیشک تمہارے اموال اور تمہاری اولاد یہ دونوں تمہارے حق میں آزمائش ہیں یعنی اللہ تمہارا امتحان لیگا کہ تم کس کو زیادہ محبوب رکھتے ہو؟ مال اور اولاد کو یا اللہ کو؟ اسی لئے اگلی آیت میں فرمایا۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ ط (۶۴-۱۷)

اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو گے (یعنی اپنی دولت اللہ کی خوشنودی حاصل کرنیکے لئے اللہ کے حاجتمند بندوں میں تقسیم کرو گے) تو وہ اسے تمہارے لئے دگنا کر دے گا۔

(۲) چونکہ دولت از روئے تعلیمات قرآنی آزمائش ہے اس لئے اللہ تعالٰی نے دولت کی محبت کو مذموم قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍۙ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗۙ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ (۱۰۴ - ۱ تا ۳)

تباہی ہے ہر اُس غیبت کرنے والے (اور) طعنہ دینے والے کے لئے جو اپنی دولت کو جمع کرتا رہتا ہے۔ اور اسے گنتا رہتا ہے وہ (اپنی حماقت کی وجہ سے) یہ سمجھتا ہے کہ اسکی دولت اسکے ساتھ ہمیشہ رہیگی یا اسے غیر فانی بنا دیگی۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍۙ (۹ - ۳۴)

اور جو لوگ سونا اور چاندی (اپنی دولت) جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (اے رسول! آپ) انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے۔

(۳) لیکن قرآن حکیم ہمیں دولت حاصل کرنے کا بھی حکم دیتا ہے بلکہ اسے اللہ کا "فضل" قرار دیتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ

دولت مذموم نہیں ہے دولت کی محبت مذموم ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو یعنی معاش کی طلب میں مشغول ہو جاؤ۔ (۶۲ - ۱۰)

وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۷۳ - ۲۰)

اور بعض خدا کے فضل (یعنی معاش) کی تلاش میں ملک میں سفر کر رہے ہونگے۔

(۴) قرآن حکیم رہبانیت (ترکِ دنیا) کو بھی مذموم قرار دیتا ہے۔

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (۵۷ - ۲۷)

اور جہاں تک رہبانیت (ترکِ لذات) کا تعلق ہے تو اس نظام کو انہوں نے

خود (اپنے مذہب میں) ایجاد کیا ہم نے (یہ طریق زندگی) ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ ۔

(۵) قرآن حکیم ہمیں دنیاوی نعمائے (مکان، باغ، فواکہ، لباس وغیرہ) سے متمتع ہونے کی بھی اجازت دیتا ہے۔

بودھ دھرم اور رومن کیتھولک فرقہ کے مذہبی طبقہ کے افراد، نکاح نہیں کر سکتے۔ بھکشو اور بھکشن کی طرح پادری اور راہبات (NUNS) دونوں کے لئے تجرد شرط ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ تجرد کی زندگی سراسر خلاف فطرت ہے۔

لیکن اسلام نے نہ تو ان مذاہب کی طرح انسانی معاشرہ میں دین اور دنیا کی تفریق کی ہے اور نہ اپنے پیروؤں کو دیندار اور دنیادار دو غیر فطری طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ بلکہ ہر شخص کو شرعی حدود میں تمام جائز نعمتوں (زن، زر اور زمین) سے بہرہ اندوز ہونے کی اجازت دی ہے۔

۱؎ قرآن حکیم کی اسی آیت نے مجھے اس بات کی تحقیق پر مائل کیا۔ کہ جناب مسیح کے لائے ہوئے مذہب میں جو یقیناً اللہ کی طرف سے تھا یہ خلاف عقل اور خلاف فطرت طریق زندگی جسے عرف عام میں رہبانیت (MONASTICISM) کہتے ہیں کب، کیسے، کیونکر، کہاں سے اور کس کے ذریعہ سے داخل ہوا؟ تحقیق کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ عیسائیوں نے دیگر مذاہب کے علاوہ سب سے زیادہ اثر بودھ دھرم سے قبول کیا اور رہبانیت کا طریقہ اسی سے اخذ کیا۔ چنانچہ رومن کیتھولک فرقہ کے پادریوں اور تارک الدنیا عورتوں (NUNS) اور بودھ دھرم کے راہبوں اور راہبات (بھکشو اور بھکشن) کی زندگی میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر لوتھر نے پاپائیت کے ساتھ ساتھ رہبانیت کے خلاف بھی علم جہاد بلند کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پراٹسٹنٹ فرقہ کے پادری شادی کر سکتے ہیں اور اس فرقہ میں راہبات کا وجود بھی نہیں ہے۔ ۱۲

جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ (۷ - ۳۲)

اے رسول آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ اللہ نے جو زینت کے ساز و سامان اور کھانے پینے کی ستھری چیزیں اپنے بندوں کے لئے پیدا کیں ہیں اُن کو کس نے حرام کیا ہے؟

(۶) ان آیتوں کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھنے سے دو باتیں روز روشن کی طرح ثابت ہو سکتی ہیں۔

پہلی یہ کہ اللہ تو نے ہمیں دولت کمانے اور دنیاوی نعمتوں سے متمتع ہونے کی اجازت دی ہے

دوسری یہ کہ اللہ تو نے ہمیں دولت اور دینوی ساز و سامان سے محبت کرنے یا ان کو مقصودِ حیات بنانے سے روکا ہے بالفاظ دگر دولت کماؤ اور خوب کماؤ۔ مگر اُس سے دل مت لگاؤ۔

(ب) تو پھر کیا کرو؟ اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ پہلے اسے اپنی ضروریات پر خرچ کرو اور تمہاری جائز ضروریات سے جو باقی بچے اُسے اللہ کو قرض دے دو۔

واضح ہو کہ جس طرح اکتناز (دولت جمع کرنے) کی ممانعت کی ہے۔ اسی طرح اسراف اور تبذیر (بے دریغ خرچ کرنا یا فضول خرچی کرنا) بھی ممنوع ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ (۱۷ - ۲۷)

بلاشبہ فضول خرچی کرنے والے اشخاص شیطانوں کے بھائی بند ہیں۔

اب جبکہ ایک مسلمان۔

(ل) نہ تو اکتناز کر سکتا ہے یعنی نہ اپنی دولت کو جمع (hoarding) کر سکتا ہے

(ب) نہ ہی تبذیر کر سکتا ہے یعنی نہ ناجائز طریق پر صرف کر سکتا ہے۔

(ج) تو صرف ایک ہی صورت رہ گئی۔ یعنی وہ اسے تقرب الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے اور اسی کو شریعت کی اصطلاح میں "انفاق بسبیل اللہ" کہتے ہیں۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰہِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ط اَلَآ اِنَّہَا قُرْبَۃٌ لَّہُمْ ط (۹ - ۹۹)

اور دیہاتیوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں۔ جو اللہ اور روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اُسے خدا کی جناب میں تقرب اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ (اے رسول آپ مسلمانوں کو آگاہ کر دیجئے۔ کہ بیشک وہ خرچ کرنا اُن کے لئے موجب قربت ایزدی ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں انہیں دو عظیم الشان فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

(ل) انہیں قرب خداوندی حاصل ہو جاتا ہے

(ب) سرکار ابد قرار صلعم ان کے لئے دعا فرماتے ہیں یعنی حضور انور صلعم کی دعائیں ان کے شامل حال ہو جاتی ہیں اب مسلمان خود غور کر لیں کہ دنیا اور آخرت میں ان دو نعمتوں سے بڑھ کر کون سی نعمت ہو سکتی ہے۔

قرآن حکیم نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ کہ اے مسلمانو! چونکہ تم

اپنی دولت کے مالک نہیں ہو بلکہ امین ہو۔ اس لئے اگر تم درحقیقت نیک بننا چاہتے ہو تو اپنی دولت جسے تم بتقاضائے فطرت محبوب رکھتے ہو، ہماری راہ میں خرچ کرو۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط (۳ - ۹۲)

اے مسلمانو! جب تم خدا کی راہ میں ان چیزوں میں سے خرچ نہ کروگے، جن کو تم عزیز رکھتے ہو اس وقت تک تم نیکی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے یعنی تم پر ایک نکوکار انسان کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ کلام اینکہ دولت کے متعلق قرآنی تعلیم یہ ہے کہ

(۱) وہ بذات خود کوئی بری یا ناپاک شئی نہیں ہے۔
(۲) بلکہ وہ خدا کا فضل ہے یعنی اس کی پیدا کردہ نعمتوں میں سے ہے۔
(۳) انسان پر دولت حاصل کرنا فرض ہے۔
(۴) لیکن وہ اسے مقصد حیات نہیں بنا سکتا۔
(۵) وہ اس کا امین ہے۔ اصلی مالک اللہ تو ہے۔
(۶) مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی جائز ضرورتوں کے بعد جس قدر ممکن ہو سکے اپنی دولت اللہ کو قرض دے (یعنی اس کے محتاج بندوں میں تقسیم کردے۔

؎ راہب دولت سے نفرت کرتا ہے اسلئے ترک دنیا کر دیتا ہے اور حصول دولت سے باز رہتا ہے اور کافر دولت سے محبت کرتا ہے اس لئے اس پر تابع ہو جاتا ہے لیکن مسلمان نفرت بھی نہیں کرتا اس لئے دولت کماتا ہے اور اس سے محبت بھی نہیں کرتا اس لئے اس پر قبضہ بھی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی عطا کردہ دولت کا امین سمجھتا ہے۔ اور دنیا جانتی ہے کہ امین نہ امانت سے نفرت کرتا ہے نہ محبت۔ فافہم فتدبّر ۱۲

(۷) نہ فضول خرچی کرے اور نہ ٹینٹ کر رکھے۔

(۸) لامحالہ ایک ہی صورت رہ گئی۔ کہ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیئے اپنی دولت کا بڑا حصہ اللہ کے محتاج بندوں میں تقسیم کر دے۔

(۹) جب تک اللہ اور اس کے رسول کی محبت دل میں راسخ نہ ہو جائے۔ دولت کو اپنے حق میں فتنہ (آزمائش) سمجھو۔

(۱۰) لیکن جب دولت کی محبت دل سے نکل جائے اور اس کی جگہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت دل میں راسخ ہو جائے تو پھر وہی دولت جو موجب ہلاکت تھی باعث برکت ہو جائے گی۔

نوٹ: اگر مثال درکار ہو تو جامع آیات رحمان، کامل الحیاء والایمان سیدنا عثمان ابن عفانؓ اور حضرت شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانیؒ اور ان کے فرزند شیخ صدر الدین عارفؒ اور سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی دہلویؒ کے سوانح حیات کا مطالعہ کافی ہوگا ان حضرات کے تصرف میں ہر وقت لاکھوں روپے رہتے تھے۔ مگر انہیں اُن زخارف دنیوی سے کوئی لگاؤ یا تعلق نہ تھا۔

چنانچہ شیخ صدر الدین کو ترکہ میں سات لاکھ درہم نقد ملے مگر انہوں نے یہ ساری رقم ایک ہی دن میں فقراء و مساکین میں تقسیم کر دی اور اپنے لئے ایک درہم بھی نہ رکھا۔ کسی نے عرض کی کہ آپ کے والد بزرگوار (شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی) اپنے خزانے میں نقد و جنس جمع رکھتے تھے اور اس کو تھوڑا تھوڑا صرف کرنا پسند کرتے تھے۔ آپ کا عمل بھی ان ہی کی روش کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ شیخ موصوفؒ نے فرمایا حضرت بابا دنیا پر غالب تھے۔ اس لیئے اگر دولت ان کے پاس جمع ہو جاتی تو ان کو علائق دنیا

کا کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا۔ اور وہ دولت کو تھوڑا تھوڑا خرچ کرتے تھے۔ مگر مجھ میں یہ وصف نہیں ہے اس لئے مجھے اندیشہ ہوا کہ مال و دولت کی وجہ سے کہیں دنیا کے فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤں اس لئے میں نے ساری دولت یک لخت علیحدہ کر دی۔"

(بزم صوفیہ مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے صفحہ ۱۰۷)

تیسری بحث

تحصیل دولت

(جسے اصطلاح میں پیدائش دولت کہتے ہیں)

تمہید:۔ تحصیل یا پیدائش دولت کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے اسلام کے چند بنیادی معاشی اصولوں کی توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے۔

(۱) معاشی نقطۂ نظر سے اسلامی معاشرہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "لا رھبانیۃ فی الاسلام" یعنی اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔ وہ اپنے پیروؤں کو ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔

(۲) قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ انسان فطری طور پر دولت اور نعمائے دنیوی کا دلدادہ ہے۔ اور ان کے حصول کا جذبہ ہر وقت اس کے اندر کارفرما ہے۔ اور جس خدا نے خود انسان کو پیدا کیا ہے اسی نے اسکے اندر حصول دولت کی آرزو بھی پیدا کی ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ

الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط
(۳ - ۱۴)

لوگوں کی بناوٹ (فطرت) اس طرح کی واقع ہوئی ہے۔ کہ ان کو دنیا کی مرغوب چیزوں یعنی عورتوں (بیویوں) بیٹوں، سونے اور چاندی کے ڈھیروں، عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتی کے ساتھ محبت (دلبستگی) بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

چونکہ ان چیزوں کے ساتھ دلبستگی فطری امر ہے۔ اس لئے خالق فطرت نے انسان کو ان کے حصول سے منع نہیں کیا۔ یعنی ترک دنیا کا حکم نہیں دیا۔ اگر وہ ایسا کرتا۔ تو پھر اسلام کو انسان کا فطری دین قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اسی لئے اللہ نے یہ فرمایا۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۵۔

زمین (کائنات) میں جو کچھ ہے اسے اللہ نے تمہارے (ہی) لئے پیدا کیا ہے۔

مزید ارشاد فرمایا:۔

وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۲۸ - ۷۷)

اے انسان تو اس دنیا سے اپنا حصہ لینا فراموش مت کر۔

لیکن قرآن حکیم نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ دنیا اور نعمائے دنیوی کو مقصود حیات مت بناؤ۔ یعنی ان کے حصول میں اس درجہ منہمک مت ہو جاؤ۔ کہ اللہ اور آخرت سے غافل ہو جاؤ۔ آیت ذیل میں قرآن نے مسلمان کے لئے مسلک حق بیان کر دیا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (۲۴ - ۳۷)

اللہ کے ایسے بندے ان کے نام کی تحمید و تقدیس کرتے رہتے ہیں جن کو سوداگری یا خرید و فروخت (تجارت) اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔

(۳) دین اور دنیا میں خوشگوار امتزاج قائم کرنے کے بعد اسلام نے اپنے معاشی نظام کو اخوت، مساوات، اور حریت کے اصولوں پر مبنی کیا ہے۔

(الف) اخوت سے مراد یہ ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹ - ۱۰)

بیشک تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اسلام کا معاشی نظام اس بنیادی تصور پر قائم ہے کہ ہر مسلمان کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کرے اور جماعت میں جو لوگ محروم یا سائل ہیں ان کی مدد کرے۔

اس آیت کی تفسیر میں سرکار ابد قرار صلعم نے فرمایا۔

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے مثل اس عمارت کے ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصوں کو تقویت دیتا ہے۔ یہ فرما کر آپ نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر صحابہ رض کو دکھائیں اور فرمایا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اسی طرح تقویت دیتا ہے۔

نیز فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے

(صحیح بخاری)

(ب) مساوات کا مطلب یہ ہے کہ سب مسلمان آپس میں یکساں ہیں۔ کسی دولتمند کو کسی مفلس پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے اس اصول کا اثر معاشی نظام پر یہ مرتب ہوتا ہے۔ کہ معیشت کے اسباب و ذرائع سب مسلمانوں کو یکساں حاصل ہوں گے کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائیگا یعنی جب دولت یا سامان معیشت کی تقسیم ہوگی تو سب کو

یکساں حصہ ملے گا

(ج) حریت کا مفہوم یہ ہے۔ کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی شخص عوام کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ اور نہ امیر قوم سیفٹی ایکٹ کے ذریعہ سے عوام کی زبانوں پر قفل لگا سکتا ہے۔

اسلام دنیا میں ہر قسم کی حریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے وہ ہر قسم کی غلامی کو — سیاسی ہو یا معاشی ذہنی یا معاشرتی مٹانا چاہتا ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں (ارمغان حجاز)

اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جب تک ایک انسان کو ہر قسم کی آزادی نصیب نہ ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم سرکار ابد قرار صلعم کی شان میں گوہر فشانی کرتا ہے

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۵

اور یہ رسول لوگوں کی گردنوں سے اس بوجھ کو جو ان پر تھا اور ان بیڑیوں کو جن میں وہ گرفتار تھے۔ ان سے دور کرتا ہے یعنی انسانوں کو ہر قسم کی حریت سے بہرہ ور کرتا ہے۔ (۷ ـ ۱۵۷)

ایک دفعہ ایک شخص نے فاروقِ اعظمؓ سے عمرو بن عاص والیٔ مصر کے متشددانہ طرز عمل کی شکایت کی تو انہوں نے ان کو دارالخلافہ میں طلب فرمایا اور ان سے دریافت کیا۔ اے عمرو! تم نے کب سے باشندگانِ مصر کو اپنا غلام بنا لیا۔ حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا؟

نوٹ: انقلاب فرانس نے [illegible] جو بات اٹھارویں صدی میں اہل یورپ نے سمجھی۔ وہ فاروقِ اعظم نے ساتویں صدی میں

دنیا کو بتا دی تھی۔ کہ کوئی انسان کسی انسان کا غلام نہیں ہے آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔

ان بنیادی اصولوں کی وضاحت کے بعد اب ہم پیدائش دولت کی ان صورتوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کو اسلام نے جائز قرار دیا۔

(۱) اسلامی معاشی نظام نے جائز طریقوں سے دولت کمانے کی اجازت دی ہے مگر ایسی پابندیاں بھی عائد کر دی ہیں جن کی بنا پر

(ا) انسان حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہو سکے۔

(ب) سرمایہ داری اور سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا نہ ہو سکے۔

(ج) معاشی جدوجہد سے دینداری اور پاکیزگی اخلاق پیدا ہو سکے۔ تاکہ تمام معاشی جدوجہد عبادت بن جائے۔ اور اس طرح دین اور دنیا میں جو تفریق کلیسا نے پیدا کر دی ہے۔ وہ مٹ جائے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ پیدائش دولت اور حصول معاش کے لئے جدوجہد کے لئے جو نمونہ سرکار ابد قرار صلعم نے پیش کیا ہے اگر مسلمان اس پر عامل ہو جائیں تو کوئی مسلمان بھی بے روزگار نہیں رہ سکتا۔

قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ صرف مذہبی رسوم ادا کر دینے سے کوئی شخص نیک نہیں بن سکتا جب تک کہ نماز روزے کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کی محبت میں اپنی دولت اپنے رشتہ داروں، یتیموں مسکینوں مسافروں سائلوں قیدیوں کو آزاد کرانے کے سلسلہ میں تقسیم نہ کرے۔ (۲ - ۱۷۷)

بنظر اختصار میں پیدائش دولت کے مختلف ذرائع کی طرف صرف اشارات کروں گا جو حضرات تفصیل کے آرزومند ہوں وہ ڈاکٹر یوسف الدین

صاحب حیدرآبادی کی گرانقدر تالیف "اسلام کے معاشی نظریے" کا مطالعہ کرلیں جس سے میں نے بھی استفادہ کیا ہے۔

(۱) اسلام نے انسانوں کو حیوانات سے استفادہ کی اجازت دی ہے۔ مثلاً ماہی گیری، گلہ بانی، بھیڑ بکریوں کی پرورش بھیڑوں سے اون حاصل کرنا، گھوڑوں کی تربیت، مویشیوں کی نسلی ترقی، مرغیاں پالنا، شہد کی مکھیاں پالنا، کرم پروری وغیرہ،

(۲) نباتات سے استفادہ مثلاً جنگل کاٹنا، لکڑیاں جمع کرنا، باغبانی اور کھیتی باڑی وغیرہ،

(۳) جمادات سے استفادہ مثلاً معدنیات (جواہرات) سمندر سے موتی نکالنا، زمین کھود کر مختلف اشیاء نکالنا۔

(۴) صنعت و حرفت مثلاً جہاز بنانا مختلف دھاتوں سے اشیاء بنانا، پارچہ بافی، سنگ تراشی، عمارت سازی، زیور سازی، چرم سازی، قالین سازی دباغت، لعبت سازی (TOYS) فرنیچر سازی۔

(۵) تجارت۔ یہ پیدائش دولت کا (زراعت کے بعد) سب سے بڑا ذریعہ ہے حضور فرماتے ہیں تسعۃ اعشار الرزق فی التجارۃ یعنی ۹/۱۰ رزق تجارت میں ہے۔ انفرادی کاروبار، مضاربت، شرکت اور اسکی مختلف صورتیں لیکن حضور نے دیانت اور صداقت کو تجارت کے لئے لازمی قرار دیا ہے فرماتے ہیں۔ دیندار تاجر قیامت کے دن انبیاء کے زمرہ میں ہوگا۔ آپ نے فرمایا اگاہک کو دھوکہ مت دو، چنانچہ ترمذی میں ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: کہ اگر تم بکری فروخت کرو تو اس کے تھنوں میں دودھ جمع مت کرو۔ کیونکہ خریدار دھوکہ میں پڑ جائیگا۔

ایک مرتبہ آپ بازار میں تشریف لئے جا رہے تھے غلہ کا انبار نظر آیا۔ آپ نے اپنا دست مبارک اس میں ڈالا آپ کی انگلیاں گیلی ہو گئیں مگا آپ پر حقیقت حال منکشف ہو گئی اور آپ نے دوکاندار سے پوچھا۔ مَا هٰذَا؟ یا صاحب الطعام۔ اے مالک غلہ! یہ کیا ہے۔؟ اس نے کہا۔ یا رسول اللہ! اس اناج پر بارش ہو گئی تھی۔ آپ نے فرمایا اَفَلَا جَعَلْتَهٗ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰی یَرَاهُ النَّاسُ؟ مَنْ غَشَّنَا فَلَیْسَ مِنَّا یعنی تو تم نے اس گیلے اناج کو اوپر کیوں نہ رکھا کہ خریدار لوگ اسے فوراً دیکھ لیتے۔ جو لوگوں کو دھوکہ دے وہ ہم سے نہیں ہے۔

چونکہ پیدائش دولت کا سب سے بڑا ذریعہ زراعت ہے اس لئے میں نہایت اختصار کے ساتھ اسلام کے زرعی نظام کی خصوصیات ذیل میں بیان کرتا ہوں تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کے معاشی نظام میں جاگیرداری اور زمینداری کی گنجائش کس حد تک ہے۔

چوتھی بحث

اسلام کا زرعی نظام

تمہید :۔ اسلام کے زرعی نظام کی وضاحت سے پہلے ایک نکتہ مفیدہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد وہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کہ اسلام کی روح جاگیرداری اور زمینداری کے موافق ہے یا مخالف ہے؟ اور اسلام جس قسم کا معاشرہ دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اس میں جاگیرداری اور زمینداری کیلئے کوئی

گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں ؟

سب جانتے ہیں کہ اسلام نے سود اور ہر قسم کے سودی کاروبار کو ممنوع قرار دیا ہے اور یہ ممانعت اس شدت کے ساتھ کی ہے کہ سارے قرآن میں اس کی نظیر نہیں ملتی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ط فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ط (۲ ـ ۲۷۹)

اے ایمان والو! اللہ کے احکام کی نافرمانی سے بچو اور دستبردار ہو جاؤ اس رقم سے جو سود کے سلسلہ میں قرضداروں پر باقی رہ گئی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔ اگر ایسا نہ کرو تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اب میں ناظرین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس حکم کے علاوہ سارے قرآن میں کوئی اور حکم بھی ہے جس کی نافرمانی کرنے والوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ کی دھمکی دی گئی ہو ؟ اگر نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے ؟

اس کا جواب وہ یہی دیں گے کہ سود کی وجہ سے

(۱) اسلام کا معاشی نظام باطل ہو جاتا ہے ، کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ قوم کی دولت صرف اغنیاء کے طبقہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائے لیکن سود کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ دولت صرف دولتمندوں کے طبقہ میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے یعنی سود اسلام کی ضد ہے یا اسکی نفی ہے ۔

(۲) اسلام کا اخلاقی نظام بھی تباہ ہو جاتا ہے کیونکہ اسلام چاہتا ہے

کہ ہر دولتمند مسلمان نادار اور مفلس مسلمانوں کے ساتھ محبت رحمدلی اور ہمدردی کا برتاؤ کرے۔ اپنی دولت اُن کو آسودہ کرنے کے لئے صرف کرے لیکن سود خور کی نگاہ میں محبت، رحمدلی اور ہمدردی سے بڑا جرم کوئی نہیں ہے یعنی سود اخلاق حسنہ یا اسلام کی ضد ہے۔

(۳) سرمایہ داری کو فروغ ہوتا ہے سود خوار دولت سے محبت کرنے لگتا ہے اور دن رات اس کو بڑھانے میں مشغول رہتا ہے وہ ہر اس بات سے گریزاں رہتا ہے جس سے دولت میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ یعنی اکتناز (دولت جمع کرنا) اس کا مقصد حیات بن جاتا ہے اور اکتناز اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ اسلام تو انفاق کا حکم دیتا ہے اور اکتناز انفاق کی ضد ہے

(۴) ملک میں ایک طبقہ ایسے افراد کا پیدا ہو جاتا ہے جو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے دوسروں کی محنت کا پھل کھاتا رہتا ہے سود خواروں کا طبقہ بلا مبالغہ غریبوں کا خون چوستا رہتا ہے اور خود تو دولتمند ہو جاتا ہے اور عوام مفلس ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ میں سخت ناہمواری اور شدید طبقاتی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔

فی الجملہ اگر یہ جوابات صحیح اور قابل تسلیم ہیں تو میں کہتا ہوں کہ جاگیرداری اور زمینداری کے نتائج بھی بجنسہٖ یہی نکلتے ہیں۔

(۱) محنت تو کاشتکار کرتا ہے لیکن اس کا پھل زمیندار کھاتا ہے؟ کیوں اس لئے کہ اس نے دولت کے بل بوتے پر ہزاروں ایکڑ زمین خرید لی۔ اور اب بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے وہ اپنی دولت میں مزید اضافہ کرتا رہتا ہے۔

اسی لئے اقبال نے یہ لاکھ روپے کا نکتہ بیان کیا ہے۔

حکم حق ہے لیس الانسان الا ما سعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

(۲) زمینداری اور جاگیرداری سے سرمایہ داری پیدا ہوتی ہے اور سرمایہ داری سے زمینداری میں اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی سود سے سرمایہ، سرمایہ سے زمینداری، زمینداری سے مزید سرمایہ، مزید سرمایہ سے سودی کاروبار میں مزید ترقی، مزید سود سے سرمایہ داری میں مزید اضافہ۔ وقس علیٰ ھذا

(۳) زمیندار بھی سرمایہ دار اور سود خوار کی طرح مجنون اور رحم دلی ہمدردی کے جذبات سے معریٰ ہو جاتا ہے۔ اور وہ بھی ع۱ اور ع۲ کی طرح عیش و عشرت میں غرق رہتا ہے اور کاشتکار کے ہاتھ سے روٹی ہی نہیں چھینتا بلکہ اس کی بیٹی سے اس کی آبرو بھی چھین لیتا ہے۔ کما قال اقبال :-

گہ آبروئے دختر مزدور برد

(۴) زمینداری سے بھی اسلام کا اخلاقی اور معاشی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ زمیندار روزانہ کاشتکاروں کو دیکھتا ہے کہ نہ انہیں کھانے کو روٹی ملتی ہے نہ پہننے کو کپڑا نصیب ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان غریبوں کے لئے اس کے دل میں کسی قسم کی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

(۵) سود خور کی طرح زمیندار کے گھر میں بھی دولت کی ریل پیل ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنے شکاری کتوں اور شکاری پرندوں پر ہزاروں روپے ہر سال ضائع کر دیتا ہے۔ مگر غریبوں کے لئے ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کر سکتا۔ اور اللہ کے نام پر دینا (انفاق فی سبیل اللہ) تو اس کے مذہب میں سب سے بڑا گناہ ہے۔

(۶) اگر دولت کا حقیقی مالک اللہ ہے اس لئے دولت کا کرایہ

(سود) لینا حرام ہے۔ تو زمین کا حقیقی مالک بھی اللہ ہی ہے اسلئے زمین کا کرایہ لینا بھی حرام ہے۔

(۴) اگر سود اس لئے حرام ہے کہ اس کی وجہ سے دولت اغنیاء کے طبقہ میں محدود ہو جاتی ہے۔ تو زمینداری بھی حرام ہے کیونکہ اسکی وجہ سے بھی زمین زمینداروں کے طبقہ میں محدود ہو جاتی ہے۔

(۵) اگر سود خوار اپنے طرز عمل سے اسلام کے معاشی نظام کو باطل کر دیتا ہے تو زمیندار اپنے طرز عمل سے اس نظام کو بدرجہ اولی باطل بلکہ تباہ وبرباد کر دیتا ہے۔ فافہم وتدبر۔

خلاصہ کلام ایک سود خوار اور زمیندار دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور دونوں یکساں طور پر اسلام کے معاشی نظام سے برسرپیکار ہیں۔ بلکہ میری دانست اور میرے مشاہدہ کی رو سے سود خوار کے مقابلہ میں زمیندار کہیں زیادہ بنی آدم پر ظلم وستم روا رکھتا ہے۔ جسے شک ہو وہ پنجاب اور سندھ کے دیہات کا دورہ کرکے دیکھ لے۔

سود خور صرف دولت پر (جو دراصل اللہ کی ملک ہے) ناجائز قبضہ کرتا ہے۔ اور اس طرح عوام (مفلس، محتاج، معذور، محروم، سائل) کو جائز انتفاع سے محروم کر دیتا ہے۔ لیکن زمیندار تو دوگونہ مجرم ہے کیونکہ وہ اللہ کی دولت کے علاوہ اللہ کی زمین پر بھی قبضہ مخالفانہ کرتا ہے۔ اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی زمین سے بھی جائز طور پر انتفاع سے محروم کر دیتا ہے۔

لہذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو دین سود خوری کو ناجائز قرار دے رہا ہے۔ وہ زمینداری کو جائز قرار دے گا؟ جب سود خوری اور زمینداری

دونوں یکساں طور پر اسلام کے اخلاقی اور معاشی نظام کی ضد ہیں۔ تو یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ اسلام ایک کو ممنوع اور دوسری کو مباح یا جائز قرار دے سکتا ہے اگر سود سے دولت اغنیاء کے طبقہ میں محدود ہو جاتی ہے تو زمینداری سے بھی یہی خرابی رونما ہوتی ہے۔ اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اللہ کی عطا کردہ دولت جو در اصل سبھی کی ملک ہے صرف اغنیاء کے طبقہ میں محدود ہو کر رہ جائے۔

کما قال اللہ تعالیٰ۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ط (۵۹ - ۷)

(جو مال اللہ اپنے رسول کو بستیوں کے لوگوں سے مفت میں دلوا دے تو وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور آپ کے قرابتداروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور بے توشہ مسافروں کا اور یہ حکم اس لئے دیا گیا) تاکہ وہ مال صرف تمہارے دولتمندوں کے طبقہ ہی میں نہ گردش کرتا رہے ۱۲۔

اس نص صریح سے ثابت ہوا کہ ہر وہ ادارہ یا گروہ یا نظام جس کی بنا پر مال و دولت صرف اغنیاء کے طبقہ میں محدود ہو جائے۔ اسلام کے معاشی نظام سے متصادم ہونے کی بناء پر قابل مذمت اور لائق نفرت ہے۔

چونکہ جاگیرداری اور زمینداری دونوں کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ دولت صرف دولتمندوں ہی کے طبقہ میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اور قوم کے محتاج اور مفلس غریب اس سے محروم رہتے ہیں۔

اس لئے جاگیرداری اور زمینداری دونوں اسلام کی روح کے خلاف ہیں اور اس کے پیش کردہ معاشی نظام کی ضد ہیں یعنی اسلام میں جاگیرداری اور زمینداری کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم ناظرین کو اسلام کے زرعی نظام سے روشناس کراتے ہیں۔

پہلی فصل

واضح ہو کہ دنیا میں جاگیرداری اور زمینداری کی بنیاد ملوکیت کی بدولت قائم ہوئی بادشاہوں نے عوام کی غلامی کو صفت دوام عطا کرنے کے لئے یہ اسکیم بنائی کہ

(۱) اپنے مصاحبوں اور ہوا خواہوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں اور ان سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ "تاج" کے وفادار رہیں گے۔ اور اپنے ضمیر کے بجائے بادشاہ کے احکام کی اطاعت کریں گے۔ ہر حال میں اس کے وفادار رہیں گے۔ یعنی جس کا کھائیں گے۔ اسی کا گن گائیں گے۔ اگر بادشاہ سے غداری کریں گے تو جاگیر منصب اور عہدہ ہر چیز ضبط ہو جائیگی بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔[۱]

---

[۱] ناظرین غور کریں کہ ملوکیت دراصل خدا سے بغاوت کا دوسرا نام ہے اسی لئے قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ "لا ملوکیت فی الاسلام"۔ اور اسی لئے اقبال نے اسے "ابلیسی نظام" سے تعبیر کیا ہے۔ ملوکیت بلاشبہ خدائی حکومت کے مقابلہ میں ایک متوازی حکومت ہے۔ ہر بادشاہ اپنے طرز عمل سے خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یعنی جن باتوں کا مطالبہ خدا اپنے بندوں سے کرتا ہے۔ مثلاً (۱) میرے قانون کی اطاعت کرو (۲) میرے وفادار رہو (۳) ہر حال میں میرے رسول کا ساتھ دو۔ (۴) میرے احکام کی تعمیل اپنا فرض منصبی سمجھو۔ (۵) ساری عمر میرا شکر ادا کرتے رہو ۔ انہی سب باتوں کا مطالبہ بادشاہ اللہ کے بندوں سے کرتا ہے۔

(ب) عوام چونکہ مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر ہوتے ہیں لہٰذا ان کو مطمئن کرنے کے لئے بادشاہوں نے ان کو رواج گرد یا شیخ الاسلام کا عہدہ عطا کیا۔ یعنی مسلمان بادشاہوں نے دین اسلام کو، جو ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ مذہب اور سیاست دو خیموں میں تقسیم کر دیا۔ مذہب میں شرعی قانون کے بجائے اپنا قانون نافذ کیا۔ اور علما کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ مذہب کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں ہے وہ صرف پوجا پاٹ (نماز روزے کا نام ہے) اس لئے بادشاہ کے احکام کی اطاعت مذہب کے خلاف نہیں ہے۔

جن علماء نے بادشاہوں کی اطاعت سے انکار کیا ان فرعونوں نے ان کو بلا تامل سیفٹی ایکٹ کے شکنجہ میں کس دیا۔ اور چونکہ ہر عالم دین امام ابو حنیفہؒ امام ابن حنبلؒ امام ابن تیمیہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے علماء کی اکثریت نے جان کے خوف سے ان سلاطین کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جب ان سلاطین نے علماء سوء کے ذریعہ سے اسلامی تعلیمات کو مسخ کر دیا۔ تو رفتہ رفتہ عوام اس حقیقت سے بیگانہ ہو گئے۔ کہ اسلام ملوکیت کا دشمن ہے[1]

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ان حالات انسانوں کے لئے صرف ایک ہی راہ عمل ہے یا وہ اللہ کے قانون کی اطاعت کریں یا بادشاہ کے قانون کی لہٰذا ایک مسلمان ملوکیت کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہے

[1] یہ حقیقت کہ ملوکیت اسلام کی ضد ہے اس واقعہ سے بھی ثابت ہو سکتی ہے کہ جب امراء نے عبدالملک بن مروان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کی کہ حضور تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوں تو اس وقت وہ قرآن پڑھ رہا تھا۔ جب اس نے یہ مژدہ جانفزا سنا تو قرآن کو بند کر کے جزدان میں بند کیا۔ کہ ھذا فراق بینی و بینک۔ یعنی اے قرآن! آج کے دن سے میرے اور تیرے درمیان ہمیشہ کے لئے جدائی ہو گئی ۱۲

ہے یعنی دیگر مذاہب کی طرح اسلام میں بھی ملوکیت کی لعنت داخل ہو گئی
قصہ مختصر یہ کہ بادشاہوں نے جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی
کی اور ان دونوں گروہوں نے ملوکیت کی حمایت کی۔ اور عوام کو اس لعنت
کا عادی اور غیر اللہ کی اطاعت کا خوگر بنا دیا۔

چونکہ جاگیردار بطور خود لاکھوں ایکڑ زمین کا انتظام نہیں کر سکتے ہیں
اس لئے انہوں نے اللہ کی اس زمین کو، جو اس نے عوام کے فائدے کے لئے
بنائی تھی۔ دولتمندوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جو دولت کے بل بوتے
پر اللہ کی زمین کے مالک ہو گئے۔

چونکہ زمیندار بھی بطور خود ہزاروں بیگھے زمین کی کاشت نہیں کر سکتے تھے
اس لئے انہوں نے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کاشتکاروں
کو بٹائی پر دے دیئے۔ اور ان غریبوں کا خون چوسنا شروع کر دیا۔

خلاصہ کلام اینکہ سب سے پہلے

(۱) بادشاہوں نے اللہ کی زمین پر ناجائز طور سے قبضہ کیا اس کے بعد

(۲) انہوں نے اپنے مصاحبوں کو یا فوجی سرداروں کو جنہوں نے ان کی
مدد کی تھی۔ جاگیریں عطا کیں۔

(۳) انہوں نے اللہ کی زمین دولتمندوں کے ہاتھ فروخت کر دی اور
یہ دولتمند لوگ زمیندار بن گئے ان تینوں گروہوں (بادشاہوں،
جاگیرداروں اور زمینداروں) نے عوام کا خون چوسنا شروع کر دیا۔ اب پڑھیے
اقبال کے اس شعر کو۔

حاصل آئین و دستور ملوک
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

(جاوید نامہ)

تمام مفسرین، محدثین، فقہاء اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ملوکیت حرام ہے اسلئے میں حیران ہوں کہ اگر شجرِ ملوکیت حرام ہے تو اس کے اثمار تلخ (جاگیرداری اور زمینداری) کس طرح اور کیونکر حلال ہو سکتے ہیں؟ اگر اسلام ملوکیت کا دشمن ہے۔ تو وہ جاگیرداری اور زمینداری کا حامی کس طرح ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص اس آدمی کو عقلمند کہہ سکتا ہے جو سانپ کو تو مار ڈالے مگر اس کے بچوں کو زندہ رہنے دے؟

دوسری فصل

ظہور اسلام سے پہلے ساری دنیا میں ملوکیت کا سکہ رواں تھا۔ اور ملوکیت کی بدولت اللہ کی زمین[1] جو ملوکیت سے قبل سب انسانوں میں مشترک تھی (جس طرح ہوا پانی اور آگ) جاگیرداروں اور زمینداروں کے ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ اور یہ لوگ اللہ کے بیکس بندوں کا خون چوس رہے تھے۔

یہ حالات تھے جب اسلام حریت، اخوت، مساوات، رحمت، عدالت اور ایثار کا انقلاب آفریں پیغام لے کر وادی غیر ذی زرع سے ظاہر ہوا۔ اور اس نے ایسا عمرانی نظام پیش کیا۔ جس کی رو سے نہ تو ملوکیت باقی رہ سکتی ہے۔ نہ جاگیرداری اور زمینداری کی بقا کا کوئی امکان ہے یعنی کوئی انسان روٹی کے لئے دوسرے انسان کا دست نگر یا غلام نہیں بن سکتا

---

[1] وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵ - ۱۰)
اور زمین کو اللہ نے عوام کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است و بس

واضح ہو کہ اسلام ایسا نظام حیات ہے جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ پر رکھی گئی ہے چنانچہ قرآن فرماتا ہے:۔

(۱) وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ط
اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت (حاکمیت) صرف اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ ہر شی پر قدرت کاملہ رکھتا ہے۔ (۳ - ۱۸۹)

(۲) کائنات کی ہر شی کا خالق (اس لئے مالک اور حاکم) اللہ ہی ہے۔ اس لئے مالکیت اور حاکمیت میں کوئی ہستی اس کی شریک نہیں ہو سکتی۔
وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ (۲۵ - ۲)
اور حکومت میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے (کیونکہ ہو ہی نہیں سکتا)
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا مطلب ہی یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی الٰہ نہیں ہے۔ یعنی خالق یا مالک یا حاکم نہیں ہے۔

؎ حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

(۳) انسان اللہ کا خلیفہ ہے یعنی وہ ایسا نظام حیات قائم کرنے پر مامور ہے۔ جس میں سب انسان اللہ تعالیٰ کے قانون کی اطاعت کر سکیں۔ اور کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہ ہو سکے۔ اور اللہ کے عطا کردہ نعمتیں سب کے لئے عام ہو سکیں۔ یعنی ہر شخص ان سے یکساں طور پر مستفید ہو سکے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (۱۲ - ۴۰)
آگاہ ہو جاؤ کہ حکمرانی صرف اللہ کے لئے ہے کوئی انسان اللہ کے

بندوں پر حکمران نہیں ہو سکتا بالفاظ دگر کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنا غلام یا دست نگر نہیں بنا سکتا۔

(۴) اللہ تو نے زمین و آسمان کی ہر شئی کو انسان کا خادم بنا دیا ہے۔
وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۝
اور اللہ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ (۴۵ — ۱۳)

(۵) اللہ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے اور یہ ساری اشیائے کائنات (وما فی الارض جمیعا) "بطور امانت" اس کے سپرد کر دی ہیں۔

(۶) یعنی خلافت (حکومت الٰہیہ) در اصل امانت ہے اور خلیفہ امین ہے بالفاظ دگر زمین اور اس میں جو کچھ ہے۔ در اصل اللہ کی ملکیت ہے مگر اللہ نے بمصلحت خاص انسان کو اپنی ملکیت کا امین بنا دیا ہے۔

(۷) خلافت کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اللہ کی اس عظیم الشان (امانت) (حکومت ارضی) کی نگرانی اور حفاظت کرے اور ایسا معاشی نظام قائم کرے جس کی بدولت ہر فرد اس امانت سے یکساں طور پر مستفید ہو سکے۔ بالفاظ دگر خلیفہ اس امانت کو اللہ کے بندوں میں ایسے عادلانہ طریق پر تقسیم کرے کہ وہ اللہ کی صفت رزاقیت کا مظہر اتم بن جائے۔

(۸) چونکہ خلافت الٰہیہ میں ہر شئی کا حقیقی مالک اللہ ہے اس لئے مملکت کی ساری اشیاء افراد کو بطور "امانت" محض انتفاع کے لئے دی

لے قرآن حکیم نے آیت ذیل میں اسی امانت کی طرف اشارہ کیا ہے۔
اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ

جائیں گی۔ یعنی افراد اللہ کی زمین اور ما فیہا کے مالک نہیں ہوں گے بلکہ امین ہوں گے۔

(۹) خلافت الٰہیہ میں ذرائع پیداوار (قطعات ارض یا جاگیریں) ذاتی اقتدار یا ذاتی سرمایہ یا ذاتی دولت میں اضافہ کے لئے کسی کو نہیں دیئے جا سکتے۔ کیونکہ اس طرح وہ شخص سرچشمہ رزق (اللہ کی زمین) پر قابض ہو کر زیردستوں، کمزوروں، غلطیوں اور عوام کو جن کے پاس دولت نہیں ہے اسباب معیشت سے محروم کر کے اپنی غلامی پر مجبور کر دے گا۔

(۱۰) خلافت الٰہیہ میں انفرادی یا اجتماعی ملکیت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اصل چیز مقصد ہے۔ اگر کسی وقت یہ مقصد (اسباب معیشت سے تمام افراد کا یکساں طور پر انتفاع اور استفادہ) افراد میں تقسیم کرنے سے حاصل ہو تو ذرائع پیداوار کو فرداً فرداً تقسیم کر دیا جائیگا اور اگر یہ مقصد اجتماعی طور سے کاشت کرانے سے حاصل ہو تو خلافت اس صورت کو بھی اختیار کر سکتی ہے۔

بدقسمتی سے ذرائع پیداوار کی تنظیم میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ

(بقیہ صفحہ ۴۴۹)

اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ. ط (۳۳ - ۷۲)

اور ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا (مگر) انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔ اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اس کو اٹھا لیا۔ یہاں امانت سے مقصد تکلیف یا اوامر و نواہی یا اتباع احکام الٰہی یا آسان لفظوں میں خلافت الٰہیہ کی ذمہ داری مراد ہے ملاحظہ ہو۔

تفسیر بیان القرآن حکیم الامت مولانا تھانوی جلد نہم صفحہ)

ملکیت زمین کو دے دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جس کے پاس ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دولت کی فراوانی ہو گئی دوسری طرف دوسرا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا۔ جو دن رات محنت کے باوجود نانِ شبینہ کو محتاج ہے۔

اسلام نے ملکیت کے تباہ کن اور فساد انگیز تصور کو خلافت کے تصور کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ قرآن نے صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ کھیتی باڑی ہی پر کیا موقوف ہے اور اسی کی کیا خصوصیت ہے۔ کائنات کی ہر شئی اللہ کی ملک (ملکیت) ہے ہر شئی کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ اور اس نے تمام اشیاء انسان کو بحیثیت خلیفہ، بطور امانت، برائے انتفاع، یعنی صرف استعمال کے لئے دی ہیں[1]۔ اور ہر امین (مسلمان) کو ان اشیاء کے استعمال کا حق اسی وقت تک ہے جب تک اس کے استعمال یا تصرف سے امنِ عامہ، رفاہِ عامہ اور مفادِ عامہ میں اختلال و انتشار کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر کوئی امین، اللہ کی امانت میں خیانت کرنے لگے یا دوسروں کو حقِ انتفاع سے محروم کرنے لگے یا امانت کا ناجائز استعمال کرنے لگے۔ تو خلافت کو حق حاصل ہے کہ اُس خائن سے امانت واپس لے لے۔[2]

اگر ہم اس حقِ انتفاع کو اپنے دل کی تسکین کے لئے ملکیت سے

---

[1] کیا خوب لکھا ہے اقبال نے:۔

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

[2] واضح ہو کہ قرآن حکیم کی رو سے صرف مال و دولت یا زمین ہی امانت نہیں ہے۔

تعبیر کرلیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے اس لفظ کے استعمال سے کوئی امین مالک نہیں بن سکتا۔

(۱۲) فی الجملہ خلافت الٰہی انسانوں کے لئے امانت کی بقا کی ضامن ہے۔ اور اس کی بجا آوری عدل و انصاف، شفقت و رحمت، ہمدردی اور ایثار اور خدمت خلق پر ہے۔ اور یہی حیات بخش اصول، تمام معاشی نظام خصوصاً زرعی نظام کے لئے بمنزلہ سنگ بنیاد ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ بروئے قرآن

(۱) اللہ تو اس کائنات کا خالق ہے اس لئے مالک ہے۔ اور چونکہ مالک ہے اس لئے رازق بھی ہے بالفاظ دگر وہ اپنی مخلوقات کے رزق اور ان کی پرورش کا ذمہ دار ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱ — ۶)

اور زمین میں کوئی چلنے والا (حیوان، انسان، طیور، وحوش و دیگر حشرات الارض) ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔

لیکن اللہ تو خود رزق تقسیم نہیں کرتا۔ بلکہ اس نے مصلحت خاص انسان کو اپنا نائب مقرر کرکے حکم دیا کہ تم ہماری طرف سے ہماری زمین کے امین ہو اور تمہارا فرض بحیثیت خلیفہ یہ ہے کہ تم سامان رزق کی تنظیم اس طرح کرو کہ ہماری تمام مخلوقات ہماری زمین بلکہ ہماری عطا کردہ تمام نعماً

(بقیہ صفحہ ۴۵۱)

بلکہ خود انسان کا وجود بھی اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک امانت ہے اب ناظرین خود غور کرلیں کہ جب انسان خود اپنے وجود ہی کا مالک نہیں ہے تو وہ دوسری اشیا مثلاً زن، زر اور زمین کا مالک کس طرح ہوسکتا ہے؟ فافہم وتدبر

سے یکساں طور پر منتفع ہو سکیں۔ ہماری نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت زمین ہے۔ اور ہم نے اسے سب کے لئے بنایا ہے[۱] تم ایسا نظام قائم کرو کہ کوئی شخص ہماری زمین پر ناجائز طور سے قابض ہو کر دوسروں کو انتفاع سے محروم نہ کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک شخص تو دو لاکھ ایکڑ زمین کا مالک بن بیٹھے۔ اور اُسی کے بھائی بند نانِ شبینہ کے لئے بھی محتاج ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک شخص کے پاس پچاس کروڑ روپے ہوں اور اسی کے رشتہ دار ضروریاتِ زندگی کے لئے بھی ترستے رہیں مختصر اینکہ رزق کے دو بڑے سرچشمے ہیں۔ مال و دولت اور زمین۔ تم ایسا نظام حکومت قائم کرو جس میں رزق کے ان سرچشموں پر چند افراد قابض نہ ہو جائیں۔ ایسے نظامِ حکومت کو شرعی اصطلاح میں خلافت کہتے ہیں۔

ذیل میں اسلام کے زرعی نظام کا ایک مجمل خاکہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

(۱) قرآن حکیم نے تمام مفتوحہ اشیا کو اللہ کی ملک قرار دیا ہے۔۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ط (۸ ـ ۱)

لوگ آپ سے غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ مالِ غنیمت (زمین اور دولت) اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔

(۲) اس بنا پر مفتوحہ زمین، اللہ کی ملک قرار دی جاتی۔ جو نہ کسی فرد کی ملکیت نہ کسی جماعت کی بلکہ خلیفۂ "امین" ہونے کی حیثیت سے اس کو افراد میں تقسیم کر دینا تھا۔

---

[۱] وَ الْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ط (۵۵ ــــ ۱۰)

اور ہم نے زمین کو عامۃ الناس کے فائدے کے لئے بنایا ہے ۱۲۔

(۳) خلافت راشدہ کے عہد میں حسب ذیل صورتیں مروج تھیں :-

(ا) بعض اوقات خلافت، مفاد عامہ کے لئے افراد کو برائے کاشت زمین دیتی تھی۔

(ب) بعض اوقات خلافت قطعیہ دینے میں نفع خلق سمجھتی تھی۔

(ج) بعض حالتوں میں خلافت خود کاشت کراتی تھی اور پیداوار لوگوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔

(د) بعض اوقات خلافت خود کاشت کراتی تھی۔ اور پیداوار سے اخراجات کی رقم نکال کر بقیہ رقم صاحب زمین کے حوالے کر دیتی تھی۔

یعنی زمین جو در اصل اللہ کی ملکیت ہے خلافت کے قبضہ اور تصرف میں ہوتی تھی۔ اور خلیفہ جس بات میں عوام کا فائدہ دیکھتا تھا اس پر عمل کرتا تھا۔ کیونکہ خلافت ہر شخص کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار تھی۔

(۴) حضرت عمرؓ نے اس آیت کی روشنی میں عراق کی زمینوں کو مجاہدین پر تقسیم نہیں کیا تھا۔ کیونکہ تقسیم سے جاگیرداری نظام پیدا ہونیکا اندیشہ تھا۔

"مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ أَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً" بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ط (۵۹ — ۱۰)

اور جو مال اللہ اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مفت میں دلوا دے (لڑے بغیر) تو وہ حق ہے اللہ کا اور رسول کا اور قرابتداروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور نادار اور مسافروں کا اور یہ حکم اسلئے دیا گیا ہے کہ جو لوگ تم میں مالدار ہیں یہ مال انہیں میں گردش نہ کرتا رہے (یعنی قوم کی دولت صرف چند سرمایہ داروں

میں محدود ہو کر نہ رہ جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام نان شبینہ کو محتاج ہو جائیں گے)

(۵) تاریخ خلافت راشدہ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جائیگی۔ کہ رسول اللہ صلعم اور آپکے خلفائے راشدین نے زمین کی تقسیم و تنظیم میں مفاد عامہ اور نفع خلق ہی کو اصل الاصول قرار دیا تھا۔

(۶) خیبر فتح ہونے کے بعد، پوری زمین اللہ کی ملک قرار دی گئی تھی۔ اور خلافت نے حسب ذیل طریقہ پر اس کی تقسیم و تنظیم کی تھی۔

(ا) زمین کا کچھ حصہ مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا۔

(ب) بقیہ زمین اصلی باشندوں کے قبضہ میں رہنے دی گئی اور ان سے یہ معاملہ طے کیا گیا۔ کہ نصف پیداوار خلافت کی ہوگی۔ نصف کاشت کاروں کی۔

نیز اُن کو اس قانون سے مطلع کر دیا گیا تھا۔ کہ اسلام کی رُو سے زمین دراصل اللہ کی ملک ہے اسلیئے اگر تم میں سے کسی فرد کی جانب سے کوئی بات مفاد عامہ کے خلاف سرزد ہوئی تو خلافت اس شخص کو زمین سے بے دخل کر دے گی۔

نوٹ:۔ اس تصریح سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ زمین درحقیقت اللہ کی ملکیت ہے۔ اللہ کا نائب یا اللہ کے بندوں کے مفاد عمومی کو مد نظر رکھ کر۔ اُسے افراد میں تقسیم کر دے گا اور اگر کسی شخص کا طرز عمل مفاد عمومی کے خلاف ہوگا۔ تو خلافت اپنی زمین اُس شخص سے واپس لے لیگی۔

اقبال بھی یہی چاہتے تھے۔ کہ مسلمان دنیا میں اسلامی نظام حکومت کے قیام کی کوشش کریں۔ جس کی بدولت زمین اور دیگر ذرائع رزق کی ایسی عادلانہ تقسیم و تنظیم ہو سکے گی۔ کہ کوئی کسی کا محتاج نہ ہوگا کیونکہ اسلام کے معاشی نظام کی رو سے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کہ ملک میں چند افراد تو کروڑ پتی بلکہ ارب پتی ہو جائیں۔ اور بقیہ افراد اپنی ضروریات زندگی بھی پوری نہ کر سکیں جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔

(۷) جب بنو نضیر کے اموال پر قبضہ ہو گیا تو رسول اللہ صلعم نے مہاجرین اور انصار دونوں کو جمع کر کے انصار سے خطاب فرمایا یا معشر الانصار! تم جانتے ہو کہ اس وقت مہاجرین کے پاس کچھ مال و دولت نہیں ہے کیونکہ وہ اپنا سب کچھ گھر بار چھوڑ چھاڑ کر یہاں تمہارے پاس آ گئے ہیں۔ اس لئے دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کر لو۔

(الف) یا تو اپنے ذاتی مال کو بنو نضیر کے اموال میں شامل کر لو اور پھر اُس کو تم سب میں یکساں تقسیم کر دیا جائے۔

(ب) یا یہ کرو کہ بنو نضیر کے اموال کو مہاجرین میں تقسیم کر دیا جائے۔

انصار نے اس سوال کا وہ جواب دیا۔ جس کا اس زمانہ کے مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتے یعنی یہ کہ یا رسول اللہ! بنو نضیر کا مال صرف مہاجرین میں تقسیم کر دیجئے۔ اور ہمارے اموال میں سے بھی جس قدر آپ مناسب سمجھیں ہمارے ان بھائیوں کو دے دیجئے۔

ثابت یہ ہوا۔ کہ عہد رسالت و خلافت میں تمام مسلمان زمین اور دولت میں برابر کے شریک تھے۔

(۸) آنحضرت صلعم کی دس سالہ مدنی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اراضی کی تقسیم و تنظیم اس نہج

پر فرمائی تھی۔ جس سے تمام امت کو یکساں طور پر فائدہ پہنچ سکے۔ آپ کے سامنے کسی خاص طبقہ کا مفاد نہیں تھا۔ بلکہ ساری قوم کا عمومی مفاد تھا۔ نیز آپ کی نظر میں ملکیت ارضی کی حیثیت حق استعمال یا حق انتفاع سے زیادہ نہ تھی۔ اور یہ حق بھی اسی وقت تک قابل تسلیم تھا۔ جب تک دوسروں کی حق تلفی نہ ہو۔

آپ نے ایسا معاشی نظام قائم فرمایا تھا۔ جس میں نہ تو ملکیت کی آڑ میں جور و استبداد کی گنجائش تھی[1]۔ اور نہ انسان کو جماعتی شکنجہ میں کس دینے اور اسے اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما سے محروم کر دینے کا امکان[2] تھا۔ بلکہ ہر شخص کو اللہ کی زمین اور دولت سے یکساں طور پر مستفید ہونے کے ذرائع مہیا کر دیئے گئے تھے۔

آج دنیا ملکیت و عدم ملکیت کی بحث میں الجھی ہوئی ہے حالانکہ آج سے تیرہ صدی پہلے اسلام نے اس مسئلہ کو بہترین طریق پر حل کر دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

(الف) ہر شئی کا حقیقی مالک اللہ ہے۔

(ب) ذرائع پیداوار (زمین اور سونا چاندی) مفاد عامہ کے لیئے ہیں۔ نہ کہ تنہا خوری کے لیئے۔

(ج) انسان کی حیثیت مالک کی نہیں ہے بلکہ امین کی ہے اور اس حیثیت سے اس کو زمین سے انتفاع کا حق حاصل ہے۔

چنانچہ سرکار ابد قرار صلعم فرماتے ہیں :-

---

[1] جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام (CAPITALISM) میں نظر آ رہا ہے۔

[2] جیسا کہ اشتراکی نظام (COMMUNISM) میں لازماً ہوتا ہے۔

إِنَّ الْأَرْضَ أَرْضُ اللهِ وَالْعِبَادُ عِبَادُ اللهِ، مَنْ أَحْيَاءَ أَرْضاً مَيِّتَةً فَهِيَ لَهُ (ابو داود شریف)

بیشک ساری زمین اللہ ہی کی ہے اور سب بندے (افراد) اللہ ہی کے بندے ہیں لہذا جو کوئی کسی بنجر زمین کو آباد کرے گا وہی شخص اس پر متصرف ہو جائے گا۔ (وہ اُسی کی ہو جائیگی)

اس حدیث کی شرح میں حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلوی فرماتے ہیں۔

زمین پر آدمی کے حق ملکیت کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ قابض کو دوسروں کے مقابلے میں انتفاع کا زیادہ حق حاصل ہے۔

عہد فاروقی

جب عراق اور شام فتح ہوئے تو فاروق اعظم نے ارکان مجلس شوریٰ کے سامنے یہ تقریر کی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کردوں۔ اور بعد والوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ وہ اس میں سے کچھ بھی حصہ نہ پاسکیں۔؟ کیا آپ لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور اسی طبقہ میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہے۔؟

حضرت علیؓ نے فاروق اعظم کی تائید بایں الفاظ کی :-

مجاہدین میں زمین تقسیم کر دینے سے یقیناً وہ انہی کے خاندانوں میں محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ کاشتکاروں اور

اراضی کو علی حالہ قائم رکھے۔ تاکہ یہ وسیع زمین سب مسلمانوں کیلئے یکساں طور پر معاشی فوائد کا ذریعہ بن سکے۔ اور سب لوگ یکساں مستفید ہو سکیں۔"

فاروق اعظم کے فیصلہ سے ثابت ہوا کہ انہوں نے عراق اور شام کی اراضی مفتوحہ کو اس لئے مجاہدین میں تقسیم نہیں کیا۔ کہ کچھ عرصے کے بعد اسلام میں جاگیردارانہ نظام قائم ہو جاتا اور یہ نظام اسلام کی روح کے خلاف ہے لہذا انہوں نے ان زمینوں کو حکومت کے قبضہ میں رکھا۔ تاکہ جاگیرداروں کا طبقہ پیدا نہ ہو سکے۔

جب عمرو بن عاص نے فاروق اعظم کو مصر کی زمین کے متعلق لکھا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا:۔

اگر میرے سامنے عام مسلمانوں کمزوروں محروموں مفلسوں اور سائلوں کا معاملہ نہ ہوتا۔ تو میں زمین کو تقسیم کر دینے کا حکم دے سکتا تھا لیکن موجودہ حالات متقاضی ہیں کہ مصر کی زمین کو تقسیم نہ کیا جائے بلکہ عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا جائے تاکہ آئندہ نسلیں بے دست و پا ہو کر نہ رہ جائیں۔ؔ[1]

جس طرح آفتاب کی روشنی اور دھوپ بارش ہوا آگ، پانی اور پھل پھول سے ہر شخص نفع حاصل کر سکتا ہے اسی طرح زمین بھی اللہ کی ان نعمتوں میں سے ہے جس سے ہر شخص نفع حاصل کر سکتا ہے اور اسی لئے خلافت اسلامیہ کو ہر وقت اس بات کا احساس رہتا ہے۔ کہ مملکت میں کوئی شخص ننگا یا بھوکا نہ رہے۔

حضور کے وصال کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ فدک جو آپ کے

---

[1] جس طرح آج پاکستان کے ہر خطہ میں عوام بے دست و پا نظر آ رہے ہیں۔

وارثوں کا حق ہے یا خلافت کا؟ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے، جن سے بڑھ کر محرم اسرار نبوت کون ہو سکتا ہے، یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ پیغمبر کے ترکہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی بلکہ جملہ اشیاء، عامۃ المسلمین کے فائدے کے لئے وقف ہوتی ہیں اس لئے ارض فدک خلافت کی ملکیت ہو گئی۔

فاروق اعظم کے اس ارشاد گرامی سے اسلام یا خلافت اسلامیہ کے قائم کردہ معاشی نظام کی روح اپنی پوری تابانی کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر رہی ہے۔

"لو مات کلب علی شاطی الفرات جوعاً لکان عمر مسئولاً عنہ یوم القیمۃ"

دریائے فرات کے کنارے اگر ایک کتا بھی بھوک سے مر جائیگا تو بلا شبہ قیامت کے دن عمرؓ سے اس کے متعلق باز پرس ہو گی۔

اگر حضرت عمرؓ کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے تو ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ اسلام میں جاگیرداری اور زمینداری کی گنجائش کیسے اور کیونکر نکل سکتی ہے

لے یہ فیصلہ حسب ذیل احادیث کی روشنی میں کیا گیا تھا۔

(۱) لا یقتسم ورثتی دیناراً۔ یعنی میرے بعد میرے وارث نقدی تقسیم نہ کریں۔

(۲) لا نورث ما ترکنا صدقۃ۔ یعنی ہم (جماعت انبیاء) کسی کو وارث نہیں بناتے ہمارا ترکہ صدقہ ہے۔ جسے مفاد عامہ کے لئے صرف کیا جائیگا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے صدیق اکبرؓ کے فیصلے کو منسوخ نہیں کیا۔ یعنی ارض فدک حضرات حسنؓ و حسینؓ کو نہیں دیا۔

(دیکھو صحیح مسلم شرح نووی جلد دوم صـ ۹۰)

جس کا سارا تار و پود ہی زبردست آزاری، ظلم و ستم، سفاکی، ایذا رسانی، قتل و غارت، آبرو ریزی، نفرت انگیزی، نفس پرستی، قساوت، سنگدلی، بے رحمی، اور تمام اخلاق رذیلہ اور خصائل بہیمانہ سے مل کر بنا ہے یعنی جو اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کی ضد ہے؟

ایک شبہ اور اس کا ازالہ کا حل۔

ہم دکھا چکے ہیں کہ اسلام نے اپنے زمانہ کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کو ختم کر کے ایک نئے بلکہ عدیم المثال معاشی نظام کی بنیاد ڈالی۔ جس میں زمین یا دولت (سونا چاندی) کی ملکیت کا تصور نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کو امانت قرار دیا گیا ہے۔

لیکن بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے بعض صحابہ کو وسیع قطعہ ہائے زمین (جن کو اصطلاح میں قطائع کہتے ہیں عطا فرمائے تھے۔ (جن کی نوعیت ان لوگوں کی رائے میں جاگیروں کی سی تھی) اس لئے اسلام میں جاگیرداری اور زمینداری ممنوع نہیں ہے۔ اس شبہ کا جواب حسب ذیل ہے،

واضح ہو کہ خلافت الٰہی میں قطائع کی جو نوعیت تھی اس کو مد نظر رکھ کر ان کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ قطائع وہ غیر آباد زمینیں تھیں جو مفاد عامہ کی حفاظت کی خاطر بعض افراد کو دی جاتی تھیں۔ اور ان سے سرکاری ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔

خلیفہ کو قطائع کا دینا جائز ہے خواہ زمین کا مالک بنا دے یا صرف استفادہ کی اجازت دے۔!

زمانہ خلافت میں انہی زمینوں سے قطائع دیئے جاتے تھے جو نہ تو

کسی کے قبضہ میں ہوتی تھیں اور نہ کوئی ان کا مالک یا وارث ہوتا تھا۔ اور نہ وہ ایسی زمین ہوتی تھی جس کے دینے سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ اگر خلیفہ مناسب خیال کرے تو قطعیہ واپس لے لے۔ چنانچہ سرکار ابد قرار صلعم نے بلال بن حارث کو پوری وادی عقیق بطور قطعیہ دے دی تھی۔ لیکن وہ اس کا بڑا حصہ آباد نہ کر سکے۔ اس لئے فاروق اعظم نے ان سے کہا کہ حضور سرکار دو عالم صلعم نے یہ زمین آپ کو آبادکاری کیلئے دی تھی۔ لیکن آپ نے تھوڑا سا حصہ آباد کیا ہے۔ اس لئے بقیہ زمین واپس کر دیجئے انہوں نے کہا۔ یہ قطعیہ مجھے آنحضرت صلعم نے دیا تھا۔ اس لئے میں واپس نہیں کرونگا فاروق اعظم نے فرمایا۔ مگر میں مفاد عامہ کی خاطر اس کو ضرور واپس لونگا۔ چنانچہ بلال بن حارث کو وہ قطعیہ واپس کرنا پڑا۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ حکومت الٰہیہ میں خلیفہ کے سامنے خلق اللہ کا مفاد ہوتا تھا۔ صاحب قطعیہ کو اس پر مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے تھے۔

صدیق اکبرؓ نے حضرت طلحہ کو ایک قطعیہ دیا اور اس پر چند لوگوں کو گواہ بنا کر حکمنامہ ان کے حوالے کر دیا۔ ان گواہوں میں حضرت عمرؓ کا نام بھی تھا۔ جب حضرت طلحہؓ ان کے پاس حکمنامہ پر دستخط کرانے گئے۔ تو اسلام کے معاشی اور اقتصادی اور زرعی نظام کے سب سے بڑے ماہر نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا:۔

اھذا کلہ لک دون الناس؟ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنا بڑا قطعہ اراضی صرف تمہیں مل جائے اور دوسرے لوگ اس سے انتفاع

سے محروم رہیں؟

حضرت طلحہؓ کبیدہ خاطر ہو کر صدیق اکبرؓ کے پاس گئے اور کہا :۔

واللہ ما ادری انت الخلیفۃ ام عمر؟

واللہ میں نہیں جانتا کہ آپ خلیفہ ہیں یا عمر؟

صدیق اکبرؓ نے جواب دیا۔ بل عمرؓ۔ میں نہیں بلکہ عمر ہی خلیفہ ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو ضرور میرے اس حکم میں کوئی بات مفاد عامہ کے خلاف نظر آئی۔ ورنہ وہ دستخط سے انکار نہ کرتے چنانچہ صدیق اکبرؓ نے اپنا حکم منسوخ کر دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم دونوں کے پیش نظر یہ بات رہتی تھی۔ کہ اللہ کی زمین چند افراد کے ہاتھوں میں آکر ان کے عیش و عشرت اور آرام طلبی اور لذت کوشی کا سبب نہ بن جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں امام را باید کہ اقطاع کند (ولے) بقدر حاجت یعنی خلیفہ کو بقدر حاجت لوگوں کو زمین دینی چاہیئے۔

مسنفی شرح موطا صد ۵ ۔

ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حکومت الٰہیہ میں قطائع نہ تو ذاتی اقتدار بڑھانے کے لئے دیتے تھے۔ اور نہ کاشتکاروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مفت خوروں کا طبقہ پیدا کرنے کے لئے۔ بلکہ عامۃ الناس کو فائدہ پہنچانے کے لئے۔ اندریں حالات ہر عقلمند آدمی باسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ کہ موجودہ زمینداری اور جاگیرداری کی شکل زمانہ خلافت کے قطائع سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس نظام میں جاگیردار اور زمیندار ہزاروں ایکڑ زمین کے مالک بن کر مزدوروں کا خون

پڑے رہتے ہیں۔ اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے داد عیش دیتے رہتے ہیں۔ اسی لئے اقبالؒ نے بجا طور پر احتجاج کیا ہے:-

حکم حق ہے لیس للانسان الا ماسعیٰ

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

خلاصہ کلام ایں کہ حکومت الٰہی میں زمین یا جائداد پر کسی کے قبضہ کا مطلب صرف یہ ہے۔ کہ قابض کو بحیثیت "امین" اس سے انتفاع کا حق حاصل ہو۔ یہ امانت اس کے قبضہ میں صرف اس وقت تک رہ سکتی ہے جب تک وہ شخص خلق اللہ کے مفاد میں خلافت کا ہاتھ بٹا سکے۔ اور ایسی فضا پیدا کرنے میں خلافت کی مدد کرے جو خلق اللہ کی خوشحالی اور فارغ البالی کی ضامن ہو۔ لیکن اگر وہ شخص امانت میں خیانت کرنے لگے تو خلافت، اسے بلا تامل بے دخل کر دے گی۔

تیسری فصل

تقسیم دولت

قرآن حکیم نے بنی آدم کی دنیوی زندگی سنوارنے اور پرامن بنانے کے لئے جو نظام مدوّن کیا ہے۔ اس کا نمایاں پہلو تقسیم دولت ہے یعنی دولت کو عوام میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ وہ صرف دولتمند طبقہ کے افراد ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ط (۵۹ - ۷)

تاکہ وہ مال انہی لوگوں میں گردش نہ کرتا رہے جو تم میں سے دولتمند ہیں۔

قرآن حکیم نے سرمایہ داری اور ذرائع معاش پر کسی خاص گروہ کی اجارہ داری کے خلاف متعدد دلائل دیئے ہیں مثلاً

(۱) انسانوں میں بعض افراد ایسے بھی ہیں جن کو وہ قوی حاصل نہیں ہیں جن کی بدولت وہ اسباب معاش حاصل کر سکیں

سرمایہ دار کہتے ہیں کہ کمزور کو اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم اپنی ناقص الاعضا اولاد کو قتل کر دیتے ہو؟ اگر نہیں تو خدا کی کمزور اولاد کو کیوں فنا کر دیا جائے۔

الغرض چونکہ ناقص الاعضا افراد کا کوئی قصور نہیں ہے لہٰذا دولتمند افراد کا فرض ہے کہ ان کی کفالت کریں اور یہی قرآن وحدیث کا حکم ہے۔ قرآن حکیم فرماتا ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ ط (۴۳ - ۳۲)

ہم نے ہی تقسیم کی ان کے درمیان ان کی روزی دنیاوی زندگی میں اور بلند کئے۔ بعض کے مرتبے بعض پر

اس سے معلوم ہوا کہ انسانوں میں فطری تفاوت موجود ہے۔ اس لئے اسباب معیشت سے انتفاع میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے یعنی مشیت ایزدی یہ تو ٹھیک ہے کہ کسی کو اسباب معیشت زیادہ حاصل ہیں۔ کسی کو کم۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طبقہ اسباب معیشت سے قطعاً محروم

ہو جائے۔ صاحب قوی اور اپاہج دونوں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔
لہذا جن لوگوں کو زیادہ دولت کمانے کے مواقع حاصل ہیں ان کا فرض ہے
کہ وہ محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کریں۔ قرآن فرماتا ہے۔ کہ
دولتمندوں کی کمائی میں ان لوگوں کا بھی حق ہے جو کمانے سے معذور ہیں

انفرادی ملکیت جائز ہے مگر اسی وقت تک جب تک آپ
قومی فرائض مستعدی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اگر آپ اپنی دولت
میں سے محتاجوں کو ان کے حق نہیں دیتے تو اسلام آپ کی دولت کا کچھ
حصہ آپ سے بجبر وصول کر کے محتاجوں میں تقسیم کر دیگا۔

اسلامی نظام میں انفرادی حقوق اور ذاتی ملکیت کی حدود مقرر ہیں
اگر کوئی شخص ان حدود سے تجاوز کرے گا۔ تو حکومت الٰہیہ اس سے
باز پرس کرے گی۔

اسلام کسی شخص کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ دولت کے بل بوتے
پر دوسروں کو اپنا غلام بنائے۔ کیونکہ اس صورت میں کوئی شخص بھی توحید
کے اقتضاء پر عمل نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دستورِ حیات
کی حقیقت سے اسلام ختم ہو جائیگا۔ اسی لئے اللہ فرماتا ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ج فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ
رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ط اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ
يَجْحَدُوْنَ؟ (۱۶ - ۷۱)

اور اللہ نے (اپنی مصلحت سے) تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی
ہے اور (ان حالات یہ بات کس قدر مذموم ہے کہ) وہ لوگ جن کو برتری دی
گئی ہے۔ اُن لوگوں کا رزق انہیں واپس نہیں دیتے جو اُن کے زیردست

ہیں تاکہ وہ بھی (اسباب معیشت کے لحاظ سے) اُن کے برابر ہو جائیں۔

مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ جن کو نسبتاً زیادہ روزی دی گئی ہے ان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے زیردستوں کو ان کا رزق واپس کر دیں کیونکہ اسباب معیشت میں تفاوت کے باوجود حق معیشت میں سب انسان برابر ہیں۔ یعنی زندہ رہنے کا حق سب کو یکساں طور پر حاصل ہے اگر کوئی دولتمند اپنی دولت محتاجوں میں تقسیم نہیں کرتا تو اسلامی حکومت اس دولتمند کو تقسیم دولت پر مجبور کر سکتی ہے تاکہ نظام معاشرت درہم برہم نہ ہو جائے۔ چنانچہ خلافت فاروقی میں ایک شخص محتاج تھا۔ حضرت عمرؓ نے جب اس کے حالات کی تفتیش کی تو معلوم ہوا۔ کہ اس کے چچا زاد بھائی دولتمند ہیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان دولتمند افراد کے خلاف مقدمہ چلایا جائے اور فرمایا۔ الغُرمُ بالغُنمِ۔ یعنی جو فائدہ حاصل کرنے کے متمنی ہوں وہ بشرط ضرورت تاوان بھی انہیں کو دینا ہو گا مطلب یہ ہے۔ کہ اس محتاج کے پاس اگر مال ہوتا تو اس کی وفات کے بعد اس کے چچا زاد بھائی اس مال کے وارث یا حقدار ہوتے تو پھر اس کے افلاس میں وہ اس کے شریک حال کیوں نہیں ہوتے؟ فاروقِ اعظمؓ کے اس طرز عمل سے ناظرین خود فیصلہ کر لیں۔ کہ اسلام کے معاشی نظام کی روح کیا ہے؟ تقسیم دولت یا سرمایہ داری؟

چنانچہ قرآن حکیم اس باب میں یہ فیصلہ صادر کرتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ط

اور وہ لوگ (اللہ کی نظروں میں محبوب ہیں) جن کے اموال میں سائل اور محروم کا حق مقرر ہے۔ یعنی جو لوگ اپنی دولت میں سے سائل اور محروم کو اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہی لوگ اللہ کی نگاہ میں نکوکار

اور اس کے نیک بندے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ جو دولت مند اپنی دولت میں سے سائل اور محروم کو دیتا ہے۔ وہ اس پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے اس کی دولت میں سائلوں اور محتاجوں کا بھی حق ہے۔ کیونکہ اس کی دولت اس کی ملکیت نہیں ہے۔ اگر اللہ اس کو دوسروں کے مقابلہ میں حصول دولت کے زیادہ ذرائع نہ دیتا۔ تو وہ اتنی زیادہ دولت ہرگز نہ کما سکتا۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ دولتمند کی دولت میں ان لوگوں کا حصہ ہے۔

(۱) جو حصول دولت کے لئے قوی تو رکھتے ہیں۔ مگر کسی حادثہ کی وجہ سے اکتساب دولت سے "محروم" ہو گئے ہیں۔ (ان کو محروم قرار دیا)

(۲) جو ناقص الاعضاء ہیں اس لئے دولت کما ہی نہیں سکتے۔ (ان کو سائل قرار دیا)

دوسری آیت اس سے بھی واضح ہے:۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا (۱۷ - ۲۶)

اور دیا کر قریبی رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی مت کر۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اقربا، مساکین اور بے زادراہ مسافروں کا دولتمندوں کی دولت پر حق ہے اگر وہ ان کو اپنی دولت میں سے دینگے تو ان پر کوئی احسان نہیں کریں گے بلکہ اپنا فرض ادا کریں گے

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ محض قرابت ہی دلیل استحقاق نہیں ہے بلکہ افلاس اور احتیاج بھی دلیل استحقاق ہے۔ چونکہ ناداری یا مفلسی استحقاق کی اصلی علت ہے۔ اس لئے یہ علت جہاں پائی جائے گی دولتمندوں کو وہیں اپنی دولت میں سے صاحبان استحقاق کو ان کا حق دینا پڑیگا۔ علت اعانت، قرابت نہیں ہے۔ بلکہ افلاس ہے۔

تیسری بات یہ ہے لفظ مسکین اور ابن السبیل میں عمومیت کی شان پائی جاتی ہے۔ اس لئے مسلمان پر واجب ہے کہ وہ بلا امتیاز مذہب و نسل و قوم و وطن، تمام محتاجوں کے ساتھ یکساں حسن سلوک کرے قرآن حکیم فرماتا ہے کہ رزق کی فراخی اور تنگی اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کی روزی چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ جس کی روزی فراخ ہو جاتی ہے۔ اس فراخی کے ساتھ ساتھ اس پر ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے۔ یعنی اللہ دولتمندوں سے چاہتا ہے کہ وہ مفلسوں کی امداد کریں کیونکہ تقسیم دولت ہی میں قومی فلاح مضمر ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ط ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ز وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۰: ۳۸)

پس تم پر لازم ہے کہ رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں کو ان کا حق خوشی کے ساتھ دو۔ یہ فعل بہت بہتر ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو طالب رضائے الٰہی ہیں اور دیکھی بات ہے کہ وہی لوگ مقصد حیات میں کامیاب ہونگے ۱۲

تقسیم دولت کے لئے قرآن حکیم نے جو جامع اور مانع اصطلاح استعمال کی ہے وہ انفاق فی سبیل اللہ یا محض انفاق ہے۔ اور کلام اللہ نے اس پر اس قدر زور دیا ہے کہ اگر بعض آیات الٰہی نہ ہوتیں جن میں وصیت

کا حکم دیا گیا ہے (اور وصیت کے لئے پس انداز کرنا شرط ہے) تو انفاق کا مطلب یہ ہوتا کہ اللہ تو جس قدر عطا فرمائے سب خرچ کر دو کل (آئندہ) کے لئے کچھ پس انداز مت کرو[۱]

اسلام نے انفاق پر اس لئے زور دیا ہے۔ کہ اس کے بغیر قومی زندگی کا قیام ناممکن ہے۔ اور اسلام جیسا کہ صاحبان علم پر روشن ہے محض پوجا پاٹ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اپنی ساخت اور ترکیب (روح) کے اعتبار سے وہ ایک مخصوص ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا دوسرا نام ہے۔

---

۱ اگرچہ قرآن و حدیث سے (Emergency) کے لئے پس انداز کرنے کی اجازت ہے کیونکہ اچانک یا غیر متوقع ضرورت ہر شخص کی زندگی میں پیدا ہوتی رہتی ہے مگر جو صاحبان عزیمت ہیں ان کا طرز عمل ارباب رخصت سے جدا ہے چنانچہ سرکار ابد قرار صلعم اور آپ کی اتباع میں حضرات خواجگان چشت نے ساری عمر Tomorrow آئندہ کے لئے پس انداز نہیں کیا۔ ہمارے علماء اور فقہاء صرف لفظ تزکیہ کا لغوی مفہوم بیان کرنے پر اکتفا فرماتے ہیں۔ لیکن صوفیائے کرام اُس مفہوم پر عمل کرتے ہیں یعنی بالفعل اپنے دل کو دولت کی محبت سے پاک کر لیتے ہیں عالم اور عاشق میں بس یہی فرق ہے۔ ۲۰؛

شعبہ ہائے انفاق

(ا) ایتائے زکوٰۃ :-

یہ ایک مقررہ ٹیکس ہے۔ جو اللہ کی طرف سے اغنیاء کی دولت پر عاید کیا گیا ہے۔ دولتوں کی حسب ذیل صورتیں ہیں :-

سونا چاندی، مال تجارت، چوپائے، زمین اور کان کی پیداوار۔

(ب) ایتائے جزیہ :-

یہ وہ ٹیکس ہے۔ جو دولتمند غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے۔ عیسائیوں نے خواہ مخواہ اس جائز قانون کو مذموم شکل میں پیش کیا ہے۔ مقصد اس کا غیر مسلموں کی تذلیل نہیں ہے۔ بلکہ ناداروں کی پرورش کا سامان مہیا کرنا۔ اگر اس کا مقصد توہین ہوتا۔ تو فاقد الاسباب اور فاقد القویٰ غیر مسلموں سے بھی وصول کیا جاتا۔ مگر تاریخ سے ثابت ہے۔ کہ جزیہ صرف صاحب حیثیت یعنی دولتمند غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا۔ جزیہ کا فلسفہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت غیر مسلموں کی جان اور مال کی ذمہ دار ہوتی ہے اس لئے ان کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی امداد کریں۔ تاکہ وہ ان لوگوں کو تنخواہ دے سکے جو ملک کی حفاظت کرتے ہیں

(ج) احسان :-

بنی نوع آدم کے ساتھ نیک سلوک کرنا ہر دولتمند مسلمان کا فرض ہے یا یوں سمجھو کہ اسلامی حکومت کا قانون ہے۔ اس کے تحت حسب ذیل افراد آتے ہیں۔

والدین، اُن کے والدین، ذی القربیٰ، ازدواج، اولاد، خدام، احباب یتامیٰ اور مساکین وغیرہ۔ واضح ہو کہ حسن سلوک کے اعتبار سے کافر اور مومن میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔

(۵) مضاربت :۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ داروں سے نقد روپیہ وصولی کر کے ایک جگہ جمع کیا جائے۔ اور ان کو اس کی حفاظت کا یقین دلا کر مفلس کارکنوں کو وہ رقم دی جائے۔ تاکہ وہ مفید کاموں میں صرف کریں۔

(۶) وصیت :۔

دولتمندوں کو اجازت ہے کہ اپنے اموال کے بارے میں حسب مرضی وصیت کر سکتے ہیں۔

تقسیم ترکہ :۔

(۷) اس کا مطلب یہ ہے کہ متوفی کی پس ماندہ دولت صرف بڑے بیٹے کو نہ ملے بلکہ اس کے تمام اقربا میں تقسیم کر دی جائے۔ تاکہ سرمایہ داری پیدا نہ ہو سکے۔ یا وہ دولت چند افراد میں محدود نہ ہو جائے۔ چنانچہ اکتناز کی مذمت میں یہ آیت نص قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (۹ - ۳۴ - ۳۵)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے رہتے ہیں اور اسکو (مطلقاً) خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو اے رسول! ان کو عذاب دردناک کی خوشخبری سنا دو جس دن اس سونے چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر اس سے ان کے ماتھے اور ان کی کردنیں اور ان کی پیٹھیں داغی جائینگی۔ اور ان سے کہا جائے گا۔ کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لئے دنیا میں جمع کیا تھا۔ تو آج اپنے جمع کئے ہوئے مال کا مزہ چکھو ۱۲۰

(ب) اس آیت میں قرآن حکیم نے سرمایہ داری (اکتناز) کے بدترین نتائج واضح کر دیئے ہیں۔ اور جس طرح اکتناز ممنوع ہے اسی طرح تبذیر و اسراف یعنی فضول خرچی بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ط اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (۱۷۔۲۷)

اور فضول خرچی مت کر۔ بلاشبہ فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔

ان دو آیتوں کی روشنی میں یہ صداقت نکھر کر سامنے آگئی کہ مسلمان

(۱) نہ تو اپنی دولت کو جمع کر کے رکھ سکتا ہے۔

(۲) اور نہ وہ اسے فضول خرچی میں ضائع کر سکتا ہے۔

تو صرف ایک ہی صورت اسکے لئے باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اسے اللہ کی راہ میں صرف کر سکے یعنی انفاق فی سبیل اللہ اور وہ ہمہ مقدار فرض ہے۔

(ج) صدقات (اموال زکوٰۃ) کا مصرف قرآن حکیم نے یہ بتایا ہے

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط (۹۔۶۰)

صدقہ کا مال (یعنی مال زکوٰۃ) اور کسی کے لئے نہیں ہے صرف فقیروں کے لئے ہے۔ اور مسکینوں کے لئے۔ اور ان کے لئے جو اس کی وصولی پر مقرر رکئے جائیں۔ اور وہ کہ ان کے دلوں میں (کلمہ حق کی) الفت پیدا کرنی ہے۔ اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے اور قرضداروں کا قرض ادا کرنے کے لئے۔ جو ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے مثلاً مجاہدین یا مبلغین اسلام کی ضروریات پوری کرنے کے لئے۔ اور

مسافروں کے لئے، جو مفلسی کی وجہ سے اپنے وطن نہیں جا سکتے)

جس طرح اکتناز کا نتیجہ فساد ہے اسی طرح انفاق کا نتیجہ اصلاح قوم ہے اور چونکہ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو ضروریات زندگی حاصل ہو سکیں۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کو اکتناز سے روکا ہے اور انفاق کا حکم دیا ہے۔

بلکہ اللہ تو مسلمانوں سے یہ فرماتا ہے:۔

(ط) وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ط (۷۳ - ۲۰) اے مسلمانو اللہ کو قرض حسنہ دو۔

واضح ہو کہ یہ سورۃ (یعنی سورہ مزمل ترتیب نزولی کے لحاظ سے قرآن کی دوسری سورۃ ہے۔ یعنی انفاق سبیل اللہ اسلام کا پہلا حکم ہے۔ (نماز پنجگانہ تو شب معراج میں فرض ہوئی تھی)) اور سچ بھی ہے جب تک معاش کی طرف سے اطمینان نہ ہو نماز میں بھی لطف نہیں آسکتا۔

(ی) امداد باہمی:۔ قرآن حکیم مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ جان سے مال سے اور اخلاق سے۔

واضح ہو کہ شرکت (co-operation) کے لئے قرآن حکیم نے دو لفظ استعمال فرمائے ہیں۔ (۱) بر (۲) تقویٰ جیسا کہ آیت ذیل سے ثابت ہے۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ - یعنی نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔

اسلامی فقہ میں شرکت کی مختلف اقسام قرار دی گئی ہیں تاکہ مختلف طبقات کے لوگ (شرکت میں) حصہ لے سکیں۔ بعض شرکتیں ایسی ہیں جن میں تمام شرکا ء غریب ہی ہوں گے۔ یہ اس لئے کہ اگر کسی شرکت

میں چار پانچ بڑے بڑے سرمایہ دار بھی شریک ہو جائیں۔ تو لوٹ پھیر کے سارا نفع انہی کو ملے گا۔ اسی لئے فقہاء نے شرکت کی حسب ذیل اقسام قرار دی ہیں۔

شرکت المفاوضہ، شرکت الوجوہ، شرکت الصنائع اور شرکت العنان مضاربت بھی اسی شرکت ہی میں داخل ہے۔

(ک) دولتمندوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غریبوں کو صدقہ دیں، ہدایا دیں اپنی دولت کا کچھ حصہ ہبہ کر دیں (عطا یا بخشش) اور قرض دیں۔ لیکن اگر کوئی دولت مند نہ ہدیہ دے سکتا ہے بخشش کر سکتا ہے نہ قرض دے سکتا ہے تو چوتھی صورت یہ ہے کہ اس کی دولت کو چند مزدوروں کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ اپنی محنت اپنا دماغ اور اپنا وقت صرف کریں اور اس طرح منافع دولتمند اور مزدور دونوں میں تقسیم ہو جائے۔ یہ مضاربت ہے

(ل) وصیت:۔ قرآن حکیم دولتمندوں کو حکم دیتا ہے کہ ساری عمر اپنی دولت اللہ کی راہ میں صرف کرتے رہو بلکہ مرتے وقت بھی وصیت کر جاؤ کہ میرے بعد میری دولت کا ⅓ حصہ اللہ کی راہ میں صرف کیا جائے بقیہ ⅔ وارثوں میں تقسیم ہو جائے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ (۲ - ۱۱۰)

فرض کر دیا گیا ہے تم پر کہ جب تم میں سے کسی کی موت آ پہنچے۔ اگر وہ چھوڑے مال تو وصیت کر جائے ماں باپ اور رشتہ داروں کے واسطے مناسب طور پر ہم نے متقی لوگوں پر یہ بات فرض کر دی ہے۔

(م) وراثت:۔ مقصد اس کا بھی یہی ہے کہ متوفی کی دولت مختلف افراد میں تقسیم

ہو جانے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴ - ۷)

مردوں کے لئے حصہ ہے۔ اس میں جو چھوڑا والدین اور قریبی رشتہ داروں نے اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے۔ اس میں سے جو چھوڑا والدین اور قریبی رشتہ داروں نے خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت۔ یہ حصے مقرر کئے گئے ہیں۔

خلاصہ کلام اینکہ قرآن کا معاشی نظام انفاق فی سبیل اللہ پر مبنی ہے اور اسی لئے وہ دولتمندوں سے مختلف صورتوں میں دولت وصول کر کے محتاجوں اور مسکینوں اور حاجتمندوں میں تقسیم کرتا رہتا ہے تاکہ

(ا) دولت صرف اغنیاء میں گردش نہ کرتی رہے بلکہ

(ب) عامۃ الناس اس سے مستفید ہوتے رہیں۔

قرآن و حدیث سے تقسیم دولت کی حسب ذیل صورتیں ثابت ہیں۔

(۱) زکوٰۃ (۲) جزیہ (۳) ہدیہ (۴) ہبہ (۵) عاریت (۶) احسان (۷) انفاق فی سبیل اللہ (۸) صدقات (۹) قرضہ حسنہ (۱۰) ترکہ۔ (۱۱) فئے (۱۲) غنیمت (۱۳) خمس (۱۴) عشر (۱۵) شرکت (۱۶) مضاربت (۱۷) نان و نفقہ ازواج (۱۸) وصیت (۱۹) وراثت۔ (۲۰) تالیف قلوب۔

خلاصۂ مباحث

قارئین کی سہولت کے لئے گزشتہ مباحث کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ اس کائنات کا خالق، رازق، مالک اور حاکم ہے۔

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۞ (۱۳-۱۶)

(کہہ دیجئے) اللہ ہی ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ اکیلا (لاشریک) اور زبردست ہے۔

(۲) اس نے یہ کائنات ایک مقصد کے لئے پیدا کی ہے۔

مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞ (۴۴-۳۹)

(اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیلتے ہوئے) نہیں پیدا کیا ہم نے ان کو مگر ایک غرض اور مصلحت سے لیکن اکثر لوگ اس بات سے واقف نہیں ہیں۔

(۳) اس نے انسان کو بھی ایک مقصد کے لئے پیدا کیا ہے

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (۲۳-۱۱۵)

پس کیا تم نے خیال پیدا کر لیا تھا کہ ہم نے تم کو یونہی بیفائدہ اور بیکار پیدا کیا تھا۔ اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے

(۴) اس نے انسان کو اپنا نائب بنایا ہے تاکہ وہ اس کائنات میں اس کا قانون نافذ کر سکے۔ تاکہ اس کے بندے غیر اللہ کی اطاعت نہ کریں۔

اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ط (۲-۳۰)

جب اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانیوالا ہوں۔

(۵) اس لئے ساری کائنات کو اس کا خادم بنا دیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط (۴۵ - ۱۳)

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو تمہارا تابع فرمان بنا دیا۔

(۶) انسان کو نیکی اور بدی میں سے کوئی ایک راستہ اپنے لئے منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اس سے باز پرس ہوگی۔

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (۸۸ - ۲۶)

بیشک ہماری ہی طرف انہیں لوٹ کر آنا ہے۔ اور پھر ہمارے ہی ذمہ اُن سے حساب لینا ہے۔

وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ط (۵۳ - ۴۰ - ۲)

اور بلا شبہ ان کی کوشش (کارگزاری) آگے چل کر (قیامت کے دن) دیکھی جائیگی۔ اور اس کو اس کا پورا پورا بدلہ ملیگا۔ اور آخر کار سب کو خدا تک پہنچنا ہے۔

(۷) یہ زندگی ابتلاء اور آزمائش ہے۔ اور جو کچھ اُس نے دیا ہے وہ بھی آزمائش ہی کی غرض سے دیا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ نِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط (۶۷ - ۱ و ۲)

بابرکت ہے۔ وہ ذات جس کے ہاتھ میں ساری خدائی ہے۔ اور ساری کائنات پر جس کی فرمانروائی ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ یہ بات آزمائے کہ تم میں کون زیادہ اچھا ہے۔ بلحاظ اعمال۔

(۸) اموال اور اولاد (اس لئے عورت اور زمین بھی) انسان کے حق میں فتنہ (آزمائش) ہیں کیونکہ زن، زر اور زمین ہی کے لئے وہ خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات انسان عورت اور اولاد کی محبت میں بالکل اندھا ہو جاتا ہے۔ اور خدا، رسول، اور شریعت تینوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں تنبیہ فرمایا ہے کہ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ط (۶۴ - ۱۴ - ۱۵)

اے ایماندارو! تمہاری بیویوں اور اولادوں میں سے بعض تمہارے دین کے دشمن ہیں۔ اس لئے ان سے احتیاط کرتے رہو۔ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے حق میں نرا جنجال (آزمائش ہے)

مطلب صاف ہے۔ کہ جن عورتوں اور بال بچوں کی خاطر تم اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی نافرمانی کر بیٹھتے ہو وہ بلاشبہ تمہارے حق میں تمہارے دشمن ہیں بیوی ہو یا اولاد جس کسی کی خاطر انسان اللہ سے غافل ہو جائے وہ بلاشبہ اُس کے حق میں دشمن ہے۔

دوسری آیت میں مال اور اولاد کو آزمائش قرار دیا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ ہم نے تمہیں دولت اولاد اس لئے دی ہے کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم ان سے زیادہ محبت کرتے ہو یا ہم سے؟

(ب) وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ط (۸ ۔ ۲۸)

آگاہ ہو جاؤ کہ بلا شبہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد تمہارے حق میں آزمائش ہے۔

(ج) وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ ط (۶ ۔ ۱۶۵)

اور اللہ ہی وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں اپنا نائب بنایا اور بلند کئے تم میں سے بعض کے بعض پر درجے تاکہ وہ تمہیں ان نعمتوں کے ذریعہ سے آزمائے۔ جو اُس نے تمہیں عطا کی ہیں۔ مثلاً زن، زر، زمین)

(۹) اس حقیقت کو واضح کر دینے کے بعد کہ دولت ذریعہ آزمائش ہے، بالفاظ دیگر قرآن کی رو سے دولت نہ تو مذموم ہے نہ مقصود ہے۔ بلکہ آزمائش ہے۔ اللہ نے اس بات کو بھی ہمارے ذہن نشین کر دیا کہ مطلوب وہ ہے جو مال و دولت کے حصول میں ہم سے غافل نہ ہو جائے یعنی دولت کو مقصود حیات نہ بنا لے۔ بلکہ اُسے ہماری خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے۔

یعنی اس لئے کمائے کہ ہماری راہ میں اس کو خرچ کرے گا۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۲۴ ۔ ۳۷)

اللہ کے بندے وہ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت (دولت) ہماری یاد سے غافل نہیں کرتی۔

(۱۰) یاد الٰہی سے غفلت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری زندگی پریشانی میں گزرتی ہے۔ یعنی اطمینان قلب جو مقصود ہے۔ زائل ہو جاتا ہے۔ کروڑ پتی

لوگوں کی زندگی اس صداقت پر شاہد عادل ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ط (۲۰ - ۱۲۴)

اور جو شخص میری یاد سے روگردانی کریگا۔ تو بلاشبہ اُس کی زندگی تنگی اور پریشانی میں بسر ہوگی۔ اور ہم قیامت کے دن اُسے اندھا اٹھائینگے۔

(۸) اس سلسلہ میں آخری تنبیہہ۔

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (۵ - ۱۰۵)

اے ایماندارو! اپنے نفس کی محافظت کرو۔ عاقبت سے غافل مت ہو۔

(۱۲) قرآن حکیم نے خدا، انسان اور کائنات کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی رو سے یہ حقیقت بالکل مبرہن ہے۔ کہ دراصل انسان کسی شئی کا بھی مالک نہیں ہے۔ کائنات اور اس کی ہر شے کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے [1] ملکیت کے جس قدر حقوق اس کو حاصل ہیں۔ وہ سب مالک حقیقی کی طرف سے عطا ہوتے ہیں۔ یعنی جن چیزوں (زر، زن، زمین) کو وہ اپنی ملک سمجھتا ہے۔ وہ دراصل "امانت" ہیں۔ اور وہ ان کا امین ہے مالک نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ ارشاد فرماتا ہے۔

---

[1] غور سے دیکھو تو انسان اپنی دولت اور جائداد کا تو کیا مالک ہوگا وہ تو خود اپنی جان کا بھی مالک نہیں ہے۔ وہ دوسروں کا تو کیا مالک ہوگا۔ خود اپنا بھی مالک نہیں ہے۔ جس طرح حقیقی معنی میں اللہ ہی مالک ہے اسی طرح حقیقی معنی میں صرف اللہ ہی موجود ہے لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کہ لاموجود الا اللہ قرآن کی رو سے صرف

اللہ الحق ہے یعنی بذات خود موجود ہے۔ یعنی صرف وہی واجب الوجود ہے
اس کے علاوہ ساری کائنات ممکن الوجود ہے۔ یعنی اس کے موجود کرنے
سے موجود ہوئی ہے۔

مگر ایک شخص پر وحدت الوجود کا مفہوم منکشف ہو جاتا ہے تو وہ کبھی
بھی دنیا کی کسی شے کو اپنی ملک قرار نہیں دے سکتا۔ کیونکہ جب وہ خود اپنی
جان کا مالک نہیں ہے۔ تو کسی شے کا مالک کب اور کیسے ہو سکتا ہے؟

قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ط سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۔ قُلْ
مَن رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ٥ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ط قُلْ
مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ط

اے رسول، آپ ان لوگوں سے دریافت کیجئے۔ کہ یہ زمین کس کی ہے۔ اور
اس میں جس قدر مخلوق ہے وہ کس کی ہے اگر تمہیں علم ہے تو بتاؤ۔
وہ یقیناً جواب دیں گے کہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے وہ ہی اس کائنات
کا مالک ہے۔ آپ ان سے پوچھئے۔ کہ کون ہے رب ساتوں آسمانوں
کا اور کون ہے۔ رب عرش عظیم (ساری کائنات) کا؟ وہ کہیں گے۔
کہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ (یعنی ہر شے کا مالک وہی ہے) آپ
ان سے پوچھئے کون ہے وہ۔ جس کے قبضہ قدرت میں ہے حکومت
اور فرمانروائی ہر شے پر؟ وہی سب کو پناہ دیتا ہے (۲۳۔۸۴۔۸۸)
اور اس کے مقابلے میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا ان آیات سے ثابت ہوا کہ
رب اللہ ہی اس کائنات کا مالک ہے (اس لئے کوئی شخص کسی شے کا
مالک نہیں ہے

(ب) [illegible] کی حیثیت سے (لہذا کوئی شخص حقیقی معنی میں زمین کا مالک

نہیں ہو سکتا)

(ج) وہ ساری کائنات کا رب ہے۔ یعنی سب کو رزق دینے والا ہے۔ اس لئے رزق کے سرچشمے کسی انسان کے قبضہ میں نہیں ہو سکتے۔

(د) وہی ساری کائنات پر حاکم ہے۔ اس لئے کوئی انسان اللہ کے بندوں پر حکمران نہیں ہو سکتا۔

(۱۳) لہذا جس انسان کے پاس دولت یا زمین ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے۔ بلکہ امین ہے۔ وہ ان چیزوں سے انتفاع کر سکتا ہے۔ مگر ان پر اپنی ملکیت قائم کرکے دوسروں کو انتفاع سے نہیں روک سکتا۔

مثال کے طور پر انسان زراعت کرتا ہے۔ اور غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ جو زمین سے پیدا ہوا ہے۔ یہ میں نے پیدا کیا ہے اور میں اس کا مالک ہوں۔ حالانکہ حقیقی زراع وہ نہیں ہے بلکہ اللہ ہے دیکھئے قرآن حکیم کیا فرماتا ہے۔

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ۝ أَفَرَءَيْتُمُ ٱلْمَآءَ ٱلَّذِى تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ ٱلْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنزِلُونَ ۝ أَفَرَءَيْتُمُ ٱلنَّارَ ٱلَّتِى تُورُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنشِـُٔونَ ۝ (۵۶ - ۶۳ تا ۷۲)

بھلا دیکھو تو سہی کہ تم لوگ جو کھیتی کرتے ہو۔ کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ ہم چاہیں تو کوئی آفت نازل کرکے پکنے سے پہلے ہی اس کو چورا چورا کر دیں۔ اور تم باتیں بناتے ہی رہ جاؤ۔ کہ ہم تو تاوان میں آگئے۔ بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹ گئے۔ بھلا دیکھو تو یہ پانی جو تم پیتے ہو کیا اس کو بادل سے تم نے برسایا ہے۔ یا ہم برساتے ہیں۔ ہم چاہیں تو اس کو ایسا کھاری کر دیں کہ زبان پر بھی نہ رکھا

جانے تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ بھلا دیکھو! تو سہی یہ آگ جو تم سلگھتے اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے۔ یا ہم اس کے پیدا کرنے والے ہیں؟

اللہ صاف لفظوں میں فرماتا ہے کہ زارع (کھیتی اگانے والے) تم نہیں ہو۔ بلکہ ہم ہیں۔ آئندہ آیتوں میں اس دعویٰ پر دلائل پیش کئے ہیں مثلاً:

(ا) زراعت کے لئے زمین پہلی شرط ہے اور وہ اللہ کی مخلوق اور اس کی ملک ہے۔

(ب) دوسری شرط آفتاب ہے اور وہ اللہ کی ملک ہے۔

(ج) تیسری شرط پانی ہے اور وہ بھی اسی کی ملک ہے۔

(د) چوتھی شرط بیج ہے اور وہ بھی اللہ ہی کا عطیہ ہے۔

(ہ) پانچویں شرط بیل ہے وہ بھی اللہ کا مخلوق ہے۔

(و) چھٹی شرط مناسب حالات ہیں وہ بھی اللہ کے قبضہ میں ہیں چنانچہ وہ خود فرماتا ہے کہ تم اپنی محنت یا کوشش پر ناز مت کرو۔ کیونکہ اگر ہم چاہیں تو تمہارے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیں۔ اگر ہم چاہیں تو تمہاری لہلہاتی ہوئی کھیتی کو تہس نہس حطام کر کے رکھ دیں۔ زمین ہماری دھوپ اور گرمی ہماری پانی ہمارا، بیج ہمارا۔ بیل ہمارے، حالات ہمارے قبضہ میں، اب رہے تم تو تم بھی ہمارے اندر ہیں حالات خود غور کر کے فیصلہ کر لو۔ کہ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ؟ سوچ سمجھ کر خود ہی جواب دو کہ کیا تم کھیتی اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔

درحقیقت زارع کون ہے؟ تم یا ہم؟

پس اگر حقیقی زارع ہم ہیں تو پھر تم ہمارے پیدا کردہ اناج کو گوداموں

میں ذخیرہ کیوں کرتے ہو ؟ (اسی کو اصطلاح شریعت میں احتکار کہتے ہیں) اور ہمارے بندوں کو ہمارے پیدا کردہ اناج سے کیوں ترساتے ہو ؟ ہماری امانت میں خیانت کیوں کرتے ہو ؟ بالفاظ واضح تر "بلیک مارکیٹ" کیوں کرتے ہو ؟

زمین ہماری، پانی ہمارا، گرمی ہماری، بیج ہمارا، بیل ہمارے، تم ہمارے، تمہارا اناج ہمارا، تمہارے ہاتھ پاؤں ہمارے، جب سب کچھ ہمارا ہے تو یہ اناج تمہارا کیسے ہو گیا ؟ جب زارع ہم ہیں تو تم زراعت کے مالک کیسے بن بیٹھے ؟

ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ؟

(۱۷) بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ انسان کسی چیز کا بھی مالک نہیں ہے مالک حقیقی اللہ ہے انسان امین ہے چنانچہ یہ صداقت ان آیتوں سے بالکل واضح ہے۔

(۱) وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اٰتٰىكُمْ ؕ (۲۴ - ۳۳)

اور ان کو اللہ کے مال سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

اس آیت میں اللہ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ وہ مال جسے تم اپنی ملک سمجھتے ہو اور اس لئے سینت سینت کر رکھتے ہو (اسی کو شریعت کی اصطلاح میں اکتناز کہتے ہیں) در اصل ہماری ملک ہیں ہم نے تمہیں امانتاً دیا ہے۔ تاکہ تم اسے ہمارے ان بندوں میں تقسیم کر دو جنکو ہم نے اپنی مشیئت کی بنا پر تمہارا دست نگر بنا دیا ہے۔

(ب) اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ ؕ (۵۷ - ۷)

اے لوگو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس مال میں سے

جس کا اللہ نے انہیں اگلوں کا جانشین بنا کر مالک کر دیا ہے اس کی راہ میں بھی خرچ کرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر اللہ انسانوں کو ان کے اسلاف کے اموال کا مالک نہ بناتا تو آج کوئی شخص بھی مالک نہ ہوتا۔ مثلاً زید مر گیا۔ اور پچاس لاکھ روپیہ نقد چھوڑ گیا اور اس کے بیٹے (خالد، علی، حسن، حسین اور مسلم) ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دس دس لاکھ کے مالک بن گئے اللہ تو فرماتا ہے۔ کہ ہم نے ان کو مالک بنایا ہے۔ ورنہ ان سے پوچھو کہ تم لوگ یہ رقم کہاں سے لائے؟ مطلب یہ ہے کہ زید کو یہ رقم ہم نے دی تھی۔ اس لیئے دراصل مالک ہم ہیں۔ اب ہم نے زید کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں کو اس رقم کا امین بنا دیا ہے اس لئے ان کا فرض ہے۔ کہ وہ اس رقم میں سے "انفاق" بھی کریں۔ یعنی ہماری راہ میں بھی خرچ کریں۔

(ج) اللہ نے اسی پر اکتفا نہیں فرمایا۔ مزید تاکید فرمائی۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ط

اے لوگو تمہیں کیا ہو گیا ہے تم اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے جب کہ آسمانوں اور زمین (کائنات) میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کی میراث ہے۔ (یعنی اگر تم برضا و رغبت اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرو گے تو مرنے کے بعد یقیناً وہ ساری دولت یہیں چھوڑ جاؤ گے تو اپنے ساتھ تو ایک پیسہ بھی نہیں لے جا سکو گے۔ اب اگر تمہارے مرنے کے دو گھنٹے بعد قیامت آ جائے تو جس قدر دولت تم نے چھوڑی ہے۔ اس کا مالک کون ہے۔ اور وہ کس کی میراث ہے؟

(۵) ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ دولت یا جائداد (پراپرٹی)
ہمارے پاس ایک امانت ہے جس کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور
چونکہ انسان اس کا خلیفہ (نائب) ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ
مالک کے احکام اور منشاء کی تعمیل کرے اور مالک کا حکم یہ ہے
کہ اپنی دولت میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میرے محتاج
بندوں میں تقسیم کرے۔

(۶) کتنی تقسیم کریں؟ اس کا جواب بھی موجود ہے
وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ؟ قُلِ الْعَفْوَ
اے رسول مسلمان آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کس
قدر خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے۔ کہ جس قدر دولت تمہاری ضرورت سے
زائد تمہارے پاس ہو وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کردو۔ اسی لئے
تو اقبال نے یہ کہا ہے۔

با مسلمان گفت جاں برکف بنہ   آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ

(۷) آخر میں ایک فیصلہ کن بات فرما دی۔
اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ
لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کی دولت
دولتوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔ (۹ - ۱۱۱)
اسلئے قرآن کہتا ہے۔ کہ اے مسلمانو! دولت کماؤ اور خوب کماؤ۔
اور خوب دل کھول کر اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ کیونکہ تمہارا مقصود
اور محبوب دولت نہیں ہے بلکہ اللہ ہے جو تمہارا خالق بھی ہے۔
اور مالک بھی۔ اور تمہیں انجام کار اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تم اس لئے کہ تمہاری دولت اس کی تمہاری زمین اس کی، لہٰذا تم اس کی دولت اور اس کی زمین، اس کی خوشنودی کے لئے اس کے مستحق بندوں میں تقسیم کر دو۔ اگر تم ایسا کرو گے، تو دنیا اور آخرت دونوں میں تمہیں فلاح حاصل ہوگی۔

دولت حاصل کرنا اور دولت جمع کرنا جرم نہیں ہے مگر اس کو محبوب بنانا اور اسے "کنز" کرنا یعنی سمیٹ سمیٹ کر رکھنا۔ کہ کم نہ ہو جائے، یہ ضرور جرم ہے۔ اگر تمہارے پاس دو کروڑ روپے ہوں اور تم یہ سمجھو کہ یہ دولت میری نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی ہے۔ میں تو صرف اس کا "امین" ہوں۔ اور اس عقیدے کو عمل سے ثابت کرو یعنی واقعی تم اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور کرتے رہو تو تم سچے مومن ہو یعنی سرمایہ دار نہیں ہو۔ اکتناز کے مجرم نہیں، سوسائٹی کے دشمن نہیں ہو۔

خلاصہ کلام اینکہ

(۱) دولت اور زمین اللہ کی ملکیت ہے

(۲) تم ان دونوں کے امین ہو۔

(۳) اس لئے ان دونوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

نفس دولت، حصول دولت اور تقسیم دولت کے متعلق قرآنی تعلیمات کی وضاحت کے بعد اب ہم اس فصل کی شرح ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

پہلا بند۔ اس بند میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر ایک مسلمان دولت کو دین کے لئے حاصل نہ کرے بلکہ اپنے لئے حاصل کرے تو اللہ اس کا معبود نہیں ہے بلکہ دولت اسکی معبود ہے اسکے بعد سرمایہ داری

کی مذمت کی ہے۔

کہتے ہیں کہ مرشد رومی نے کیسا دلپذیر نکتہ بیان کیا ہے:۔

مال را گر بہر دیں باشی حمول

نعم مال "صالح" گوید رسول

یعنی اگر تو دین کی اشاعت کے لئے دولت حاصل کرے یا حاصل کرکے جمع کرے، تو تیرا یہ فعل مذموم نہیں ہے اور وہ دولت جو تو نے جمع کی ہے وہ کنز کے ذیل میں نہیں آتی۔ بلکہ بقول سرکار ابد قرار وہ مال جو دینی امور میں خرچ کرنے کے لئے جمع کیا جائے مال صالح ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس نکتہ کو مدنظر نہ رکھے بلکہ حصول دولت کو مقصود بنالے۔ تو پھر عکس او غلام و خواجہ او سیم و زر (یعنی دولت اس کا آقا اور وہ اس کا غلام ہو جائیگا۔ اس کی تشریح تمہید میں ہو چکی ہے۔

کہتے ہیں کہ قوم کے تہی دست (مفلس) لوگ تو قوم کے حق میں کسی نہ کسی رنگ میں مفید ہو سکتے ہیں۔ مگر ایسے دولتمند جو سرمایہ داری اور اکتناز کو مقصودِ حیات سمجھتے ہوں۔ اور صرف دولت جمع کرنے ہی کے لئے جیتے ہوں۔ قوم کے حق میں مفید ہو سکنے کے بجائے موجب فساد ہیں کیونکہ وہ دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں نہ خود اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو دیتے ہیں۔

بعض ایسے ہیں جو صرف اپنی ذات پر صرف کرتے ہیں اور اسراف و تبذیر کے مرتکب ہوتے ہیں بہر حال دونوں صورتوں میں عوام

لناس ان کی دولت سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ لہذا اقبال کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ

ع از جفای منعم فساد امتان

اس کے بعد اقبال ان منعموں کی مذمت کرتے ہیں جو اپنی دولت ذاتی آسائش اور عیاشی میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں ایک کوڑی بھی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں کہ:

ان سرمایہ دار، مال و دولت کے پرستار، عیش کے بندے، دنیا کے غلام ہر وقت انقلاب سے خائف رہتے ہیں تو وہ قدامت پرست ہیں اور پرانی لکیر کے فقیر۔ اسلئے چاہتے ہیں کہ جو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام صدیوں سے مروج ہے وہ بدستور قائم رہے۔

وجہ یہ ہے کہ زر پرستی اور نفس پرستی نے انہیں اندھا کر دیا ہے نیک و بد کی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔ ان کی نگاہ میں برائی (ناصواب) بھلائی (صواب) معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اس غیر اسلامی زندگی اور غیر اسلامی نظام کو محبوب رکھتے ہیں۔ اور انقلاب کے نام سے ان کی روح کانپتی ہے۔

ان منعموں (سرمایہ داروں جاگیرداروں اور زمینداروں) کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ مزدوروں کی محنت کا پھل خود کھاتے ہیں اور ان کو نان شبینہ سے محروم کر دیتے ہیں۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اگر کسی مزدور کی لڑکی پر ان کی نظر پڑ جاتی ہے تو اسے بھی آبرو سے محروم کر دیتے ہیں۔ نہ اللہ سے ڈرتے ہیں نہ قانون سے۔

جو لوگ (مزدور) ان کے کارخانوں یا کھیتوں میں کام کرتے ہیں

یہ لوگ دن رات ان کا خون چوستے رہتے ہیں وہ غریب مزدور رات دن نالہ و فریاد کرتے ہیں[1] لیکن ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔

ان غریبوں کی حالت کس قدر قابل افسوس ہے۔ نہ ان کے پیٹ میں روٹی ہے نہ تن پر کپڑا ہے رہا سوال سکونت کا تو

کاخ ہا تعمیر کردہ خود بکوست

غریب مزدور ان سرمایہ داروں کے لیئے شاندار کوٹھیاں تعمیر کرتا ہے مگر خود سڑک (فٹ پاتھ) پر رہتا ہے[2]۔

آخر میں اقبال کہتے ہیں کہ مبارک ہے وہ دولتمند جو اپنی دولت کو اللہ کا عطیہ سمجھے اور اپنے آپ کو اس کا امین تصور کرے۔ اور اسلیئے اس کو محتاجوں میں تقسیم کرتا رہے۔ اور انھیں کروڑوں کا مالک ہونے کے باوجود درویشوں کی سی زندگی بسر کرے مبارک ہے وہ دولتمند جو اس دور مادیت میں اللہ کے قانون کی اطاعت کرے اور ہر وقت اسکو خوش

---

[1] مزدوروں کے نالہ و فریاد کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً ہڑتال کرنا، جلوس نکالنا، وزیروں کی کوٹھیوں کے سامنے مظاہرہ کرنا۔ ریزولیشن پاس کرنا، اور تنگ آکر بھوک ہڑتال کرنا۔ اور انجام کار لاٹھیاں کھانا۔ ۱۲

[2] جیسے شک ہو وہ پاکستان کے پایہ تخت کراچی میں چند روز قیام کرکے اپنی آنکھوں سے ان آفت کے ماروں کو سڑکوں کے کنارے یعنی فٹ پاتھ پر اپنی زندگی کے دن پورے کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ ۱۲

رکھنے کی کوشش کرے۔

دوسرا ابلہ:۔ کہتے ہیں کہ جب تک انسان "اکل حلال" کے نکتہ سے آگاہ نہ ہوگا۔ وہ دنیا میں آرام و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ آج ہر قوم کی زندگی بلا مبالغہ "وبال" ہوگئی ہے اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ آج دنیا کی تمام قوموں کا معاشی نظام، سرمایہ داری اور سود پر مبنی ہے۔ اور سرمایہ داری اور سود میں دولت کی عادلانہ تقسیم ناممکن ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہر قوم کے پانچ چھ فیصد افراد تو ارب پتی اور کروڑ پتی ہیں۔ باقی پچانوے فیصد افراد مفلسی اور محتاجی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سرمایہ داری اور سود خوری دونوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے بجائے ایسا معاشی نظام پیش کیا ہے جس کی رو سے دولت چند افراد میں گردش نہیں کر سکتی۔ اس کی تفصیل ہم تمہید میں درج کر چکے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ افسوس ہے کہ یورپ اس نکتہ سے آگاہ نہیں ہے کہ اکل حرام سے انسان کو حقیقی راحت اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔

ع چشم او ینظر بنور اللہ نیست

اس مصرع میں تلمیح ہے۔ اس حدیث کی طرف:۔

"اتقوا فراسۃ المومن لانہ ینظر بنور اللہ" یعنی مومن کی فراست سے ڈرو۔ کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

مطلب یہ ہے۔ کہ مومن کو دھوکہ دینے کی کوشش مت کرو کیونکہ وہ

قرآن سے روشنی (بصیرت) حاصل کرتا ہے۔ تمہارے غریب میں نہیں آ سکتا۔

یورپ کی قومیں حرام اور حلال میں تمیز نہیں کر سکتیں (کیونکہ وہ قرآنی تعلیمات سے بیگانہ ہیں) اس لئے ان کی حکمت ناقص ہے۔ اور اس لئے ان کا نظام حیات بھی ناقص ہے۔ ان کے غیر قانونی نظام زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو اپنا غلام بنا رہی ہے اور ہر طاقتور قوم کمزور قوم کا خون چوس رہی ہے۔

ان کی نگاہ میں حکمت یا دانائی اس بات میں منحصر ہے کہ کمزور قوم کو نانِ شبینہ سے بھی محتاج کر دیا جائے۔

تہذیب حاضر کا شیوہ (طریقہ) یہ ہے۔ کہ طاقتور قومیں کمزور قوموں کو فنا کر دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ اور یہ کام تجارت کے پردے میں انجام دے رہی ہیں یعنی طاقتور قومیں کمزور قوموں کو اقتصادی اور معاشی اعتبار سے اپنا غلام بناتی ہیں۔ پھر ان کا خون چوستی ہیں۔ چنانچہ یہودیوں نے بڑے بڑے بنک قائم کر دیئے ہیں اور لوگوں کو معاشی اعتبار سے اپنا غلام بنا کر اللہ سے بیگانہ کر دیا ہے۔

آخر میں اقبال ہمیں متنبہ کرتے ہیں۔ کہ جب تک موجودہ معاشی نظام کو (جو سرمایہ داری اور سود خوری پر مبنی ہے) ختم کر کے اس جگہ اسلام کا معاشی نظام نافذ نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک دنیا میں دینداری خدا پرستی اور حقیقی تہذیب و تمدن کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ بات تو صحیح ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب تک مسلمان خود اسلام کے اصولوں پر عامل نہ ہوں اس نظام کو ختم کون کرے؟

تیسرا بند :- جیسا کہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے یہ بند اس فصل میں سب سے زیادہ غور طلب ہے۔ کیونکہ اس بند میں اقبال نے یہ بتایا ہے۔ کہ شریعت کا منبع کہاں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ

(۱) اس دنیا میں ہر جگہ خیر و شر دونوں ساتھ ساتھ ہیں زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے۔ جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو موجود نہ ہوں۔ اس لیئے انسان بطور خود اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کہ نفع کس پہلو میں ہے۔ اور نقصان کس پہلو میں ہے؟ بالفاظِ دگر وہ بطور خود اچھائی اور برائی کا معیار متعین نہیں کر سکتا۔ ایک شخص جس بات کو اچھا سمجھتا ہے دوسرا اُسے بُرا خیال کرتا ہے۔ اندریں حالات انسان ہدایت ربانی کا محتاج ہے۔ خدا چونکہ خالق کائنات ہے اس لیئے وہی اس بات کا علم رکھتا ہے کہ انسان کے لیئے کونسا راستہ خوب (نیک) ہے اور کونسا راستہ زشت (بد) ہے۔

(۲) لہذا خدا نے بندوں کی راہنمائی کے لیئے شریعت نازل کی۔ شریعت سے مراد ہے اسلام۔

(۳) شریعت کا منبع انسان کے اعماق حیات میں پوشیدہ ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

شرع برخیزد ز اعماق حیات   روشن از نورش ظلام کائنات

یعنی شریعت، حیات کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے (خارج سے انسان پر مسلط نہیں ہوتی) اور اس کے نور سے کائنات کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں یعنی انسان آگاہ ہو جاتا ہے کہ کونسا فعل زشت (برا) ہے

در کون سا جواب اچھا ہے۔

چونکہ یہ مصرع" شرح بر خرد ز اعماق حیات" تشریح طلب ہے اس لئے ذیل میں اس کی وضاحت ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔

پہلی بحث

واضح ہو کہ اس شعر کا مفہوم حسب ذیل آیت سے ماخوذ ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۵ (۳۰ : ۳۰)

تشریح الفاظ :- (۱) فاقم میں فائے غائیہ یا فائے فذلکہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ چونکہ ایسا ہے۔ ایسا ہے اسلئے تم ایسا کرو۔

(۲) اقم وجہک کے لفظی معنی ہیں۔ سیدھا کر اپنا منہ۔ مراد یہ ہے کہ اپنی شخصیت کی تمام قوتوں کو دین پر مرکوز کر دو۔

(۳) "دین" کثیر المعانی لفظ ہے یہاں اسلام مراد ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

(۴) حَنِیْفًا :- حنف سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں حق و صداقت کی طرف میلان حنیف وہ ہے جو حق کی طرف مائل ہو۔ اس لئے مرادی معنی ہوئے سب سے منہ موڑ کر۔

(۵) فطرت :- فطر سے ماخوذ ہے فطر بمعنی شق کر. ماکثر للحاق لفظ ہے فطرت بمعنی خلقت، پیدائش، آرائش، طبیعت، افتاد طبع، سرشت، ساخت، جبلت، سانچہ، دین، طریقہ، ابتدا، اختراع۔

(۶) قیم۔ قوم سے مشتق ہے بمعنی قیم، امارت، نائب، نگراں، ذمہ دار، محافظ

یہاں مراد ہے ایسا دین جو ان کے معاشی سیاسی اور دینی امور کا نگراں (مقوم) ہو

ترجمہ: پس تو سیدھا کر منہ اپنا واسطے عبادت کے دین ابراہیمی پر ہو کر (حنیف ہو کر) لازم پکڑ خدا کی پیدائش کو (اپنی فطرت کو) جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی پیدائش میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی ہے دین درست مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تم ایک خدا کے ہو کر اسی کے دین کی طرف اپنا رخ رکھے رہو۔ یہ دین کیا ہے؟ وہی خدا کی بنائی ہوئی سرشت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے بس تم اسی فطرت اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ یعنی دین خود تمہاری فطرت ہے اور تمہاری فطرت ہی دین ہے۔ خدا کی تخلیق میں کبھی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ فطرت میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی تمہاری فطرت "الدین القیم" ہے۔ یعنی شریعت کا منبع خود تمہاری فطرت ہے اور یہ خود تمہارے اندر موجود ہے۔ باہر سے تم پر مسلط نہیں کی گئی ہے۔ یعنی شریعت کوئی خارجی دباؤ نہیں ہے بلکہ خود تمہاری فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کا دوسرا نام ہے۔

فطرت کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ نے ہر شخص میں "شگفتگی" استعداد رکھی ہے۔ کہ اگر حق کو سمجھنا چاہے تو سمجھ سکتا ہے اور اگر اس کا اتباع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے، اقامت وجہ برائے دین کا حکم اس لئے دیا کہ یہ طرز عمل (توجہ برائے دین) خود انسانی فطرت سلیمہ کا مطالبہ ہے۔ اقامت وجہ للدین وہ فطرت اللہ ہے۔ جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے یعنی دین انسانی سرشت کا دوسرا نام ہے اور چونکہ انسانی سرشت میں کبھی کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا ہے اس لئے دین (اسلام) میں بھی کبھی

کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یعنی اسلام، آغاز آفرینش سے لے کر قیامت تک بنی آدم کے حق میں دین قیم رہیگا کوئی زمانہ ایسا نہیں آسکتا۔ جب انسان دین اسلام سے بے نیاز یا بالاتر ہو سکے گا۔ اس بات کا امکان بھی نہیں ہے کیونکہ دین اسلام تو انسانی فطرت ہی کا دوسرا نام ہے۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ یہ فطرت اللہ کیا ہے؟ کہاں ہے اس کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا منبع کہاں ہے ان تمام سوالات کا جواب یہ ہے کہ تمہیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے بس اپنے اندر غور کرو سب کچھ عیاں ہو جائیگا۔

دین جس کا دوسرا نام شرع بھی ہے تم پر خارج سے مسلط نہیں ہوا ہے۔ ہم نے تمہیں دین (فطرت) ہی پر پیدا کیا ہے۔ تمہاری فطرت اور تمہارے دین میں کوئی تباین یا مغائرت نہیں ہے تمہاری فطرت (سرشت) ہی تمہارا دین ہے جیسا کہ فطرالناس علیہا سے ثابت اور آشکارا ہے۔

دوسری بحث

اقبال نے اسی نکتہ کو اپنی بیش بہا تصنیف "تشکیل جدید" کے ساتویں لیکچر میں بایں انداز واضح کیا ہے۔

مذہبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں

دور اول یا دور ایمان

دور ثانی یا دور تحقیق۔

دور ثالث یا دور دریافت:

اس تیسرے دور میں نفسیات مابعد الطبیعات کی جگہ لے لیتی ہے اور مذہبی زندگی انسان کے اندر حقیقت اخری سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی امنگ (آرزو) پیدا کر دیتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر مذہب انسان کے لیئے زندگی اور اقتدار کو ذاتی طور پر اپنے اندر جذب کر لینے کا دوسرا نام ہو جاتا ہے۔ اور فرد کو حریت کامل حاصل ہو جاتی ہے۔ اس طرح نہیں کہ وہ شریعت کی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے (یہ بھی حریت کی ایک صورت ہے) بلکہ اس طرح کہ وہ اس صداقت کو دریافت کر لیتا ہے۔ کہ شریعت کا آخری منبع خود اس کے شعور کی گہرائی میں موجود ہے۔ ص ۱۷۱.

خلاصہ کلام اینکہ

(۱) دین (شرع) کیا ہے اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔

(۲) دین کی ماہیت کیا ہے۔؟ خود تمہاری فطرت۔

(۳) اسلام کیا ہے؟ تمہاری فطرت کے تقاضوں کا صحیح علم۔

(۴) شریعت کیا ہے؟ ان تقاضوں کی تسکین کا سامان

(۵) اصلی تقاضا (جن پر تمام تقاضے مبنی اور موقوف ہیں) کیا ہے؟ کسی کامل، بے عیب، پاکیزہ، حسین و جمیل، مجمع کمالات ذات سے محبت کرنا۔ مگر انسان کسی غلطی (رسم پرستی، تقلید، ماحول، جہالت، جذبات، تعصب کی وجہ سے کسی ناقص ہستی کو (کامل سمجھ کر) اپنا محبوب (آئیڈیل) بنا لیتا ہے۔

(۶) قرآن کیا ہے؟ محبوب حقیقی (کامل بے عیب ذات) کی صفات کا روشن ترین اور دلکش ترین بیان ہے۔ تاکہ عاشق کسی ناقص ہستی کو اپنا محبوب بنا کر اپنی زندگی تباہ نہ کرلے۔

(۷) اسی لئے مرشد رومی ہمیں آگاہ فرماتے ہیں۔

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است

وز شراب جانفزایت ساقی است

یعنی عورت، دولت، اور زمین کو محبوب مت بناؤ، کیونکہ یہ تینوں چیزیں فانی ہیں۔ اس لئے ان سے دل لگنے کا نتیجہ مایوسی ناکامی اور پشیمانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کی بجائے اس حی القیوم سے عشق کرو۔ جو ہمیشہ زندہ رہیگا۔ بلکہ تمہیں بھی ہمیشگی عطا کر دے گا [1]

(۸) اس سے عشق کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ حنیفا بن جاؤ۔

صد کتاب و صد ورق در نار کن

"روئے خود را جانب دلدار کردن در اصل" اقم وجہک للدین حنیفا" کا فارسی میں ترجمہ ہے۔

(۹) یہ رنگ یعنی "حنفیت" کیسے پیدا ہو؟

قال را بگذار و مرد حال شو

پیش مرد کاملے پامال شو

یعنی منطقی بحثوں میں الجھنے کے بجائے کسی مرد کامل (شیخ طریقت) کی صحبت اختیار کرلو۔ وہ تمہارا رشتہ رب سے توڑ کر محبوب حقیقی سے جوڑ دیگا

---

[1] فلھم اجر غیر ممنون (۹۵-۶) پس ان کے لئے وہ اجر ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔ ۱۲

چوتھا شعر:- گر جہاں داند حرامش را حرام الخ اگر دنیا کے لوگ شریعت اسلامیہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اس کے حلال کو حلال اور جن باتوں کو اُس نے حرام قرار دیا ہے۔ ان کو حرام سمجھیں تو یہ نظام قیامت تک بنی آدم کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

پانچواں شعر:- نیست ایں کار فقیہاں اے پسر الخ لیکن علمائے ظواہر اسرار شریعت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ ان کو سمجھنے کے لئے عشق رسول لازمی ہے۔

کے با نگاہ دیگرے اور "با نگرے" میں نگاہ دیگرے سے عاشق (صوفی) کا زاویہ نگاہ مراد ہے۔ جو محبوب کے احکام کی تعمیل میں مطلق چون و چرا نہیں کرتا۔ اقبال کی رائے میں فقہا صرف شریعت کے ظاہر کا پہلو پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ شریعت فلاں فلاں باتوں کا حکم دیتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ ان باتوں پر عمل کیسے کیا جائے؟ وہ اس نکتہ سے واقف نہیں ہیں کہ جب تک ایک مسلمان مسلک عشق اختیار نہ کرے۔ وہ شرعی احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا۔

چھٹا شعر:- عشق از عدل است و تسلیم و رضاست الخ یعنی شریعت اسلامیہ انسان کو عدل کرنے اور اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت کا حکم دیتی ہے۔ یعنی شریعت اسلامیہ کی روح یہ ہے۔ کہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو اسی کو تصوف کی اصطلاح میں شیوۂ تسلیم و رضا کہتے ہیں اور ایک مسلمان کی تمام روحانی ترقی اسی مسلک تسلیم و رضا پر موقوف ہے چنانچہ اقبال

نے اپنی ہر ایک تصنیف میں مسلمانوں کو شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرنے کی تلقین کی ہے ذیل میں چند اشعار درج کرتا ہوں :-

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار (اسرار خودی)

برون کشید ز پیچاک ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا (زبور عجم)

حسین و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیل (بال جبریل)

دم بہ دم سراپا سوختن اندر طلب
انتہائش عشق و آغازش ادب (جاوید نامہ)

واضح ہو کہ دین اسلام کا مفہوم تسلیم و رضا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے ۔ چنانچہ یہ صداقت آیۂ ذیل سے آشکارا ہو سکتی ہے ۔ کہ اسلام کے معنی ہیں گردن نہادن یا سر تسلیم خم کردن یا احکام شرع کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ۔

" فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ " (۳۷ - ۱۰۳)

جب ابراہیم اور اسماعیل دونوں نے ہمارے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ۔ اور باپ (ابراہیم) نے بیٹے (اسماعیل) کو ہماری راہ میں قربان

کرنے کے لئے پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا۔

ع بیخ او اندر ضمیر مصطفےٰ است

یعنی سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں شریعت کی دولت عطا فرمائی ہے اور آپ ہی نے ہمیں شیوہ تسلیم و رضاء کی تعلیم دی ہے میری رائے میں "بیخ او" میں "او" کا مرجع "تسلیم و رضاء" ہے لیکن اگر او کا مرجع "شرع" کو قرار دیا جائے۔ تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ شریعت کا منبع فطرت انسانی ہے۔ اور آپ نے انہی فطری تقاضوں کی تکمیل کا مکمل ضابطہ یا دستور عطا فرمایا ہے۔ اس لئے "ضمیر مصطفےٰ" یا قلب نبوی جو مہبط وحی ہے۔ بمنزلہ بیخ شریعت ہے۔ یعنی اگر آپ کی ذات نہ ہوتی تو ہم شریعت کی دولت سے بہرہ ور کیسے ہوتے ؟

ساتواں اور آٹھواں شعر۔۔ یہ دو شعر بطور جملہ معترضہ ہیں اور اس جملہ معترضہ کو مضمون کے درمیان لانے کی ضرورت اسلئے لاحق ہوئی کہ بعض صوفیہ حالت صحو پر حالت سکر کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اقبال ان سے متفق نہیں ہیں اس لئے ان دو شعروں میں انہوں نے ان حضرات سے اختلاف رائے کر کے اپنا نظریہ پیش کر دیا ہے یعنی

ع وصل او کم جو، رضائے او طلب

ذیل میں اس اجمال کی تفصیل کرتا ہوں :۔

(۱) حالت صحو، تصوف کی اصطلاح میں ہوشیاری کو کہتے ہیں یعنی وہ حالت جس میں صوفی (طالب مولیٰ) اپنے ہوش و حواس میں رہ کر شریعت محمدیہ کا اتباع کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے روحانی مدارج حاصل کرتا

ہے۔ اصطلاح میں اس کو "سلوک" کہتے ہیں۔ اور وہ شخص "سالک" کہلاتا ہے اس حالت میں سالک کو اپنی انفرادیت کا احساس باقی رہتا ہے۔ اقبال نے اس حالت کو "فراق" سے تعبیر کیا ہے بعض صوفیہ نے اس حالت کو گسستن سے بھی تعبیر کیا ہے۔ خلاصہ کلام اینکہ حالت صحو یا سلوک یا فراق یا گسستن میں طالب "من و تو" میں امتیاز کرتا ہے اور بمقتضی ہوش و حواس اتباع شریعت کرتا ہے یعنی اس کی رضا طلب کرتا ہے۔

(۲) حالت سکر:۔ یہ وہ حالت ہے جس میں طالب پر شدت جذبات سے عالم بیخودی طاری ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اور اس پر مستی کی کیفیت غالب آجاتی ہے اس لئے وہ اتباع شریعت سے معذور ہو جاتا ہے۔ اس حالت کو جذب یا پیوستن سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال نے اسے وصل سے تعبیر کیا ہے۔ اور طالب کو "مجذوب" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس حالت سکر یا جذب یا بیخودی میں طالب "من و تو میں" امتیاز نہیں کر سکتا۔

خدا رسی کے یہ دو طریقے دنیائے تصوف میں مشہور و معروف ہیں چنانچہ اسی بناء پر صوفیوں میں بعض سالک گذرے ہیں اور بعض مجذوب سالک ہمیشہ ہوشیار رہتا ہے۔ اور مجذوب کبھی ہوشیار نہیں ہوتا۔ اقبال نے اس شعر میں ان دونوں حالتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قلب او را قوت از جذب و سلوک
پیش سلطان نعرۂ او لا ملوک

اس تمہید کے بعد اب ہم دونوں شعروں کا مطلب بیان کرتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تیرے دل میں جو اس سے ملنے کی آرزو موجزن ہے۔ یہ اسی وقت تک ہے جب تک تو حالت صحو، (فراق) میں ہے۔ یعنی جب تک تیرے اندر مغائرت کا احساس باقی ہے یہ احساس تجھے ملاقات کی کوشش پر اکساتا رہیگا۔ اور تو ہر آن مراحل شوق طے کرتا رہیگا۔ یعنی روحانی عروج حاصل کرتا رہیگا تیرے قلب پر ہر لحظہ نئی تجلی ہوتی رہیگی اور چونکہ تجلیات لاانتہا ہیں اسلئے تو ابدالآباد تک مسلسل ترقی کرتا رہیگا۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

لیکن اگر وہ بے حجاب ہو کر تیرے سامنے آجائے۔ تو یہ یقینی بات ہے۔ کہ تو تجلی ذات کی تاب نہیں لا سکے گا۔ یعنی تو باقی نہیں رہیگا اور جب تو ہی باقی نہ رہا۔ تو ترقی کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔

ستارے رات کے وقت جگمگاتے ہیں۔ کیونکہ آفتاب محجوب ہوتا ہے۔ لیکن جب صبح کے وقت آفتاب بے حجاب ہوتا ہے تو تمام ستارے کالعدم ہو جاتے ہیں۔ جب ستارے آفتاب کی تاب نہیں لا سکتے تو ذرا سوچ کہ تو خالق آفتاب کی تاب کس طرح لا سکتا ہے؟ جب حضرت موسیٰ اس کی صفت تجلی کی تاب نہ لا سکے (حالانکہ اس نے براہ راست تجلی نہیں فرمائی تھی۔ بلکہ طور کو واسطہ بنایا تھا) تو کوئی شخص اس کی ذاتی تجلی کی تاب کیسے اور کیونکر لا سکتا ہے؟

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (۷ - ۱۴۳)

پس جب تجلی فرمائی اس کے رب نے بواسطہ جبل (یعنی جب اللہ نے پہاڑ پر اپنی تجلی ذاتی) تو کر دیا اسے ریزہ ریزہ اور گر پڑے حضرت موسیٰ بیہوش ہو کر۔"

اندریں صورت تیرے لئے انسب اور اولیٰ یہی ہے کہ اگرچہ جدائی سے تو جاں بلب ہو جائے تو بھی حالت صحو ہی کو ترجیح دے یعنی۔

وصل او کم جو رضائے او طلب

وصل یا حالت سکر کے بجائے حالت صحو میں رہ کر اس کی رضا طلب کرتا رہ۔ بالفاظ دگر ، محبوب کے وصل کے مقابلہ میں اس کا فراق تیرے لئے مفید ہے۔ یہ سچ ہے کہ تیرا مقصود "خدا رسی" ہے مگر اس کا ذریعہ جذب نہیں ہے بلکہ سلوک ہے وصل نہیں ہے۔ بلکہ رضا ہے۔ وصل کی طلب مت کر۔ اسی کی رضا طلب کر۔ کیوں؟ اس لیے کہ

مصطفیٰ داد از رضائے او خبر
نیست در احکام دین چیزے دگر

یعنی سرکار ابد قرار نے طلب وصل کی تعلیم نہیں دی بلکہ طلب رضا کی تعلیم دی ہے۔ آپ ساری عمر سالک رہے ساری عمر اس کی رضا طلب کرتے رہے۔

نوٹ :۔ بیشک مجذوب بھی اسے حاصل کر لیتا ہے مگر وہ دوسروں کو اس تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے برعکس سالک جب اس تک پہنچ جاتا ہے۔ تو دوسروں کو بھی اس لذت سے آگاہ کر سکتا ہے جو اسے

حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے سالک کا مرتبہ اور مقام، مجذوب کے مرتبہ اور مقام سے بہت اونچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی نبی "مجذوب" نہیں ہوا۔ بالفاظ دگر، اللہ نے کسی مجذوب کو نبوت سے نہیں نوازا۔ کیونکہ مجذوب نہ دوسروں کی اصلاح کرسکتا ہے اور نہ فریضہ ہدایت انجام دے سکتا ہے۔

اے مخاطب! تو خود قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرلے تو تجھے معلوم ہو جائیگا۔ کہ احکام دین یعنی شریعت محمدیہ میں ہر جگہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی رضا طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تمام شریعت کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں بیان کرنا مطلوب ہو تو ہم یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ

شریعت، استرضاء باری تعالیٰ کا دوسرا نام ہے۔

قرآن کی رو سے مقصود مومن صرف ایک بات ہے اور وہ یہ کہ اللہ اُس سے راضی ہو جائے اور جسے شریعت کہتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے۔ مگر اللہ کو راضی کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ یعنی وہ طریقہ جو خود اللہ نے بواسطہ سرکار ابد قرار صلعم اپنے بندوں کو بتایا ہے۔

دسواں شعر:
تخت جم پوشیدہ نہ زیر بوریاست
فقر و شاہی از مقامات رضاست

بہت بلیغ اور بلند پایہ شعر ہے۔ اور اس میں اقبال نے خود ہی گذشتہ شعر کی شرح کر دی ہے۔ یعنی مقصود حیات نہ تخت جم ہے نہ بوریا نہ فقر ہے نہ شاہی، نہ مفلسی ہے نہ تونگری نہ سلطنت ہے نہ گدائی، نہ فتح ہے نہ شکست۔ بلکہ صرف یہ کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے۔

چنانچہ جس بوریا نشین نے اللہ کو راضی کر لیا۔ اسے بوریئے پر تخت شاہی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ تخت شاہی کی اس بوریئے کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔

مثال درکار ہو تو تاریخ اسلام کا مطالعہ کافی ہوگا۔ مثلاً شمس الدین التمش با ایں ہمہ کروفر۔ اس درویش بے نوا کے سامنے دست بستہ حاضر ہوا کرتا تھا۔ جسے دنیا خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

فقیری (بوریا) اور شاہی (تخت) یہ دونوں رضا کے مقامات ہیں۔ اللہ کے بعض بندوں مثلاً سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہیؒ نے بوریے پر بیٹھ کر اس کی رضا (خوشنودی) حاصل کر لی۔ اور بعض مثلاً حضرت عمرؓ نے دنیائے اسلام پر فرمانروائی کر کے اسے راضی کر لیا۔

بالفاظ دگر جب اللہ کسی بندے سے راضی ہو جاتا ہے۔ تو اس کو سلطان صلاح الدین ایوبی بنا دیتا ہے۔ اور کسی دوسرے سے راضی ہو جاتا ہے۔ تو اس کو خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ بنا دیتا ہے دنیا جانتی ہے کہ دونوں نے اپنے اپنے رنگ میں بادشاہت ہی کی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
وہ نگہ کی تیغ بازی یہ سپہ کی تیغ بازی

گیا رہواں شعر:۔ چونکہ شریعت (اسلام) نام ہے تسلیم و رضا (اطاعت) کا۔ اس لئے اے مسلمان! تو امیر قوم (سلطان) کے حکم کی تعمیل کر اور کسی حال میں بھی حرف شکایت زبان پر نہ لا۔ کیونکہ

ع   روز میداں نیست روز قیل وقال

مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح میدان جنگ میں کوئی سپاہی اپنے افسر سے بحث نہیں کر سکتا۔ بلکہ بلا چوں وچرا اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اسی طرح مسلمان کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے امیر (امام) کے احکام کی تعمیل کرے۔

اس مصرع میں "روز میدان" کی ترکیب بہت ہی معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سپاہی تو دو چار مرتبہ ہی میدان جنگ میں جاتا ہے مگر مسلمان کی پوری زندگی بمنزلۂ عرصہ جنگ ہے کیونکہ وہ تو پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔

اقبال نے یہ مصرع ایسا لکھا ہے کہ مسلمان کی پوری زندگی پر حاوی ہے گویا دو لفظوں میں اس کی پوری زندگی کی داستان بیان کر دی ہے یعنی اقبال مسلمان سے کہتے ہیں کہ تمہاری پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ تم تو تا دم وفات میدان جنگ میں ہو اور چونکہ میدان جنگ میں کوئی سپاہی قیل وقال (چوں وچرا) نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے سردار کی اطاعت کرتا ہے۔ اس لئے تم بھی اپنے امام کی اطاعت کرو۔ اب ہم اقبال کی اس تعلیم کو آیات قرآنی سے مبرہن کرتے ہیں۔

(۱) جب ایک شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتا ہے تو ایمان لانے کے بعد وہ اللہ سے ایک معاہدہ کرتا ہے ان دونوں باتوں میں منطقی لزوم پایا جاتا ہے۔ کلمہ شہادت زبان سے ادا کرنے اور دل سے اس کی تصدیق کرنے کے بعد اللہ سے معاہدہ کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ معاہدہ نہیں کرتا تو وہ اپنے عمل سے اپنے اس قول کی

دکہ میں مسلمان ہوں) تکذیب و تردید و تغلیط کر دیتا ہے۔ لہٰذا اعلان اسلام کے بعد معاہدہ ناگزیر (لازمی) ہے۔

(ب) معاہدہ یہ ہے کہ وہ اپنی جان اور اپنا مال دونوں چیزیں اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ اور اللہ ان کے عوض اپنی جنت دینے کا وعدہ فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ط (۹۔ ۱۱۲)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اُن کے اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں لہٰذا (اس کے بعد) وہ اپنی پوری زندگی جہاد میں بسر کر دیتے ہیں یعنی قتل کرتے ہیں اور قتل ہو جاتے ہیں۔

(ج) ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مقصود حیات، اللہ کو راضی کرنا ہے اور اللہ صرف اُن لوگوں سے راضی ہوتا ہے جو اُس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا (۶۱۔ ۴)

بلاشبہ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر جنگ کرتے ہیں (گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں)

(د) چونکہ دل میں یہ خیال گزر سکتا تھا۔ کہ شاید مجھے کثرتِ اعداد (مشرکین) کی وجہ سے غلبہ حاصل نہ ہو سکے۔ اور میں ناکام ہو جاؤں اس لئے اللہ نے صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا۔ کہ اللہ کی فوج کبھی مغلوب نہیں ہو سکے گی۔

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ط (۵ - ۵۶)

بیشک اللہ کی فوج ہی غالب آئے گی۔

(۷) مزید اطمینان کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح فرما دی ہے کہ ہر گاہ تمہارا مقصود حیات یہ ہے کہ ہم تم سے راضی ہو جائیں۔ تو آگاہ ہو جاؤ کہ اگر تم ہماری فوج میں اپنا نام درج کرا لیگے تو ہم تم سے راضی ہو جائینگے

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ط اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ط (۵۸ - ۱۲)

مومنوں کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے کبھی رشتہ مودت استوار نہیں کر سکتے۔ خواہ وہ ان کے والدین یا فرزند ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ ان مومنوں کو جنت میں داخل کریگا۔ اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا۔ اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہی ہے اللہ کی جماعت یا فوج۔

بارہواں شعر۔

سابقہ شعر کی تائید میں کہتے ہیں۔ کہ اے مسلمان! جہاں تک ممکن ہو۔ اللہ کے احکام (شریعت) سے سرتابی مت کر (اگر تو اس کے احکام کی اطاعت کریگا) تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں کوئی شخص تیرے احکام سے سرتابی نہیں کریگا اگر تو اللہ کا مطیع ہو جائے تو دنیا تیری مطیع ہو جائیگی یہ مضمون سعدیؒ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

مثال درکار ہو تو حضرات خواجگان چشتؒ کی پاکیزہ اور مبارک

زندگیوں کا مطالعہ کافی ہوگا چونکہ یہ حضرات اللہ (شریعت) کی اطاعت کرتے تھے۔ اس لیئے ساری دنیا ان کی اطاعت کرتی تھی بادشاہوں سے لیکر عوام تک ساری مخلوق ان کے آستانہ پر دست بستہ حاضر رہتی تھی۔ اور ان کی نقش برداری کو اپنے لیئے موجب سعادت یقین کرتی تھی

آخری شعر:۔ اے مخاطب اگر تو شریعت کی پابندی کریگا تو تجھ پر اس آیت کی حقیقت منکشف ہو جائیگی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ط (۹۵ - ۴)

ہم نے انسان کو بہترین انداز (بہترین ساخت اور بہترین سانچہ میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔

اقبال مسلمان سے کہتے ہیں کہ اگر تو شریعت کی اتباع کرے۔ تو بلاشبہ تو اس آیت کا مصداق بن سکتا ہے۔ یعنی تیری تمام پوشیدہ صلاحیتیں اور استعدادیں بالفعل ظاہر ہو سکتی ہیں۔ اور انکے ظہور کے بعد تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی۔ کہ میں واقعی احسن تقویم پر پیدا ہوا ہوں۔

اور جب یہ صداقت تجھ پر واضح ہو جائیگی تو قدرتی طور پر تیرے اندر ابراہیمی ایمان (کامل ایمان) پیدا ہو جائیگا۔

چوتھا بند:۔ اس بند کے پہلے سات شعر بہت غور طلب ہیں ان میں اقبال نے مسئلہ جبر و قدر کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(ب) اشعار ۸ تا ۱۲ میں انہوں نے مسلمان سے خطاب کیا ہے کہ

ع درجہاں اسرار دیں را فاش کن

(ج) آخری چھ اشعار میں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے اور مسلمان کو عمل کی دعوت دی ہے۔

پہلا شعر:۔ اے مخاطب یہ تو تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ شرع خارجی سے انسان پر مسلط نہیں ہوتی۔ بلکہ خود اسکی حیات کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے بالفاظ دیگر! شریعت اس کی فطرت کے تقاضوں کا دوسرا نام ہے۔

اب اگر تو یہ سوال کرے کہ طریقت کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ طریقت شریعت سے کوئی مختلف الملنوع چیز نہیں ہے بلکہ وہ اس صداقت کو بچشم خود دیکھنے کا نام ہے کہ

ع شرع برخیزد ز اعماق حیات

(۱) شریعت کا منبع، اعماق حیات ہے۔

یہ ایک صداقت ہے جس طرح یہ دوسری صداقت ہے کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن ایک اور دو کی نسبت سے ملا دیا جائے تو پانی بن جاتا ہے۔

(۲) اب اگر کوئی شخص اس صداقت کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے تو اس کا یہ دیکھنا طریقت ہے۔ جس طرح اگر کوئی شخص آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ملا کر دیکھ لے تو اس کے اس دیکھنے کو مشاہدہ (Demonstration) کہتے ہیں۔

جس طرح سائنس میں دو چیزیں ہیں علم اور عمل جن کو تھیوری اور پریکٹس کہتے ہیں اسی طرح مذہب میں دو چیزیں ہیں علم اور عمل جن کو شریعت اور طریقت کہتے ہیں۔

شریعت ، مذہب کا علمی پہلو ہے .
طریقت ، اسی مذہب کا عملی پہلو ہے
عالم زبان سے کہتا ہے . کہ

شرع برخیزد ز اعماق حیات

عارف اس صداقت کو بچشم خود دیکھتا ہے .
گویا شریعت شنید ہے ، طریقت دید ہے .

مرشد رومی فرماتے ہیں :۔

بدانکہ شریعت ہمچو شمع است کہ راہ می نماید ، تا شمع بدست بناری راہ رفتہ نشود (وکارے کردہ نگردد) چوں در راہ آمدی ایں رفتن تو طریقت است وچوں بمقصود رسیدی ایں رسیدن تو حقیقت است

(دیباچہ دفتر پنجم)

یعنی اے مخاطب اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ شریعت وہ شمع ہے . جو سالک کو راہ دکھا سکتی ہے . (لیکن جب تک کوئی شخص چلنا شروع نہ کرے محض شمع اس کو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتی) جب تو نے شمع ہاتھ میں لے کر چلنا شروع کیا . تو یہ تیرا چلنا طریقت ہے (یعنی طریقت شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے شریعت پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے) اور جب تو منزل مقصود کو پہنچ گیا تو یہ تیرا پہنچنا حقیقت ہے "

عالم یا فقیہہ صرف زبان سے کہہ دیتا ہے کہ شریعت کا منبع خود انسان کی فطرت ہے . یا شریعت انسان کے ضمیر کی گہرائی سے ابھرتی ہے لیکن صوفی اس قول پر اکتفا نہیں کرتا . وہ اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے کہ واقعی ایسا ہی ہے .

اسی لیئے فقہا کو ارباب قال اور صوفیہ کو ارباب حال کہتے ہیں۔
عالم جو بات منہ سے کہتا ہے عارف اس پر عمل کرکے دیکھتا ہے۔

گفت دین عامیاں؟ گفتم شنید
گفت دین عارفاں؟ گفتم کہ دید (جاوید نامہ)

واضح ہو کہ یہ دیکھنا ایک فن ہے۔ اور جس طرح کوئی طالب علم لیباریٹری میں داخل ہوئے بغیر اور ڈیمانسٹریٹر (استاد) کی ہدایت اور رہنمائی کے بغیر اپنے پڑھے ہوئے پر عمل نہیں کرسکتا۔ یعنی بالفعل آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ملا کر پانی نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح کوئی طالب حق (سالک) خانقاہ میں داخل ہوئے بغیر اور مرشد (شیخ طریقت) کی توجہ اور رہنمائی؛ تلقین کے بغیر اپنے پڑھے ہوئے پر عمل نہیں کرسکتا یعنی بالفعل نہیں دیکھ سکتا۔ کہ واقعی شریعت میری عبادات کی گہرائیوں سے اُبھر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں بزرگان دین نے مسلمانوں کو صحبت شیخ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور اسی لیئے قرآن حکیم نے آفاق کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ "نفس" میں بھی غوطہ زن ہونے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ ط أَفَلَا تُبْصِرُونَ ط

یقین کرنے والوں کے لیئے ہماری قدرت کاملہ کی نشانیاں زمین میں (بھی) موجود ہیں۔ اور خود تمہارے نفسوں میں بھی۔ پس تم غور سے کیوں نہیں دیکھتے ط (۵۱-۲۱)

واضح ہو کہ طریقت اسی حکم "تبصرون" پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے جب سالک تبصرہ کرتا ہے یا اپنے نفس میں غور کرتا ہے۔ تو اسے

معلوم ہوتا ہے کہ جسے میں خارج سے اپنے اوپر مسلط سمجھ رہا تھا۔ وہ تو خود میرے ہی ضمیر کی گہرائیوں سے ابھر رہی ہے۔ یعنی شریعت جسے میں کسی خارجی طاقت کا دباؤ (جبر) گمان کر رہا تھا۔ وہ تو خود میری ہی فطرت کی اندرونی آواز ہے بالفاظ دگر شریعت جسے میں سمجھ رہا تھا کہ خدا نے اپنی مرضی سے مجھ پر عاید کر دی ہے۔ وہ تو میری ہی فطرت کے تقاضوں کی تسکین کا دوسرا نام ہے۔

یہ وہ حالت ہے۔ جب سالک اس صداقت کو بطور خود دریافت (DISCOVER) کرتا ہے۔ جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذالك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون (۳۰ ۔ ۳۰) اور جب وہ اس حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے تو اُسے یقین کامل ہو جاتا ہے۔ کہ میں تو آزاد ہوں۔ حریت کاملہ سے سرفراز ہوں۔ اگر شریعت کی اتباع کرتا ہوں تو کسی غیر کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا بلکہ خود اپنی ہی فطرت کے تقاضوں کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہوں۔

اسی حقیقت کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے۔

مذہبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے دور کو دورِ ایمان، دوسرے کو دورِ عقلی اور تیسرے کو دورِ بازیافت یا شہود کہہ سکتے ہیں اس تیسرے دور میں نفسیات، منطقی بحثوں اور عقلی دلیلوں کی جگہ لیتی ہے۔ یعنی انسان اپنے اندر، اپنے ضمیر کی گہرائی میں غوطہ زن ہوتا ہے اور مذہبی زندگی سالک کے دل میں یہ آرزو پیدا کر دیتی ہے کہ حقیقت آخری سے براہ راست رابطہ پیدا کیا جائے یہی آرزو جب مرتبہ کمال

کو پہنچ جاتی ہے تو عرف عام میں اسے عشق سے تعبیر کر دیتے ہیں، اس مرحلہ پر پہنچ کر مذہب انسان کو زندگی اور قوت سے بہرہ اندوز کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے اور فرد کی شخصیت احریت سے ہم آغوش ہو جاتی ہے لیکن اسے یہ حریت اس طرح حاصل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو شریعت کی قیود سے آزاد کر لیتا ہے بلکہ اسطرح کہ وہ اس حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے کہ شریعت کا منبع خود اسکے شعور کی گہرائیوں میں ہے۔

اس مفہوم کو مدِ نظر رکھ کر ہم مذہب کو تصوف سے تعبیر کر سکتے ہیں یعنی تصوف نام ہے۔ اس حقیقت کے مشاہدہ کا، کہ شریعت خود انسان کے شعور کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے خارج سے اس پر مسلط نہیں ہوتی۔ افسوس ہے۔ کہ لفظ تصوف آج کل بہت بدنام ہو چکا ہے یعنی اسکے متعلق عام خیال یہ ہے۔ کہ وہ زندگی سے انکار کرنے اور حقائق سے گریز کرنے کا نام ہے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ مذہب جو اپنے اعلیٰ مفہوم کے اعتبار سے وسیع تر زندگی کی جستجو کا نام ہے، اپنی اصل کے اعتبار سے تجربہ اور مشاہدہ کا دوسرا نام ہے۔

(تشکیل جدید خطبہ ہفتم صد ۱۸۱)

اقبال کے اس اقتباس کا مطلب یہی ہے۔ کہ تصوف، مذہب کی روح ہے اور جب تک انسان مسلک تصوف پر گامزن نہ ہو۔ وہ اس حقیقت کو دریافت نہیں کر سکتا کہ شریعت کا منبع خود انسان کے ضمیر میں پوشیدہ ہے۔

میں اس پر اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ صرف عشق میں یہ طاقت ہے۔ کہ وہ انسان کو اُس مقام پر پہونچا سکتا ہے جہاں پہونچکر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے یعنی بچشم خود دیکھ سکتا ہے کہ شریعت

خارج سے تجھ پر مسلط نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کا منبع خود میری ذات (فطرت) میں موجود ہے۔

جب انسان پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو وہ احکام شرعی کا اتباع بغیر کسی خارجی دباؤ کے کرنے لگتا ہے یعنی وہ اپنے آپ کو مجبور نہیں سمجھتا۔ بلکہ بطیب خاطر اتباع شریعت کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنے میں، میں خود اپنی فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہوں۔

دوسرا شعر:۔ اے مخاطب! اگر تو اپنے دین کے اسرار (پوشیدہ حقائق) سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو جا۔ اس کو تصوف کی اصطلاح میں سیر انفس یا مراقبہ کہتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ اگر تو اس حقیقت مذکورہ کا مشاہدہ نہیں کریگا تو تیرے اندر "جبر" کا رنگ پیدا ہو جائیگا۔ یعنی تو اپنے آپ کو مجبور سمجھے گا اور جو شخص اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے وہ خدا سے دور ہو جاتا ہے

چوتھا شعر:۔ یاد رکھ جب تک انسان اس حقیقت کا بطور خود مشاہدہ نہ کرے کہ شریعت کا منبع خود میرے اندر موجود ہے (شریعت خارج سے مجھ پر مسلط نہیں ہوئی ہے) وہ جبر و اختیار کی الجھن سے نجات نہیں پاسکتا۔ یعنی اگر وہ یہ سمجھتا رہیگا کہ شریعت خارج سے مجھ پر مسلط ہو گئی ہے تو وہ احکام شریعت کی پابندی اس طرح کریگا جس طرح ایک غلام یا مزدور اپنے آقا کے احکام کی تعمیل کرتا ہے یعنی وہ تعمیل احکام میں اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے لیکن اگر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے کہ تعمیل احکام شرعی خود میری فطرت کا اقتضا ہے

تو پھر وہ جبر کے دائرہ سے نکل کر حریت (اختیار) کے مقام پر پہنچ جائے گا۔

واضح ہو کہ اقبال نے مسئلہ جبر و اختیار کی بحث اپنی تصانیف میں متعدد مقامات پر اٹھائی ہے اور مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے ذیل میں ان کی تصانیف سے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

(ا) در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار (اسرار خودی)

(ب) چہ گویم از چگون و بے چگونش
برون مجبور و مختار اندرونش
چنیں فرمودہ سلطان بدر است
کہ ایماں درمیان جبر و قدر است
(گلشن راز جدید)

(ج) بال بازاں را سوئے سلطان برد
بال زاغاں را بگورستان برد (بال جبریل)

(د) جبر دین مرد صاحب ہمت است
جبر مرداں از کمال قوت است
جبر خالدؓ عالمے برہم کند
جبر ما بیخ و بن ما بر کند
(جاوید نامہ)

ان اشعار میں اقبال نے جبر و قدر کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے ان کی تشریح میں ان کتابوں کی شروح میں درج کر چکا ہوں یہاں اس شعر کی وضاحت میں چند باتیں لکھنی چاہتا ہوں

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار
بر نمی آید ز جبر و اختیار

واضح ہو کہ یہاں اقبال کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ انسان من کل الوجوہ مختار بن جاتا ہے کیونکہ یہ بات تو سلطان بدر سرکار ابد قرار صلعم کے ارشاد کے خلاف ہے۔ حضور نے اس حقیقت کو خود واضح کر دیا ہے

ع گر ایمان در میان جبر و قدر است

یعنی مسلمان وہ ہے۔ جو یہ تسلیم کرے کہ "الایمان بین الجبر والاختیار" یعنی انسان بعض معاملات میں مجبور ہے اور بعض میں مختار۔ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ کوئی شخص ہر اعتبار سے مختار نہیں ہو سکتا۔ بعض امور میں یقیناً مجبور ہے لیکن یہاں اقبال جس جبر کی نفی کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ میں شریعت کے ان احکام کی تعمیل پر مجبور ہوں اور اس غلطی کا منبع یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ شریعت خارج سے مجھ پر مسلط ہو گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر تم "حق" کو دیکھ لو اور یہاں لفظ حق سے مراد ہے یہ حقیقت کہ

شرع بر خیزد ز اعماق حیات

یعنی شریعت خود انسان کے ضمیر کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے (شریعت کا منبع خود اسی کی فطرت میں مرکوز ہے) تو پھر تم تعمیل احکام شرعی میں اپنے

آپ کو مجبور قرار نہیں دو گے بلکہ بخوشی شریعت کے احکام کی تعمیل کرو گے یعنی بتمام اتباع کرو گے۔ تو اس یقین کے ساتھ کرو گے کہ میں کسی خارجی دباؤ کے تحت ایسا نہیں کر رہا ہوں بلکہ خود اپنی فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہوں یعنی خود فطرت انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ احکام شریعت کی تعمیل کی جائے۔

پانچواں شعر:- لہٰذا اے مخاطب! تو اپنی فطرت کا مطالعہ کر (مطالعہ فطرت کو اصطلاح میں مراقبہ کہتے ہیں) تجھے معلوم ہو جائیگا کہ اسلام تیری فطرت کے عین مطابق ہے۔ یعنی شریعت اسلامیہ فطرت انسانی سے مطابقت کلی رکھتی ہے۔

لہٰذا تو صحبت شیخ میں بیٹھ کر "مرد حق" بن جا۔ یعنی اپنی فطرت کا مطالعہ کر اور ظن و تخمین، یعنی اپنے ذاتی خیالات پر اعتماد مت کر۔

مشام تیز سے صحرا میں ملتا ہے نشاں اُس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوے تاتاری

یعنی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے تجھ کو طریقت کے دائرہ میں داخل ہونا پڑیگا۔ جب تو صحبت شیخ میں بیٹھ کر سلوک کی منزلیں طے کریگا (اسی کو طریقت کہتے ہیں) تو تجھے یہ دولت نصیب ہو گی یعنی اُس وقت تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ

ع۔ شرع بر خیزد ز اعماق حیات

چھٹا شعر:- اس وقت تجھے خیر و شر کا صحیح علم حاصل ہو جائیگا اُس وقت تجھ میں نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی طاقت پیدا ہو جائیگی اور اس وقت تو زمانہ کا تحفات سے آگاہ ہو سکے گا۔

ساتواں شعر:- یاد رکھ! جو شخص عشق رسول کی بدولت نبوت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے یعنی جو شخص فنا فی الرسول کا مقام حاصل کر لیتا ہے اس میں نبوت کے خواص ظلی طور پر منعکس ہو جاتے ہیں اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو پھر وہ جبریل امین کا قرب حاصل کر لیتا ہے یعنی اللہ تو بواسطہ رسول اس مرد مومن کو بھی اپنے الہامات سے سرفراز فرما دیتا ہے لہ

لہ واضح ہو کہ نبوت تو سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے لیکن مبشرات یعنی الہامات کا دروازہ بواسطہ حضور مومنوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اور جب ایک مومن حضور کی اتباع کاملہ کی بدولت اپنے آپ کو ذات رسالت مآب میں فنا کر دیتا ہے۔ جسے اصطلاح میں "فنا فی الرسول" کا مقام کہتے ہیں۔ تو اللہ اُس مومن کو الہام کی نعمت سے سرفراز فرما دیتا ہے۔ چنانچہ امام ربانیؒ حضرت مجدد الف ثانی رح اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ رح نے اپنی تصانیف میں اس بات کو واضح کر دیا ہے۔ اور شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی رح نے بھی فتوحات مکیہ میں اپنے الہامات کا تذکرہ کیا ہے۔ نیز سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح الہام ربانی کی بنا پر تبلیغ کے لئے ہندوستان تشریف لائے تھے۔

کنز اللہ تو اشاہم۔ ۱۲

حاصل کلام اینکہ ان اشعار میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگرچہ امور تکوینی (نظام عالم) میں ہر انسان مجبور ہے، بقول شخصے

؎ جسے چاہا جیسا بنا دیا تیری شان جل جلالہٗ

لیکن امور تشریعی (اکتساب خیر) میں ہر انسان مختار ہے جو شخص ان امور میں بھی اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ شریعت خارج سے مجھ پر مسلط ہو گئی ہے یعنی کسی خارجی طاقت نے یہ بار گراں میرے سر پر رکھ دیا ہے اور میں اس کو اٹھانے پر مجبور ہوں۔ اس احساس جبر کی وجہ سے وہ ساری عمر خدا سے دور رہتا ہے۔ یعنی خدا کو ایک قاہر اور جابر ہستی سمجھتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ آپ جس شخص کو قاہر اور جابر سمجھیں گے اس سے کبھی محبت نہیں کر سکتے۔

؎ ایں چنیں دیں را خدا مہجوری است

اسی نکتہ کو اقبال نے باندازِ دگر یوں بیان کیا ہے۔

بے تجلی زندگی رنجوری است

عقل مہجوری و دیں مجبوری است (جاوید نامہ)

یعنی جب تک انسان کے اندر عشق کا رنگ پیدا نہ ہو (جس کا ثبوت تجلی سے مل سکتا ہے۔ یعنی تجلی سے صرف عاشق ہی بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔) اس کی زندگی اس کے حق میں رنجوری (مصیبت عذاب یا الم ہے) اور اس کی عقل خدا سے مہجوری کا سبب ہے۔ اور اس کا دین سراپا جبر ہے۔

لیکن جب ایک شخص مسلک عشق اختیار کر لیتا ہے تو پھر وہ اس

حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے۔ کہ شریعت خود میرے ضمیر کی گہرائی سے ابھر رہی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی تعمیل میں بیحد مسرت محسوس کرتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی خدا کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے یعنی من تو شدم تو من شدی[1] والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ (اسی حالت کو مقام رضا کہتے ہیں)

جب یہ حالت ہو جاتی ہے۔ تو اللہ کی مرضی (شریعت) سالک کی ذاتی مرضی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جب وہ احکام شریعت کی تعمیل کرتا ہے تو وہ گویا اپنی مرضی پر چلتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اپنی مرضی پر چلنے میں ہر شخص کو مسرت حاصل ہوتی ہے

طریقت نام ہے اس بات کا کہ سالک کی ذاتی مرضی (جسے ہوا کہتے ہیں) فنا ہو جائے۔ اور اللہ کی مرضی اسکی مرضی ہو جائے اس مقام پر پہنچ کر سالک کی دنیا ہی بدل جاتی ہے کائنات کا ہر ذرہ اسے اپنا محکوم اور خادم (زیر فرمان) نظر آتا ہے اور بات بھی صحیح ہے۔ جسے اللہ کی محبت اور اُس کا قرب حاصل ہو جائے وہ بھلا مجبور کیسے ہو سکتا ہے۔

خدا کے ساتھ نہیں ہو تو کچھ نہیں ہو تم
خدا کے ساتھ اگر ہو تو پھر خدا ہی ہے! (اکبر الہ آبادی)

مرشد رومی فرماتے ہیں ؎
خلق اطفال اند جز مرد خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

پھر یہ ساری کائنات سالک کے اشاروں پر رقص کرتی ہے کیونکہ

(ا) یہ کائنات خدا کے حکم کی پابند ہے - اس کی مرضی کے مطابق حرکت کرتی ہے .

(ب) چونکہ سالک کی مرضی وہی ہو جاتی ہے جو خدا کی مرضی ہے

(ج) اس لئے یہ کائنات، سالک کو اپنی مرضی کے مطابق گردش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے .

فی الجملہ جب معیّتِ حق نصیب ہو جاتی ہے تو مومن "جبر" کے دائرہ سے نکل جاتا ہے . چنانچہ مرشد رومی فرماتے ہیں :-

ایں معیت با حق است و جبر نیست

ایں تجلّی مہ است و ابر نیست

غور سے دیکھو تو سارے مسئلے اور ساری الجھنیں "دوئی" سے پیدا ہوتی ہیں . جب یہ دوئی مٹ جاتی ہے (اور تصوف اسی دوئی کو مٹانے کی ترکیب کا نام ہے) اور سالک خدا کی مرضی کو اپنی مرضی بنا لیتا ہے تو جبر و اختیار کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے ؎

چوں فنا اندر رضائے حق شود

بندہ مومن قضائے حق شود

پھر اس کے جبر میں اختیار کا اور اختیار میں جبر کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے . اگر ایک طرف وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں فنا کر کے بظاہر مجبور بلکہ کالمیت (مثلِ مردہ) بن جاتا ہے تو دوسری طرف اس کا مولیٰ اُس کی نگاہ کو دیکھتا رہتا ہے . اور جس طرف وہ چاہتا ہے اُسی طرف تحویلِ قبلہ کر دیتا ہے [1]

[1] دیکھو حاشیہ ص ۵۲۵

لیکن یہ سب کچھ اپنے "دیدار" پر موقوف ہے۔ اور اسی لئے اقبال نے ہر جگہ دیدار کی اہمیت واضح کی ہے:

چیست دیں؟ دریافتن اسرار خویش
زندگی مرگ است بے دیدار خویش

اشعار ۴ تا ۸:۔ شریعت اور طریقت کا مفہوم واضح کرنے کے بعد اب اقبال مردِ مومن سے جلالی رنگ میں خطاب کرتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو قرآن حکیم پر ناز کرتا ہے یعنی اگر تو اس کو بنی آدم کے لئے بہترین اور افضل ترین اور کامل ترین دستورِ حیات یقین کرتا ہے، تو پھر تو حجرے میں کیوں بیٹھا ہوا ہے۔

اٹھ! دنیا کو اس دین کی خوبیوں سے آگاہ کر! دین اسلام کے حقائق و معارف ساری دنیا میں بیان کر! اور دنیا والوں کو شریعت کی سب سے بڑی خوبی سے روشناس کر دے۔

اور وہ خوبی کیا ہے؟ نکتہ شرع مبیں کیا ہے؟ یہ کہ ایسا نظام حکومت قائم کرو۔ جس میں کوئی انسان اپنی ضروریات کے لئے کسی

لہ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اے رسول! حکم تحویل قبلہ کے انتظار میں ہم آپ کو منہ اٹھا اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنا ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ تو آپ پریشان نہ ہوں۔ جس قبلہ کی طرف آپ منہ کرنا چاہتے ہیں، ہم آپ کو اسی طرف منہ کرنے کا حکم دیں گے اچھا تو پھر آپ نماز پڑھتے وقت مسجد مکرم (کعبہ) ہی کی طرف منہ کر لیا کیجیے۔ (۲ – ۱۴۴)

دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ ہم ابتداء میں واضح کر چکے ہیں کہ قرآن حکیم نے ایسا عمدہ معاشی نظام دنیا کو عطا فرمایا ہے۔ کہ اگر اس کو نافذ کر دیا جائے، تو

کس نباشد در جہاں محتاج کس

اشعار (۱۱، ۱۲) : اپنا فرض ادا کر دینے کے بعد اب اقبال اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ چونکہ علماء نے حق گوئی کے بجائے "سخن سازی" کو شیوہ زندگی بنا لیا۔ اس لئے افراد قوم (مومناں) اس نکتہ سے واقف ہی نہ ہو سکے۔ کہ اسلام ملوکیت کا شدید ترین دشمن ہے۔ بلکہ وہ دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کرنی چاہتا ہے۔ جس میں ہر شخص کو روٹی ملے گی، کپڑا ملے گا، مکان ملے گا۔ تعلیم ملیگی۔ اور انصاف ملے گا اور عزت ملیگی۔

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان تو زندہ قوم تھے۔ مگر علماء نے تاویلات رکیکہ کا دروازہ کھول کر ان کو روحانی اور اخلاقی اعتبار سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ یعنی ملوکیت کا نوکر بنا دیا۔ اور جب وہ بندوں کی غلامی کرنے لگے۔ تو

ع آتش او در ضمیر او فسرد

وہ آگ جو قرآن حکیم نے ان کے دلوں میں بھڑکائی تھی۔ ٹھنڈی ہو گئی۔

"آتش" کنایہ ہے جذبۂ حریت سے جو قرآن حکیم نے ان کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔

از تاویل "مرد" سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ جب دورِ خلافت ختم

ہو گیا۔ اور مسلمانوں کی شومئی قسمت سے ملوکیت کی لعنت ان پر مسلط ہو گئی یعنی۔

تو ز طلسم قیصر و کسریٰ شکست
تو ز سر تخت ملوکیت نشست

تو بادشاہوں نے علماء اور فقہاء کو حکم دیا کہ اب تم قرآن و حدیث کی وہ تفسیر بیان کرو جو ہماری خواہش کے مطابق ہو اور ہماری خواہش یہ ہے۔ کہ قرآن و حدیث سے ملوکیت کا جواز ثابت کرو تاکہ مسلمان ہمارے خلاف علم بغاوت بلند نہ کریں علماء اور فقہاء نے (با استثنائے معدودے چند) اپنی جان کے خوف سے قرآن و حدیث کو بادشاہوں کی مرضی کے سانچہ میں ڈھال دیا۔ جن علماء نے بادشاہوں کے احکام کی تعمیل سے انکار کیا۔ ان ظالموں نے ان حق پرستوں کو محبوس زنداں کر دیا۔ اگر اس بات کی تفصیل بیان کروں تو یہ شرح بنو امیہ اور بنی عباس کے دور کی تاریخ میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس لئے قلم روکتا ہوں اور یہ واضح کرتا ہوں

(ا) اسلام ملوکیت کی ضد ہے۔

(ب) اسلام نے انسان کو انسانوں کی غلامی سے آزادی عطا کی، آزادی زندگی ہے۔

(ج) ملوکیت نے انسانوں کو انسانوں کا غلام بنا دیا۔ غلامی بروئے قرآن موت ہے۔

(د) اس لئے اقبال نے بالکل صحیح لکھا ہے۔

؎ زندہ قومے بود از تاویل مرد

اشعار ۱۳ تا آخر:- ان آخری اشعار میں اقبال نے عصر حاضر کے علماء فقہاء

اور صوفیہ کی روش پر تنقید کی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ میں نے صوفیوں کی زندگی بھی دیکھی ہے اور علماء کے طرز عمل کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ بلکہ میرے زمانہ میں تو ایک پیغمبر بھی پیدا ہوا۔ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا قرآن میری نبوت پر شاہد ہے لیکن یہ تینوں قرآن وحدیث کا علم رکھنے کے باوجود اسلامی شریعت کے مفہوم سے بیگانہ ہیں۔ کیوں؟ اسلئے کہ ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کو ملوکیت کا خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا درس نہیں دیتا۔

بیشک ان حضرات نے عقلی اور نقلی دونوں قسم کے علوم حاصل کئے ہیں۔ مگر وہ جملہ علوم ان کی ذاتی اغراض کے پابند ہیں یہ جس منبر پر بیٹھ کر قرآن اور حدیث کا درس دیتے ہیں وہ منبر علم نہیں ہے بلکہ منبر کاک ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جس طرح نانبائی اپنے منبر پر روٹی (کاک) رکھ کر بیچتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے منبر پر اپنا ضمیر یا علم دین رکھ کر فروخت کرتے ہیں۔

اگرچہ یہ لوگ اپنے آپ کو انبیاء کے جانشین کہتے ہیں مگر ان کی آستین ید بیضا سے محروم ہے۔ یعنی ان میں انبیاء کی کسی صفت کا عکس نظر نہیں آتا۔ لہذا یہ لوگ قوم کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔ اس لئے اے مسلمان! اب تو ہی اپنے عمل سے یہ بات ثابت کر کہ اسلام ایسا دین ہے جو قوموں کی بگڑی بنا سکتا ہے ۱۲

فصل دھم

اشکے چند بر افتراق ہندیاں

تمہید :- واضح ہو کہ اقبال نے یہ مثنوی ۱۹۳۶ء میں لکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا اختلاف اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا۔ کہ اتحاد کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ اس جگہ بیسویں صدی کی سیاسی تاریخ لکھنی تو مقصود نہیں ہے لیکن اس قدر صراحت ضروری ہے کہ

(۱) ۱۹۲۰ء میں ہندو مسلمانوں میں عارضی طور پر اتحاد ہو گیا تھا

(۲) انگریزوں کو یہ اتحاد ایک آنکھ نہ بھایا اور بھانا بھی کیسے؟ وہ تو ابتدا ہی سے دونوں قوموں کو آپس میں لڑا رہے تھے۔ مثلاً

(ا) ۱۷۹۹ء میں دولت خداداد کے شیعوں کو سلطان شہید رح کے خلاف بھڑکایا۔ کہ اگر تم اس وقت ہماری مدد کرو گے تو تمہیں مراسم مذہبی ادا کرنے کی کامل آزادی عطا کی جائے گی

(ب) ۱۸۵۷ء میں سکھوں کو یہ کہہ کر تسخیر دہلی کے لیے آمادہ کیا۔ کہ دلی کے مسلمانوں سے اپنے گرو (تیغ بہادر) کے خون کا بدلہ لے لو!

(ج) ۱۹۰۱ء میں یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر نے ہندوؤں سے کہا کہ تم اردو کی بجائے ہندی کی اشاعت کرو (اس سے پہلے ہندوستان میں اردو، ہندی کا کوئی مسئلہ موجود نہ تھا۔

(ت) چونکہ ایک عرصہ سے انگریز ہندو نواز پالیسی پر عمل کر رہے تھے اس لئے ۱۹۰۵ء میں انہوں نے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے تقسیم بنگال کا اعلان کر دیا گیا۔ گویا مشرقی بنگال کو آسام کے ساتھ ملا کر خود مشرقی پاکستان قائم کر دیا۔

(ک) چونکہ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی بے اندازہ مخالفت کی۔ اس لئے ۱۹۱۱ء میں انگریزوں نے مجبور ہو کر تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا۔ یہ حکم تنسیخ بقول نواب وقار الملک "ایک توپخانہ تھا جو مسلمانوں کو روندھتا ہوا چلا گیا۔

(و) ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے جھگڑے میں ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑایا۔

(ن) جب ۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد زندہ باد کے نعرے بلند ہو رہے ہیں تو لالہ منشی رام جالندھری آریہ سماجی کا نگریسی المعروف بہ سوامی شردھانند" کو اس شرط پر جیل سے رہا کیا۔ کہ باہر نکل کر خرمن اتحاد میں آگ لگا دو۔ چنانچہ اس شخص نے جیل سے باہر نکلتے ہی دھولپور بھرتپور اور آگرہ کے ملکانوں کو "شدھ" کرنے کا کام شروع کر دیا۔ قربان جایئے انگریز کی سیاست کے، ایسا منتر پھونکا کہ ہندو مسلم اتحاد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا یا تو ۱۹۲۲ء میں ہندو مسلمان باہم گلے مل رہے تھے۔ یا ۱۹۲۳ء میں سارا ہندوستان "شدھی اور سنگھٹن" اور تبلیغ و اشاعت اسلام کے نعروں سے گونج اٹھا۔

(ح) ۱۹۲۵ء میں انگریز نے سوچا کہ اگر پنجاب میں مسلمان اور سکھ متحد ہو گئے تو ہمارا اقتدار ختم ہو جائیگا۔ اس لیے سکھوں سے کہا کہ تم مسجد شہید گنج (لاہور) کے حصول کے لیے ہائی کورٹ میں دعویٰ دائر کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں چنانچہ انگریزوں نے اپنی نگرانی میں دن دہاڑے مسجد کو شہید کرا دیا۔

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ انگریز ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عامل رہا۔ چنانچہ جاتے جاتے ضلع گورداسپور کو بلا وجہ تقسیم کر کے کشمیر کا مسئلہ پیدا کرتا گیا۔ جو تا ایں دم ہندوستان اور پاکستان کے درمیان استخوان منازعت بنا ہوا ہے۔

اس پر مستزاد یہ ہوا۔ کہ کانگریس نے ۱۹۳۷ء میں برسر اقتدار آ کر مسلمانان ہند کے ساتھ شدید ناانصافی پر کمر باندھ لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں نے تقسیم ہند کا مطالبہ پیش کر دیا۔ اور ۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی صوابدید کے مطابق تقسیم کر دیا۔

اس فصل میں بعض باتیں ناظرین کو ایسی ملینگی جو موجودہ حالات میں خارج از بحث ہیں اور اس کی وجہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی۔ اور ۱۹۴۷ء میں انقلاب برپا ہو گیا ناظرین ان امور کو ذہن میں رکھ کر اس فصل کا مطالعہ کریں۔

خلاصۂ مباحث:۔ اس فصل میں دو بند ہیں پہلے بند میں اقبال نے مسلمانوں کو انقلاب برپا کرنے کی دعوت دی ہے۔ دوسرے بند میں انقلاب برپا کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(ا) اسلامی خطوط پر انقلاب اس وقت برپا ہو سکتا ہے۔ جب مسلمان اپنے دل کو زندہ کرے۔

(ب) اور دل زندہ ہوتا ہے درویشی اختیار کرنے سے

ایں چنیں دل خود نگر اللہ مست
جز بدرویشی نمی آید بدست

(ج) اور درویشی کا رنگ کسی درویش کی صحبت میں بیٹھنے ہی سے چڑھ سکتا ہے۔ (ٹھیک جس طرح کپڑے پر رنگ چڑھانا ہو تو اُسے کسی رنگریز کے پاس لے جاتے ہیں)

(د) اس لئے اقبال نے یہ تلقین کی ہے۔

اے جواں دامانِ او محکم بگیر
در غلامی زادۂ آزاد میر

نوٹ:۔ اس جگہ اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ انقلاب کی دو قسمیں ہیں اسلامی اور غیر اسلامی۔

اقبال کی آرزو یہ تھی۔ کہ مسلمان اسلامی انداز میں انقلاب برپا کریں اسی لئے انہوں نے ان کو اپنے اندر شانِ درویشی پیدا کرنے کی ہدایت کی تھی۔ چونکہ مسلمانوں نے ان کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ اس لئے انقلاب تو برپا ہوا۔ مگر غیر اسلامی خطوط پر ہوا۔ جس کا نتیجہ ہم اپنی

آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

"میاں راجہ بیان"

پہلا بند :- کہتے ہیں اے باشندگان ہند (بنگالہ) اے مسلمانو (اٹک) اے ہندو (گنگ) تم کب تک غلامی کی زندگی بسر کرتے رہو گے۔ تمہاری یہ حالت ہے۔ کہ تم میں جو لوگ بوڑھے ہیں ان میں دانائی اور دور اندیشی کا فقدان ہے۔ اور نوجوان مجتہدے پیگانہ ہیں۔

یہی وجہ ہے۔ کہ دوسری قومیں تو آزاد ہیں مگر ہم غلام ہیں کچھ یہ ہے۔ کہ غلامی کی زندگی زبر مراد دیگراں مرگ جاوداں ہے۔ نہ کہ خواب گراں۔ مگر یہ موت وہ نہیں جو اللہ کے حکم (آسمان) سے آتی ہے۔ بلکہ یہ موت ہے۔ جو زندگی کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے۔ یعنی غلامی کا (وہ بہت لعنت) ہے جسے انسان خود اپنے اوپر وارد کرتا ہے۔ خارج سے اس پر وارد نہیں ہوتی۔ اس موت کی دوسری خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس مردے کو غسال کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ کفن کی۔ نہ قبر کی اور نہ کوئی شخص اس کی موت پر رنج و غم کرتا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ غلام مرنے کے بعد دوزخ میں نہیں جاتا۔ بلکہ یہی دنیا اس کے لئے دوزخ بن جاتی ہے۔ یعنی جیتے جی دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ع ہست در امروز او فرد اے او

بات بھی ٹھیک ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ پھر ایسے بندے کو خدا کے سامنے لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔؟

کہتے ہیں کہ فطرت کا قانون یہ ہے۔ کہ جو قوم آزادی کی آرزو اپنے دل میں پیدا نہیں کرتی پھر اس آزادی کی تکمیل کے لئے جد و جہد نہیں کرتی، اس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔

اے مخاطب! ملوکیت ساحری کی ایک قسم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ملوکیت اپنی ذات کے اعتبار سے شیشہ کی طرح کمزور ہے مگر ارباب ملوکیت عوام کے دل و دماغ پر کچھ ایسا جادو کر دیتے ہیں کہ وہ ان کی نگاہ میں پتھر کی طرح سخت مستحکم معلوم ہوتی ہے۔

اس ملوکیت کی بدولت ہندو اپنے کفر سے اور مسلمان اپنے دین سے بیگانہ ہو گئے اور آپس میں لڑنے لگے مطلب یہ ہے کہ ہندو دھرم اور اسلام دونوں نے محبت، ہمدردی اور رحمدلی و شردھا کرپا اور دیا کی تعلیم دی ہے مگر ہندو اور مسلمان دونوں نے اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات کو فراموش کر دیا ان کے باہمی اختلافات کی وجہ سے فرنگیوں کو ہندوستان فتح کرنیکا موقع مل گیا۔ اب ان کی غلامی سے رہائی پانے کی صورت یہ ہے کہ انقلاب برپا کیا جائے یعنی ہندوستان کے باشندے جلوۂ آب (آزادی) شراب (غلامی) میں فرق نہیں کر سکتے اس لئے ضرورت ہے اس امر کی کہ ایک انقلاب برپا کیا جائے۔ جس کی بدولت دونوں کو آزادی کی نعمت حاصل ہو سکے۔

دوسرا بند :- اے مخاطب! تو ہر وقت جسمانی ضروریات اور مادی خواہشات کی تسکین میں منہمک ہے۔ ہر لحظہ سامان آسائش مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر تو آزادی کا طالب ہے۔ تو مادیات اور لذات جسمانی سے قطع نظر کر اور اللہ تعالیٰ سے ایسا دل طلب کر جو جذبہ حریت سے سرشار ہو۔

آئندہ آٹھ اشعار میں اقبال نے اس دل کی خصوصیات بیان کی ہیں جن کو مجموعی طور پر ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) کہتے ہیں کہ یہ دل اگرچہ پایا تو اسی جسم میں جاتا ہے مگر ہے اس قدر قیمتی اور مفید کہ ساری کائنات (نہ فلک) اس کی تلاش میں سرگرداں ہے کیوں؟ اس لئے کہ یہ دل ساری کائنات کے حق میں پیام رحمت ہے۔ جس شخص کے سینہ میں ایسا دل ہوتا ہے وہ ساری کائنات کو عدل و انصاف اور آسمانی برکات سے معمور کر دیتا ہے۔

(۲) اے مخاطب! یہ گمان مت کر کہ وہ دل آب و گل (ذرات مادی) کی پیداوار ہے وہ مادہ میں ہے۔ مگر مادی نہیں ہے وہ تو عشق (آسمان) کا ثمرہ ہے۔ یعنی بذات خود دل "انبار گل" ہے۔ مگر جب اس میں عشق کی آگ سلگتی ہے تو وہ حقیقی معنی میں دل بن جاتا ہے۔

دل از ذوق تپش دل بود لیکن
چو از ذوق تپش افتاد گل شد
(پیام مشرق)

یہ دل جس میں عشق کارفرما ہو۔ خاکی نہیں ہے۔ بلکہ افلاکی ہے۔ یعنی عالم لاہوت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسی لئے یہ سارا جہان اسکی نگاہ میں "حریم کوئے دوست" ہے۔ یعنی عاشق ساری دنیا سے محبت کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں ہندو اور مسلمان دونوں عیال اللہ، اللہ کے کنبے کے افراد ہیں۔

اس کی قبائے لالہ سے بھی دوست (خدا) ہی کی خوشبو آتی ہے۔

قبائے لالہ میں ایہام ہے۔ اس سے گل لالہ بھی مراد ہو سکتا ہے یعنی لالہ خدا کی صنعت پر شاہد ہے۔ اور قبائے لالہ سے خون شہداء بھی مراد ہو سکتا ہے۔ یعنی ایسا دل انسان کو شہادت پر آمادہ کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک خدا کی محبت دل میں موجزن نہ ہو کوئی شخص قبائے لالہ دربر نہیں کر سکتا۔

(۴) عاشق ہر وقت باطل سے برسر جنگ رہتا ہے اور اس کی ہر ضرب کاری ہوتی ہے۔

(۵) عاشق منبر اور دار دونوں سے آشنائی رکھتا ہے یعنی وہ منبر پر بیٹھ کر قرآن و حدیث کا درس بھی دے سکتا ہے اور بوقت ضرورت قرآن و حدیث کی عزت کی خاطر دار کو بھی اپنے وجود سے مشرف کر سکتا ہے۔ اور بڑے اطمینان کے ساتھ یہ شعر پڑھ سکتا ہے۔

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست
تو نیز برسر بام آکہ خوش تماشائیست

(۶) یہ دل۔ عاشق زندہ رہنے کے لئے روٹی کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو صرف اپنے معشوق کے درشن کی بدولت زندہ رہتا ہے اور جب درشن (حضور) سے محروم ہو جاتا ہے یعنی جب خدا سے غافل ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے

آخری دو شعر:۔ اے مخاطب! ایسا دل جو خود نگر ہو اور اللہ کی محبت میں سرشار ہو شان درویشی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور درویشی ایک فن ہے اور ہر فن اس فن کے ماہر کی صحبت میں بیٹھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے درویشی کا فن حاصل کرنے کے لئے درویشوں کی صحبت

اختیار کرو۔

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس اُن کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

اس لئے اسے مخاطب! تو اس دل کا دامن تھام لے یعنی مسلک عشق اختیار کرلے نتیجہ اس کا یہ ہوگا۔ کہ اگرچہ تو غلامی میں پیدا ہوا ہے مگر آزادی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوگا۔

نوٹ:- واضح ہو کہ اس دل کی تعریف اقبال نے یہ کی ہے کہ وہ "خود نگر" اور "اللہ مست" ہوتا ہے۔ دراصل یہ دونوں صفات ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ لیکن جب تک انسان اللہ مست (عاشق خدا) نہ ہو اس کا دل خود نگر نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جب تک انسان خود نگر نہ ہو وہ اللہ مست نہیں بن سکتا اور عشق، کتابوں کے شائع کرنے یا تقریریں کرنے یا انتخابات میں حصہ لینے یا پوسٹر شائع کرنے یا قربانی کی کھالیں جمع کرلے سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ دولت تو صرف عاشقوں کی صحبت میں بیٹھنے یا بقول اقبال ان کی پیروی کرنے سے حاصل ہوسکتی ہے۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
(بانگ درا)

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر
(مسافر)

فصل یازدہم

سیاسات حاضرہ

تمہید :- اس فصل میں چار بند ہیں پہلے بند میں اقبال نے موجودہ مغربی سیاست کی ماہیت اور کیفیت بیان کی ہے۔
اور اقوام شرق کو اس سے اجتناب کی تلقین کی ہے دوسرے بند میں ہندی مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں کی مذہبی اور اخلاقی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

ع در حرم زاد و کلیسا را مرید

تیسرے بند میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ غلاموں کو سرکار ابدقرار پر درود بھیجنے کا کوئی حق نہیں ہے:

تا نہ داری از محمدؐ رنگ و بُو
از درود خود میالا نام اُو

چوتھے بند میں مسلمانان ہند کی حالت زار کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ کہ غلام قوم کے افراد خواہ حافظ قرآن کیوں نہ ہوں، لذت ایمان سے محروم رہتے ہیں اس تعارف کے بعد اب ہم اس فصل کی شرح ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

---

پہلا بند :- مغربی سیاست (سیاسات حاضرہ) کی نمایاں خصوصیات

حسب ذیل ہیں :-

(۱) یہ سیاست بنی آدم کے حق میں رحمت اور برکت ہونے کے بجائے سراسر زحمت اور لعنت ہے۔ کیونکہ انسانوں کو انسانوں کا غلام ہی نہیں بناتی بلکہ غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط کرتی ہے اسی لئے مردان حُر اسے اندھی سیاست کہتے ہیں۔

(۲) جب ارباب سیاست نے دیکھا کہ عوام میں کچھ سیاسی شعور پیدا ہو گیا ہے تو ملوکیت کے چہرے پر جمہوریت کی نقاب ڈالدی۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری (بانگ درا)

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

(ارمغان حجاز)

یعنی اقبال کی رائے میں جمہوری حکومت بھی در پردہ ملوکیت ہی ہے کیونکہ جمہوریت میں بھی اقتدار ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جسے "وزیر اعظم" کہتے ہیں

(۳) جب عوام نے جمہوریت کے خلاف زبان کھولی تو ارباب سیاست نے لیگ آف نیشنز بنائی۔ اور جب دوسری جنگ عظیم میں کفن چوروں کی اس مجلس کا خاتمہ ہو گیا۔ تو اس کی خاکستر سے یو۔این۔او (ادارہ قوم متحدہ) عالم وجود میں آگیا چنانچہ ارباب سیاست نے بہت سی سلطنتوں کو متحد کر کے ایک سلطنت بنا دی۔ اور یہ کہا۔ کہ دوستو! کہ سلطنت کوئی مذموم شئے نہیں

نہیں ہے بلکہ وہ تو جامع اقوام ہے ۔ بیشک انہوں نے یہ کہہ کر اپنا کام تو درست کرلیا ۔ (یعنی عوام کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوگئے) لیکن جو بات کہی وہ سراسر غلط ہے ۔ سلطنت جامع اقوام نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے ۔

(۴) اس سیاست کی فضا میں کوئی انسان اپنی رائے کا اظہار نہیں کرسکتا یعنی کسی کو حریت کی نعمت حاصل نہیں ہوسکتی ۔ بظاہر تو یہ عوام کی حکومت ہے عوام پر لیکن دراصل صاحب اقتدار پارٹی کی حکومت ہے ساری قوم پر ۔ اور چونکہ پارٹی کا نصب العین یہ ہے کہ اقتدار ہاتھ سے نہ جانے پائے اس لئے پارٹی کے افراد تمام اخلاقی اقدار حیات سے بیگانہ ہوتے ہیں ان کی رائے میں ہر وہ کام "خیر" ہے جس سے اقتدار محفوظ رہے ۔ یہی تو وجہ ہے کہ

؎ در فضایش بال و پر نتواں کشود

جو شخص بھی اظہار رائے کے "جرم" کا ارتکاب کرتا ہے برسر اقتدار پارٹی اُسے "سیفٹی ایکٹ" کے شکنجہ میں کس دیتی ہے ۔

(۵) ارباب سیاست ہر وقت مکر و فن سے کام لیتے ہیں اور محکوم اقوام (مرغان قفس) سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے زیر سایہ زندگی بسر کرو ۔ اپنا آشیاں صیاد کے گھر میں بناؤ ۔ کیونکہ جو پرند اپنا آشیانہ جنگل میں بناتا ہے ۔ وہ شاہین اور چرغ سے محفوظ نہیں رہ سکتا ۔ یہ وہ افسوں ہے کہ اس کی بدولت مرغ دانا (چونکہ طالب رزق تھا اس لئے) صیاد کے دام میں پھنس کر آزادی سے محروم ہوگیا ۔

اے مخاطب! اگر تو حریت کا طالب ہے تو اس سیاست کے

پھندے میں نہ آنا۔ اس کے پانی کے مقابلہ میں پیاسا مرجانا بہتر ہے۔

موجودہ ارباب سیاست بڑی دلکش تقریریں کرتے ہیں مگر وہ صداقت اور خلوص سے یکسر خالی ہوتی ہے۔ پس خدا توفیق دے تو آدمی ان کی ڈپلومیٹک (پہلو دار) گفتگو سے دور ہی رہے۔ اس لئے اے مخاطب! اگر تو حریت کا طالب ہے تو اپنی خودی کی حفاظت کر اور ان لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں (حبوب افیون) میں ہرگز نہ آ۔ بلکہ تو ان کے مقابلہ میں سچائی کا علم بلند کر۔ تاکہ ان کے مکروفریب کا پردہ چاک ہو جائے۔

دوسرا بند :۔ مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ افسوس یہ ہے۔ کہ ان کے رہنما دینداری (نور جاں) سے کوسوں دور ہیں۔ بلکہ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ تن پرست ہیں طالب جاہ ہیں، کم نگاہ ہیں۔ اور اسلام سے ناواقف ہیں اگرچہ وہ مسلمانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ مگر انگریزوں کے ہوا خواہ ہیں۔ ان کے طرز عمل سے ملت اسلامیہ ذلیل ہو گئی ہے اسلئے ان لوگوں کی پیروی میں سراسر نقصان ہے۔

اے مخاطب تو ان پر بھروسہ مت کر۔ کوئی شخص اندھے کتے کی مدد سے ہرن کو شکار نہیں کر سکتا۔

افسوس ہے کہ اس قوم پر جو اپنی خودی سے غافل ہو گئی اور جس نے غیر اللہ پر بھروسہ کر لیا ہو۔

چونکہ قوم اپنی خودی سے غافل ہو گئی ہے اسلئے ضعیف ہو گئی اور مخالف قوتیں اس پر غالب آ گئیں۔

اگرچہ مسلمان توحید کے مدعی ہیں مگر ان میں کوئی شخص ایسا پیدا نہ

ہوا۔ جو دشمنوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ سکتا یا جس کی شخصیت سے اسلام کا بول بالا ہوتا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں میں غیرت دینی باقی نہ رہی۔ بلکہ ساری قوم (حرم) میں ایک بھی اللہ کا بندہ نظر نہیں آتا۔

اے مسلمان! تو کب تک شیطان کے پھندے میں گرفتار رہیگا۔ یاد رکھ! تیری کوشش اس وقت تک بارآور نہیں ہو سکتی اور تیری طلب میں اُس وقت تک لذت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک تو آدھی رات کو اٹھ کر خدا سے دعا نہ کرے۔

تیسرا بند:- اے مخاطب! اگرچہ عقلمند آدمی اپنا حال دل کسی سے بیان نہیں کیا کرتا۔ مگر میں اپنا دردِ دل تجھ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ میری حالت یہ ہے۔ کہ میں غلام ہوں۔ اور غلامی میں پیدا ہوا ہوں۔ اس لئے اسلام سے کوسوں دور ہوں جب میں سرکار ابد قرار صلعم پر درود بھیجتا ہوں۔ تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ عشق مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اے محکومِ غیرا! تیرے دل میں اللہ کے بجائے بتوں کی محبت بسی ہوئی ہے۔ جب تجھ کو سرکار ابد قرار صلعم سے کوئی نسبت ہی نہیں، جب تجھے حضور سے کوئی محبت ہی نہیں تو پھر تو اپنی ناپاک زبان پر آپ کا نام کیوں لاتا ہے؟ آپ کے مقدس نام کو کیوں آلودہ کرتا ہے۔

ان اشعار میں اقبال نے اپنے نام کے پردے میں مسلمانوں پر تعریض کی ہے۔ کہ جب ان کے دل میں حضور کی محبت ہی نہیں تو پھر حضور کے نام پر درود بھیجتے ہوئے انہیں شرم آنی چاہیئے۔

چوتھا بند :- اے مخاطب! چونکہ میں غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں اس لئے میرا قیام بے حضور ہے۔ اور میرا سجدہ بے سرور ہے۔ یعنی مجھے نماز میں کوئی لطف نہیں آتا۔ میری حالت یہ ہے کہ میں مسجد میں نماز پڑھتا ہوں تو اللہ سے یہ کہتا ہوں :-

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

اسے اللہ ہم تیری ہی اطاعت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

لیکن جب مسجد سے باہر نکلتا ہوں تو غیر اللہ کی اطاعت کرتا ہوں۔ اور اسی سے مدد مانگتا ہوں۔ کیا میری یہ روش صریحاً منافقانہ نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے نماز میں حضور و سرور کیسے حاصل ہو سکتا ہے جلوۂ حق اخواہ وہ ایک لمحہ ہی کے لئے کیوں نہ ہو صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہیں۔

اللہ کے بندے کی شان تو یہ ہے۔ کہ جب وہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے تو ساری کائنات اس کے سامنے سربسجود ہو جاتی ہے یعنی وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور ساری دنیا اس کی اطاعت کرتی ہے۔

لیکن ہم لوگ چونکہ غلام ہیں اس لئے اس کے جلال اور اس کی عظمت سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اور نہ اس کے جمال سے آگاہ ہیں۔ یعنی مومن میں شان جلالی اور شان جمالی دونوں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اور ہم لوگوں میں نہ شان جلال ہے نہ شان جمال۔

حقیقت تو یہ ہے کہ غلام، دولت ایمان ہی سے محروم ہوتا ہے۔ غلام اگر حافظ قرآن ہو جائے تو بھی غلام ہی رہتا ہے کیونکہ وہ صرف

زبان سے قرآن پڑھتا ہے اور اسکے انتشار پر عمل نہیں کرتا

غلام، زبان سے تو اسلام کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کا عمل بالکل کافرانہ ہوتا ہے۔ اس لئے نہ اس میں مومن کی شان جلالی پیدا ہو سکتی ہے نہ شان جمال۔

اے مسلمان! اگر تیرے دل میں ایمان کی حرارت موجود ہو تو تجھے بحالت نماز، معراج نصیب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سرکار دو عالم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ نماز مومن کی معراج ہے۔ لیکن تیرے اندر عشق رسول کی آگ روشن نہیں ہے تو پھر تیرا سجدہ ایک رسم لایعنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نمازوں سے وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا جو صحابہؓ کرام کی نمازوں سے مرتب ہوتا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے قول اور عمل میں مطابقت نہیں ہے۔ ہم زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ یعنی ایک اللہ کے سوا کوئی طاقت ہم پر حکمران نہیں ہے۔ مگر ہمارا عمل یہ ہے کہ ہم بڑے اطمینان کے ساتھ غیر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہماری عیدین کی نمازوں سے نہ ملت کی سر بلندی کا اظہار ہوتا ہے۔ نہ دین کی عظمت کا اعلان ہوتا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ عیدین کے موقعوں پر مسلمانوں کا ہجوم مسجدوں میں جمع ہو جاتا ہے۔

فصل دوازدہم

حرفے چند با امّتِ عربیہ

تمہید:۔ اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال نے عربوں کو اُن کے اسلاف کے بلند مقام اور کارناموں سے روشناس کیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ انہیں یہ مقام رفیع اور عزت و شوکت، سرکار ابد قرار صلعم کے دم سے نصیب ہوئی تھی۔ اور اس ضمن میں انہوں نے حضور کے کمالات کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے۔ کہ مسلمانوں نے دنیا میں جس قدر کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

ایں ہمہ یک لحظہ از اوقات اوست
یک تجلی از تجلی ہائے اوست

دوسرے بند میں انہوں نے عربوں سے گلہ کیا ہے کہ تم نے اپنی وحدت کو پراگندہ کر دیا۔ بلکہ اپنوں سے منہ موڑ کر غیروں سے ناطہ جوڑ لیا۔

آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد
روح پاک مصطفےٰ آمد بدرد

اس شکوہ کے بعد ان کو نصیحت کی ہے کہ اپنے اندر فاروق اعظمؓ کی روح پیدا کرو۔ تاکہ دوبارہ دنیا میں انقلاب پیدا کر سکو۔

مرو صحرا! پختہ تر کن خام را
برعیار خود بزن ایام را

پہلا بند :۔ اے امت عربیہ! اے عرب قوم کے افراد! خدا کرے تمہارا ملک قیامت تک باقی رہے ذرا یہ تو بتاؤ۔ کہ

(الف) دنیا کی کس قوم نے دنیا میں سب سے پہلے ملوکیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ کس قوم نے دنیا کو ملوکیت کی لعنت سے پاک کیا؟ کس قوم نے قیصر اور کسریٰ کی سطوت کو خاک میں ملا دیا؟ کس قوم نے دنیا میں سب سے پہلے یہ نعرہ بلند کیا:۔

لَا کِسْرٰی وَلَا قَیْصَرَ فِی الْاِسْلَامِ

یعنی اسلام میں نہ کوئی کسریٰ ہے اور نہ کوئی قیصر سب انسان اللہ کے بندے ہیں۔ اور اس لئے سب انسان آپس میں برابر ہیں۔

واضح ہو کہ یہ تعلیم اس حدیث سے مقتبس ہے:۔

اِذَا هَلَكَ قَيْصَرُ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهٗ وَاِذَا هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهٗ۔ فرمایا سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم نے جب قیصر ہلاک ہو جائیگا۔ تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا اور جب کسریٰ ہلاک ہو جائیگا۔ تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔

(ب) اے عربو! یہ تو بتاؤ۔ کہ دنیا میں سب سے پہلے کس قوم نے قرآن حکیم کی تلاوت کی؟

اللہ کا کلام سب سے پہلے کس قوم نے دنیا والوں کو سنایا؟

(ج) کارکنان قضا و قدر نے کس قوم کو از سر نو کلمہ توحید سے آشنا کیا؟

اور توحید کا چراغ کس ملک میں روشن کیا؟

نوٹ:۔ رمز الا اللّٰہ یہ ہے کہ اللّٰہ کے سوا کوئی طاقت مجھ پر حکمراں نہیں ہے۔

کیونکہ کوئی شئی اس لائق ہی نہیں ہے کہ حکمران ہو سکے۔

کیونکہ کوئی شئی از خود موجود ہی نہیں ہے یعنی

لَا موجود الا اللّٰہ

(۵) دنیا میں جس قدر علوم و فنون آج مروج ہیں، یہ سب کس قوم کے دستر خوان کے ریزے ہیں ؟ اور یہ تو بتاؤ۔ کہ حسب ذیل آیت کس کی شان میں نازل ہوئی تھی؟

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔

(۳ - ۱۰۳)

(اور یاد کرو احسان اللّٰہ کا جو اس نے تم پر کیا۔ جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ جس کی بدولت تم آپس میں بھائی بھائی ہو گئے)۔

اچھا یہ سب خوبیاں تمہارے اندر کس کے فضل و کرم سے پیدا ہوئیں؟

بلاشبہ یہ سرکار ابد قرار احمّی لقب صلی اللّٰہ علیہ وسلم ہی کا فیضان تھا۔

حضور نے تمہیں پر احسان نہیں فرمایا۔ ساری دنیا کو اپنے فضل و کرم سے نوازا۔ مثلاً

(۱) دنیا کو سب سے پہلے آپ ہی نے حریت کی نعمت سے مالا مال کیا دنیا کی قومیں آج جس نعمت حریت سے مستفید اور بہرہ اندوز

ہو رہی ہیں۔ اس نعمت سے آپ ہی نے سب سے پہلے دنیا کو روشناس کیا تھا۔

کون نہیں جانتا کہ ظہور اسلام سے پہلے

بود انسان در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود و مند و زیر دست

سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش
بند ہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

در کلیسا اسقف رضوان فروش
بہر ایں صید زبوں دامے بدوش

برہمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

تا امینے حق بحق داراں سپرد
بندگاں را مسند خاقاں سپرد

حریت زاد از ضمیر پاک او
ایں مے نوشیں چکید از تاک او

اب پڑھیے اقبال کے اس شعر کو:۔

حریت پروردۂ آغوش است
یعنی امروز امم از دوش است

(۲) آپ نے حریت، اخوت اور مساوات کے پاکیزہ اصول انسان کو عطا کر کے گویا اسے نئی زندگی بخشی اور آپ ہی نے اسے اس کی مخفی صلاحیتوں سے آگاہ فرمایا۔ یعنی انسان کو بتایا کہ تو دنیا میں کسی کا محکوم یا غلام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ساری دنیا تیری محکوم اور غلام ہے۔

(۳) یعنی آپ نے انسان کو توحید کا سبق پڑھا کر اسے تمام معبودان

باطل کی غلامی سے آزادی عطا کردی۔ آپ نے انسان کو بتایا کہ سورج، چاند، گنگا، جمنا، بندر، سانپ، رام، کرشن، عزیز اور مسیح ان میں کوئی بھی لائق عبادت نہیں ہے۔ گویا لا الٰہ الا اللہ کہہ کر تمام خداوندان کہن کا خاتمہ کر دیا۔

(۴) آپ نے مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی تعلیم دی اور غزوۂ بدر و حنین میں اس تعلیم پر خود عمل کرکے اسوۂ حسنہ پیش کردیا۔ آپ ہی کی صحبت نگاہ سے حیدر کرارؓ صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ اور حسینؓ نے دنیا کو اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کیا ہے۔

(۵) آپ ہی نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ میدان جنگ میں بھی ذکر الٰہی سے غافل نہ ہونا۔ جب کفار اپنی مدد کے لئے لات و عبادہ کو پکاریں تو تم اللہ کو پکارو۔ اور اگر لڑائی میں نماز کا وقت آجائے تو جس طرح صفیں باندھ کر لڑتے ہو۔ اسی طرح صفیں باندھ کر اللہ کے سامنے جھک جاؤ۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس نے بحالت جنگ بھی نماز با جماعت ادا کی ہو۔

"قراءت الصّٰفّٰت" کنایہ ہے۔ تلاوت قرآن سے۔ اور اقبال نے اس سورۃ کو اس لئے منتخب کیا۔ کہ اس کی پہلی آیت میں اللہ نے صف باندھ کر لڑنے والوں کی قسم کھائی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا (۳۷-۱)

اور غازیوں کے ان لشکروں کی قسم جو دشمنوں سے لڑنے کیلئے

صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔

(۶) آپ ہی کی محبت کی بدولت سلطان صلاح الدین ایوبی رح کی تلوار میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر پیدا کر دی کہ اس نے تن تنہا سارے یورپ کا مقابلہ کیا۔ اور ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا کر دیا۔ اور آپ ہی کی محبت کی بدولت حضرت بایزید بسطامی رح کی نگاہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر پیدا کر دی کہ انہوں نے سینکڑوں کافروں کو مسلمان بنا دیا۔ اور ہزاروں مسلمانوں کو خدا سے ملا دیا گویا سلطان کی تلوار اور فقیر کی نگاہ دونوں جہان کے خزانوں کی کنجیاں بن گئیں۔

(۷) آپ نے ایک ہی جام سے عقل اور دل دونوں کو مست (کامل) کر دیا۔ مثلاً مرشد رومی رح دنیائے ذکر (عشق) میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور امام رازی دنیائے فکر (عقل) کے مسلم ثبوت امام ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دونوں نے آپ ہی سے فیض حاصل کیا ہے۔

(۸) آپ ہی نے دنیا کو علم و حکمت، شرع و دین، تہذیب و تمدن، اور سیاست و معیشت کے اصول سے آگاہ فرمایا۔ اور آپ ہی نے انسانوں کو اللہ سے محبت کرنے کا طریقہ سکھایا۔

اندرون سینہ دلہا ناصبور" میں ناصبوری کنایہ ہے عشق سے۔

(۹) جن بادشاہوں نے الحمرا اور تاج محل جیسی نادر الوجود عمارتیں قائم کیں۔ وہ آپ ہی کے حاشیہ برداروں میں سے ہیں۔

خلاصہ کلام اینکہ یہ تمام خوبیاں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئیں

یہ سب خوبیاں آپ کی شخصیت مبارکہ کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہیں۔ ان کمالات کو آپ کی ذات سے وہی نسبت ہے جو ایک لمحہ کو آپ کی زندگی سے ہے۔

بس یوں سمجھو کہ یہ سارے محاسن اور کمالات گویا آپ کی تجلیات میں سے صرف ایک تجلی ہے۔

(۱۰) اور اے مخاطب! یہ جو کچھ میں نے بیان کیا۔ یعنی جن خوبیوں کا ذکر کیا۔ یہ سب آپ کی شخصیت مبارکہ (ذات اقدس) کا ظاہری پہلو ہے جو ہم عامیوں کو نظر آسکتا ہے یا جس حد تک ہماری نگاہ پہنچ سکتی ہے۔ رہا آپ کی ذات کا باطنی پہلو تو وہ تو عارفوں کی نگاہ سے بھی ہنوز پنہاں ہے۔ اس پہلو کو تو کوئی انسان دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس تک تو کسی انسان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ واقعی اقبال نے سچ کہا ہے:۔

مع باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

میرے نزدیک ساری مثنوی میں اس سے بلیغ تر اور معنی خیز تر کوئی مصرعہ نہیں ہے۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی کوشش کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ کائنات میں ہر چیز کے دو پہلو ہیں۔ ظاہری اور باطنی یہ نکتہ قرآن حکیم کی اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

(۵۷ - ۳)

اوست نخستین ہمہ و اوست آخرین ہمہ و اوست آشکار و اوست پنہاں و او بہر چیز دانا ست" (شاہ ولی اللہؒ)

"وہی پہلا اور پچھلا ہے۔ اور وہی باہر اور اندر ہے اور وہی سب چیزوں کو جانتا ہے۔ (شاہ عبدالقادرؒ) یعنی (ہر شئے کا) اول بھی وہی ہے۔ آخر بھی وہی ہے۔ (ہر شئے کا) ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی ہے۔ آشکار بھی وہی ہے پنہاں بھی وہی ہے اندر بھی وہی باہر بھی وہی ہے بالفاظ دیگر، کائنات کا باہر (ظاہر) بھی وہی ہے اور اس کا اندر (باطن) بھی وہی ہے۔

اس آیت کی تفسیر سرکار ابد قرار نے یوں فرمائی ہے :-

انت الاول فلیس قبلک شیٔ، و انت الاخر فلیس بعدک شیٔ وانت الظاہر فلیس فوقک شیٔ، وانت الباطن فلیس دونک شیٔ اقض عنا الدین و اغننا من الفقر" (رواہ مسلم و ترمذی عن ابی ہریرہ)

اے اللہ! تو اول ہے اس لئے تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں اور تو آخر ہے۔ اس لئے تیرے بعد کوئی چیز نہیں ہے۔ اور تو ظاہر ہے اس لئے تیرے اوپر کوئی چیز نہیں ہے۔ اور تو باطن ہے اس لئے تیرے علاوہ کوئی شے نہیں ہے۔

اے اللہ! اپنے فضل سے ہمارا قرضہ اتار دے اور ہمیں فقر کی دولت سے مالا مال کر دے۔ یعنی اپنا محتاج بنا کر دنیا والوں سے بے نیاز کر دے۔

(۲) اس لئے سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے بھی دو پہلو ہیں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی :-

(۱) ظاہر یعنی این جلوہ ہائے دلفروز :-

آپ کی ذات کا ظاہری پہلو تو یہ تمام جلوہ ہائے دلفروز ہیں :-

(جس کی تفصیل اقبال نے مثنوی کے صد ۲۳ میں بیان کی ہے)

(ج) باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز۔

لیکن آپ کا باطن ابھی تک عارفوں سے پوشیدہ ہے واضح ہو کہ یہ شاعری نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے:۔

(د) ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ ہر شئے کا ایک ظاہری پہلو ہے۔ اور دوسرا باطنی پہلو ہے۔ اور باطنی پہلو اسکی حقیقت ہے۔

مثلاً انسان کا ایک ظاہر ہے جو محسوس ہو رہا ہے لیکن اس کی حقیقت نہ محسوس ہوتی ہے نہ حکما کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن ارباب تصوف نے اپنے کشف اور وجدان صحیح سے اس کی حقیقت دریافت کی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی فرماتے ہیں کہ

"حقائق ممکنات، اظلال اسماء و صفات الٰہیہ ہیں۔

یعنی ممکنات کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کی صفات کے عکوس ہیں۔

(ب) اب سوال یہ ہے۔ کہ ان حقائق کی حقیقت کیا ہے؟ بالفاظ دگر: حقیقت الحقائق کیا ہے؟ یا ان اسماء و صفات کی حقیقت کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی حقیقت "تعین اول" ہے۔ جسے اصطلاح میں حقیقت الحقائق یا حقیقت محمدیہ بھی کہتے ہیں۔ اس تصریح سے معلوم ہوا کہ آپ کا باطن حقیقت محمدیہ ہے اور یہی حقیقت محمدیہ تعین اول ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تعین اول سے صوفیہ کی کیا مراد ہے؟ اس

کا جواب یہ ہے۔

(ج) پہلے اصطلاح تعین کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔

واضح ہو کہ لفظ تعین سے مراد ہے حق تعالیٰ کا اپنی ذات کو دریافت کرنا۔ اس مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے بعد مطالب آئندہ کا سمجھنا آسان ہو جائیگا۔

(د) تمام مسلمانوں کا خواہ وہ وجودی ہوں یا شہودی؟ ارباب حدیث ہوں یا اصحاب فقہ، متکلمین اشاعرہ ہوں یا ماتریدیہ، اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب

کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْءٌ

صرف ذات حق موجود تھی۔ صرف اللہ تھا۔ اور اس کے ساتھ کوئی شے موجود فی الخارج نہ تھی۔ صوفیہ اللہ تعالیٰ کی اس حالت کو مرتبہ لا تعین سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس مرتبہ میں فقط ذات احدیت کی یافت ہے۔ بلا اعتبار اجمال و تفصیل صفات۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں حق تعالیٰ کی کنہ کسی مخلوق کو معلوم نہیں ہو سکتی۔

نوال در بلاغت بسحبان رسید

نہ در کنہ بیچون سبحان رسید (سعدی)

(ہ) سرکار دو عالم صلعم نے جو یہ فرمایا کہ

مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ

تو اسی مرتبہ کو مد نظر رکھ کر فرمایا۔ کہ معرفت کا حق یہ ہے کہ ذات بحت کی معرفت حاصل ہو۔ اور یہ محال ہے اس لئے اے اللہ ہم نے تجھے اس طرح نہیں پہچانا۔ جس طرح پہچاننے کا حق ہے۔

(۵) خود بخود (کسی خارجی طاقت کے دباؤ کے بغیر کیونکہ خارج میں تو کچھ موجود ہی نہ تھا) حق تعالیٰ کے دل میں تخلیق کا خیال پیدا ہوا حضرات صوفیہ اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ انہیں اپنے جمال کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ انہوں نے چاہا، کہ کوئی مجھ سے محبت کرے تو سب سے پہلے خود بخود (اپنی ذات مخفی میں آپ ہی تجلی فرمائی یعنی اپنے ہی آئینہ میں اپنے ہی آپ کو اپنے ہی آپ سے دیکھا اسے مرتبہ وحدت یا تعین اول کہتے ہیں یعنی تعین اول حقیقت محمدی ہے یہی سرکار ابد قرار کا باطن ہے۔ تعین اول کیا ہے؟ حق تعالیٰ کا اپنی ذات کو پانا (دریافت کرنا) یا باصطلاح سعر خاد "انا" کہنا۔ اس مرتبہ میں ذات مطلق (حق تعالیٰ) نے اپنی ذات کے واسطہ سے اپنی ذات کو مشاہدہ کیا۔ اور فرمایا کہ میں ہی موجود ہوں میرے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے نیز میں ظہور کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا ہوں۔

اس کے بعد دوسری تجلی فرمائی جسے اصطلاح میں مرتبہ واحدیت کہتے ہیں۔ یہ تینوں مراتب (احدیت، وحدت اور واحدیت) مراتب داخلی کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد مراتب خارجی شروع ہوتے ہیں) اور انکو عالم ارواح، عالم مثال اور عالم شہادت کہتے ہیں یہ سب ملکر تنزلات ستہ کہلاتے ہیں۔ چونکہ ان کی تفصیل اس جگہ موجب تطویل ہوگی اس لئے نظرانداز کی جاتی ہے۔

باز آمدم بر سر مطلب، تعین اول ہی حقیقت محمدیہ ہے جس کی طرف بیدل ؒ نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

چو شد حسنِ حقیقت جلوہ اندیش
محمد دید در آئینہ خویش

یعنی جب محبوب حقیقی (حق تعالیٰ) نے اپنا جمال دیکھنا چاہا۔ (اور یہ ہر جمیل کی ذات کا تقاضا ہے) تو لا محالہ ایک آئینہ بنانا پڑا۔ (کیونکہ آئینہ کے بغیر دیدار میں لطف نہیں آتا) یہ فعل آئینہ سازی اصطلاح میں تعین اول ہے (جب ذات نے اپنے کو دیکھا اور "انا" کہا) اور وہ آئینہ ذات یا حقیقت محمدی ہے۔

اب قارئین تو غور کرلیں کہ اگر سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا باطن ابھی تک عارفوں کی نگاہ سے پنہاں ہے تو اسمیں تعجب کی کیا بات ہے؟ رہا آپ کا ظاہر تو بلاشبہ آشکار ہے۔ اور اس اعتبار سے آپ ہماری ہی طرح ایک بشر ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:-

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰىٓ اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج

آپ کہہ دیجئے کہ بلاشبہ میں تمہاری طرح بشر ہی ہوں میری طرف یہ وحی کی گئی ہے۔ کہ تمہارا اللہ (معبود) اِلٰہ واحد ہے (جسکے علاوہ کوئی اللہ نہیں ہے) (۱۸ - ۱۱۰)

آخر میں اقبال نے خواجہ فرید الدین عطار کے پند نامہ کے پہلے شعر میں تغیر لفظی کر کے سرکار دو عالم صلعم سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

یعنی بلاشبہ وہ رسول بیحد حمد و ثنا کے لائق ہے جس نے بنی آدم (مشت خاک) کو دولت ایمان سے مالا مال فرمایا۔

واضح ہو کہ اقبالؒ کو خواجہ عطارؒ کے مصرع میں تغیر کرنے کا حوصلہ اس لئے پیدا ہوا کہ وہ ایمانداری کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتے تھے (جس کا اظہار ایک مرتبہ انہوں نے میری موجودگی میں بھی کیا تھا) کہ عقل کی رو سے کوئی شخص خدا کی ہستی کا اقرار یا اعتراف نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر سرکار دوعالم صلعم یہ نہ فرماتے کہ اے لوگو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فی الحقیقت موجود ہے تو میں خدا کی ہستی پر ایمان نہیں لا سکتا تھا۔ اس لئے میری نگاہ میں تو سرکار ابد قرار صلعم اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔

قوت قلب و جگر گردد نبی

از خدا محبوب تر گردد نبی (رموز بیخودی ص ۱۱)

دوسرا اقتباس:۔ سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم کے احسانات عظیم اور الطاف عمیم کا تذکرہ کرنے کے بعد اقبال عربوں سے شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور رسول نے تم پر اس قدر نوازشات فرمائیں۔

لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دوسری قومیں ترقی کر رہی ہیں اور تم اپنے آبا اپنے مالک کی اہمیت اور قدر و قیمت سے قطعاً نا آشنا ہو۔ اس کے بعد ان کی موجودہ حالت پر تبصرہ کرتے ہیں:۔

(۱) تمہیں سرکار نے ایک قوم بنایا تھا۔ (فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا) لیکن تمہاری حالت یہ ہے کہ اس وقت تم سب "وطنیت" کے طلسم میں گرفتار ہو کر مختلف اقوام میں منقسم ہو چکے ہو۔ اور چونکہ تم سب انفرادی طور پر نہایت کمزور ہو اس لئے تم سب انگریزوں (اور اب امریکہ) کے غلام ہو۔

آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد
روح پاک مصطفےؐ آمد بدرد

یہ شعر غیر کی تشریح اور توصیف دونوں سے بالاتر اور بے نیاز ہے اقبال نے اس شعر میں عربوں کی حالت زار کا نقشہ تو کھینچا ہی ہے خود اپنا کلیجہ بھی کاغذ پر نکال کر رکھ دیا ہے۔

اس میں کیا شک ہے۔ کہ سرکار دو عالم صلعم نے عربوں کو ساری دنیا کا سردار بنایا تھا۔ لیکن انہوں نے ملوکیت کی لعنت دل وجان سے قبول کرلی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عیاشی میں مبتلا ہو کر کمزور ہو گئے اور آج کافروں کے غلام یا دست نگر یا تابع فرمان ہیں۔

اقوام فرنگ (برطانیہ اور امریکہ) نے تم پر افسوں کر دیا ہے مگر تم اپنی سادگی کی وجہ سے اس سے بے خبر ہو۔ دراصل وہ تمہیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تمہارا دوست کہیں اور دوستی اہمدردی، اعانت اور خیر خواہی کے پردہ میں تمہیں اپنا غلام بنالیں۔ اس لئے اگر تم ان کے فریب (ڈپلومیسی) سے بچنا چاہتے ہو تو ان کو اپنی مملکت کی حدود سے باہر نکال دو۔

فرنگی کی ڈپلومیسی (حکمت) نے آج ہر قوم کو مجبور (بیچارہ) کر دیا ہے۔ اور عربوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے)

لہذا تم اپنے اندر دوبارہ حضرت عمرؓ کی روح پیدا کرو اور اس نکتہ کو یاد رکھو کہ

قوت از جمعیت دین مبین
دین ہمہ عزم است و اخلاص و یقین

قوت توجمعیت دین پر موقوف ہے یعنی سب افراد قوم (سعودی، یمنی، عراقی، شامی، لبنانی وغیرہ) وطن کے بجائے دین کو قومیت کی بنیاد بنائیں۔ اور سب افراد بلا استثناء کلمہ توحید (دین) پر مجتمع ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تمہارے اندر قوت پیدا ہو جائیگی

اب رہا یہ سوال کہ دین کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ دین تو عزم، اخلاص اور یقین کا نام ہے۔

عزم سے مراد ہے افراد قوم کا یہ فیصلہ کہ سربلندی حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ واضح ہو کہ ترقی اور کامیابی کے لئے "عزم" شرط اولیں ہے اسی لئے اقبال نے سب سے پہلے "عزم" کا ذکر کیا۔ جب تک کوئی فرد یا قوم ترقی، عزت اور سرداری حاصل کرنے کا عزم نہ کرے اُس وقت تک یہ نعمتیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔

اخلاص سے مراد ہے ہر فرد کا اپنی قوم کی بہبود کے لئے جدوجہد کرنا نہ کہ اپنا فائدہ مدنظر رکھنا یقین سے مراد ہے ہر فرد کا یہ یقین رکھنا کہ اسلام بہترین دستور حیات ہے۔ اور اگر اس کی میں اشاعت کروں گا۔ تو اللہ ضرور مجھے کامیابی عطا فرمائیگا۔

اس کے بعد اقبال عربوں سے یہ کہتے ہیں کہ مرد صحرا (اشارہ بسوئے اقوام عرب) پاسبان فطرت ہوتا ہے۔ یعنی اس میں اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو بنی آدم کی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔

وہ تصنع اور بناوٹ سے بے خبر ہوتا ہے۔ اور اس کی طبیعت برائی اور بھلائی کی کسوٹی ہوتی ہے۔ اگر وہ برسر اقتدار آجائے تو

صد ہزار انجم" بہت سی برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے یعنی اگر اقوام عرب کو دنیا میں اقتدار حاصل ہو جائے تو بنی آدم کو بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

اسی لئے اقبال آخری اشعار میں دوبارہ اقوام عرب سے خطاب کرتے ہیں۔

(۱) خارجی حالات (کوہ و در و دشت و دمن) سے قطع نظر کر کے اپنی خودی مستحکم کر لو۔

(۲) اور جب طاقت حاصل ہو جائے تو میدان ستیز (جہاد فی سبیل اللہ) میں کود پڑو۔

(۳) یاد رکھو کہ موجودہ تہذیب و تمدن جس پر یورپ کو اسقدر ناز ہے یہ سب تمہارا مرہون احسان ہے یعنی جس قدر سائنٹفک ترقیاں یورپ میں ہوئی ہیں۔ اور تہذیب کے میدان میں جس قدر فتوحات اہل یورپ نے کی ہیں۔ اُن کی ابتدا تم نے ہی کی تھی تم ہی نے قرطبہ و غرناطہ میں علوم و فنون کی شمع روشن کی تھی۔ جس نے سارے یورپ میں اجالا کر دیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ جس زمانہ میں اندلس کے مسلمان فلسفہ اور سائنس میں حیرت انگیز اختراعات کرتے رہے ہیں اس وقت یورپ میں جہالت اور تعصب کی تاریک گھٹائیں چھا رہی تھیں اس کی تفصیل کے لیئے قارئین کرام ڈاکٹر لیکی کی "تاریخ اخلاق یورپ" اور ڈاکٹر ڈریپر کی "معرکہ مذہب و سائنس" اور ڈاکٹر Briffault (بریفالٹ) کی "تعمیر انسانیت" کا مطالعہ کر لیں۔

لیکن جب زوالِ اندلس کے بعد اقوام یورپ مسلمانوں کی پیدا کردہ تہذیب کی وارث ہوگئیں تو انہوں نے اس کے اندر "لادینی" کے عناصر داخل کر دیئے اس لئے موجودہ مغربی تہذیب، گمراہ کن اور بے حیائی سکھانے والی اور ملحد بنانے والی ہے۔

اے مردِ صحرا! اٹھ اور دنیا کو اس لادینی تہذیب کے مضر اثرات سے رہائی عطا کر۔ اس کی خامیوں کو دور کر اور زمانہ کو اپنے سانچے میں ڈھال دے یعنی اسلامی اصول کی اشاعت کر۔

فصل سیزدہم

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

تمہید:- جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ اقبال نے اس فصل میں اس سوال کا جواب دیا ہے۔ جس کے لئے انہوں نے یہ مثنوی لکھی ہے۔ اس فصل میں چھ بند ہیں ذیل میں ہم ہر بند کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی شرح ہدیہ ناظرین کریں گے۔

پہلا بند:- اس بند میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ بنی نوعِ آدم کی تمام موجودہ خلفشار اور مصائب کا منبع یورپ (فرنگ) ہے۔ کیونکہ اس نے دنیا میں رسمِ "لادینی" کی بنیاد رکھی ہے۔

"رسم لادینی" کی تشریح انہوں نے خود حاشیہ میں کر دی ہے یعنی نظام امور ریاست میں دین سے بے تعلق ہو جانا اس نظام (مرزنمل) کو اصطلاح میں سیکولرازم (SECULARiSM) کہتے ہیں یعنی مملکت کو مذہب کی گرفت سے آزاد کر دینا یہ نظام لازمی نتیجہ ہے۔ وطنیت (NATIONALiSM) کا جس کی بنیادی تعلیم یہ ہے۔ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا ہیں۔ ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی تعلیم پر اقبال نے یہ تبصرہ کیا ہے:۔

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

یہی سیکولرازم (رفض الدین) اقبال کی رائے میں انسان کی تمام مشکلات کا سبب ہے۔ اسی نے یورپ کا زاویہ نگاہ مادہ پرستانہ بنا دیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کی نگاہ میں انسان محض مادہ کی پیداوار ہے۔ یعنی سالمات مادی کے امتزاج کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بے منزل است

دوسرا بند :۔ دوسرے بند میں اقبال نے اسلام کا نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے۔ جس کی رو سے کائنات کی اصل مادہ نہیں ہے بلکہ "نورحق" ہے۔ یعنی یہ کائنات سالمات مادی کے امتزاجات اتفاقی کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اسے اللہ نے بمصلحت خاص (بالحق) پیدا کیا ہے۔ اور چونکہ کائنات کی تخلیق "بالحق" (با مقصد) ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی کا بھی ایک خاص مقصد ہے۔

چونکہ یورپ کے پاس خیر وشر کا کوئی معیار نہیں اسلئے اس کی چشم بے نم ہے۔ اور اس کا دل سنگ وخشت ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

دانش افرنگیاں تیغے بدوش
درہلاک نوع انسان سخت کوش

چونکہ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کا خدا کے سامنے جواب دہ ہے اس لئے اس کا فرض یہ ہے۔ کہ وہ لادینی تہذیب کا خاتمہ کر دے۔ اور دنیا کو یہ بتائے کہ

عقل اندر حکم دل یزدانی است
چوں زدل آزاد شد شیطانی است

واضح ہو کہ یہ اس سوال کا "پس چہ باید کرد؟" پہلا جواب ہے۔

تیسرا بند :۔ تیسرے بند میں اقبال نے "احوال حبش" سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور متنبہ کیا ہے۔ کہ "مجلس اقوام" سراسر مکر و فن ہے۔ اس لئے اس سے کسی قسم کی توقعات وابستہ مت کرو۔

چوتھا بند :۔ چوتھے بند میں انہوں نے یہ تلقین کی ہے کہ تمام امتیازات رنگ و نسل کو دل سے نکال دو۔ تمام انسانوں کو عالمگیر برادری کے ارکان سمجھو۔ فرنگ سے قطع تعلق کر لو۔ اور اعتماد علی النفس (اپنی ذات پر بھروسہ کرنا) سیکھو۔

یہ اس سوال کا دوسرا جواب ہے۔

پانچواں بند :۔ پانچویں بند میں انہوں نے یہ تلقین کی ہے۔ کہ احساس کمتری دل سے نکال دو۔ اور مشرق (ایشیا) کی عظمت کا نقش دنیا میں قائم کرو۔ کیونکہ ایشیا قدیم الایام سے ہنر اور دین (علوم و فنون اور روحانیت) کا گہوارہ رہا ہے۔ سرزمین مشرق، یورپ سے ہزار درجہ برتر ہے۔ اس بات پر فخر کرنا سیکھو کہ مشرق ہی نے ساری دنیا کو مذہب اور اخلاق کا درس دیا ہے مشرق ہی نے سب سے پہلے "اسرار وجود" دنیا پر آشکار کئے ہیں۔

افرنگ کی عظمت کا غلط احساس دل سے محو کر دو اور لیگ آف نیشنز (جمعیت اقوام) کے مقابلہ میں جمعیت خاور کی بنیاد رکھو۔

یہ اس سوال کا تیسرا جواب ہے۔

چھٹا بند :۔ چونکہ اس زمانہ میں بادشاہی دراصل سوداگری ہے یعنی مغربی اقوام نے صنعتی ترقی کر کے ایشیائی ملکوں کو اپنی مصنوعات کی بدولت اپنا دست نگر اور معاشی اعتبار سے اپنا غلام بنا لیا ہے۔ اس لئے تمہارا فرض یہ ہے کہ ان کی تمام مصنوعات کا بائیکاٹ کر دو اور ان کی بجائے سودیشی اشیاء استعمال کرو۔

آنچہ از خاک تو رست اے مرد حر آں فروش و آں بپوش و آں بخور

اقبال نے "پس چہ باید کرد" کا جو جواب دیا ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے ۔

(۱) یورپ کو اسلام کا پیغام سناؤ

(۲) یورپی تہذیب کے طلسم کو باطل کر دو ۔

اے کہ جاں را باز می دانی ز تن
سحر ایں تہذیب لادینی شکن

(۳) یورپ کو یہ بتاؤ کہ تمہیں عقل کو دل کا تابع فرمان بنانا چاہیے اگر عقل، دل کی اطاعت سے منحرف ہو گی تو شیطانی ۔ اور اس لئے انسانیت کے حق میں بلائے بے درماں بن جائیگی ۔

(۴) یورپ کی کسی سیاسی جماعت پر اعتماد مت کرو ۔

(۵) رنگ و نسل کے امتیازات کو مٹا دو

(۶) فرنگ سے بکلی قطع تعلق کر لو ۔

(۷) اپنی ذات پر اعتماد کرنا سیکھو ۔

(۸) اپنے اندر رائے (صحیح علم) اور قوت (سیاسی اقتدار) دونوں خوبیاں پیدا کرو ۔

(۹) جمعیت اقوام مشرق قائم کرو ۔

(۱۰) انگریزوں بلکہ سارے یورپ کا تجارتی بائیکاٹ کر دو ۔

واے آں کہ دریا کہ موجش کم تپید
گوہر خود را ز غواصاں خرید

پہلا بند :- اقبال کہتے ہیں کہ اقوام مغرب (فرنگ) کے دو صد سالہ

طرزِ عمل (استعماریت، وطنیت، لامذہبیت، استحصال بالجبر) زبردست آزاری، عیاری، مکاری، بے ایمانی، ہوسِ زر، اور ہوسِ اقتدار کا نتیجہ یہ نکلا کہ

(۱) انسانیت پھٹ گئی (مطلب یہ کہ بنی آدم مبتلائے حسد آلام ہوگئے۔

(۲) زندگی وقفِ ہنگامہ ہوگئی۔ یعنی دنیا سے امن وامان مفقود ہوگیا۔

اندریں حالات اقبالؔ اقوامِ مشرق (بالخصوص مسلمانوں) سے یہ کہتے ہیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ کہ اہلِ مشرق کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو۔؟

اس سوال کو جواب دینے سے پہلے وہ یورپ کی موجودہ حالت چند لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد
زیرِ گردوں، رسمِ لادینی نہاد

کہتے ہیں کہ یورپ اپنی تلوار سے خود زخمی ہوگیا۔ "شمشیر" کنایہ ہے۔ رسمِ لادینی (سیکولرازم) سے جو منطقی نتیجہ ہے نظریہ وطنیت (نیشنلزم) کا۔ یورپ نے یہ تلوار دوسروں کو تباہ کرنے کے لئے بنائی تھی۔ مگر شومیٔ قسمت دیکھیئے کہ اس تلوار سے خود ہی زخمی ہوگیا۔ یعنی یہ نظریۂ وطنیت خود اس کے حق میں وبالِ جان ثابت ہو رہا ہے۔ ذیل میں نظریۂ وطنیت کی قدرے وضاحت کی جاتی ہے۔

نظریۂ وطنیت

میکیاولی کے سوانح حیات:۔ اس نظریہ کا بانی میکیاولی تھا۔ جسے اقبال نے "رموزِ بےخودی" میں "فلارنساوی باطل پرست" کا لقب دیا ہے۔

یہ شخص ۱۴۶۹ء میں بمقام فلارنس (اطالیہ) پیدا ہوا تھا۔ نپولین کی حکمتِ عملی کی بدولت اس زمانہ میں اطالیہ متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ جو آئے دن آپس میں برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ ۱۴۹۸ء میں فلارنساوی جمہوریہ میں ذمہ دار عہدہ پر فائز ہوا۔ بعد ازاں فرانس اور جرمنی میں سفارت کے فرائض ادا کئے۔

۱۵۱۳ء میں اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ (حکومت کو اس کی وفاداری پر شبہ ہو گیا تھا۔) لیکن کارڈینل جولئین کی سفارش سے رہائی نصیب ہوئی۔ چونکہ عقلمند تھا۔ اس لئے ۱۵۱۲ء میں سیاسیات (پبلک لائف) سے کنارہ کش ہو گیا۔ اور تا دمِ وفات (۱۵۲۷ء) تصنیف و تالیف میں مشغول رہا۔ اس کی تصانیف میں دو کتابیں بہت مشہور ہیں:۔ الملوک اور مقالات۔

(۱) الملوک (THE PRINCE) ۱۵۱۳ء میں لکھی۔ لیکن یہ کتاب اس کی وفات کے پانچ سال بعد شائع ہوئی (مصلحت کا تقاضا یہی تھا)

(۲) اس کتاب کے بعد اس نے اپنے "مقالات" لکھے۔ جو ۱۵۲۰ء میں شائع ہوئے۔

(۳) آخری تصنیف تاریخ فلارنس ہے جو ۱۵۲۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔

میکیاولی کا پیش کردہ نظریۂ "وطنیت"، دراصل رومن کیتھولک چرچ یا پوپوں کے خلاف ردعمل ہے۔ چونکہ یہ حضرات مذہب کی آڑ میں ذاتی اغراض پوری کرتے تھے۔ اور مذہب کو ذاتی اقتدار کے حصول کا ذریعہ بناتے تھے۔ اس لئے میکیاولی نے آخرالذکر اسکیم پر عمل کرکے سیاست کو مذہب سے جدا کر دیا۔ یعنی مملکت کو مذہب (کلیسا) کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے:۔

میکیاولی کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا۔ کہ یہ تو مسلّم ہے کہ یہ دنیا بدی کا گھر ہے۔ (اگر یہ سچ ہے۔ اور واقعی سچ ہے) تو پھر ایک نیک آدمی اس بری دنیا میں برا شہری نہ ہو تو کیا ہو؟ بالفاظ دگر، اگر اچھا شہری وہ ہے۔ جو اپنی مملکت کا وفادار ہو اور دنیا میں ہر مملکت ایک دوسری سے برسر جنگ ہے۔ تو پھر ایک اچھا شہری اگر برا آدمی نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟

میکیاولی نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے۔ ایک اچھے شہری کو برا (بد) آدمی ہونا چاہیئے۔ یعنی ایسا ہونا اس کا اخلاقی فرض ہے۔ اب ناظرین خود غور کرلیں۔ کہ میکیاولی نے اس جواب میں اخلاق کی کیسی مٹی پلید کی ہے۔ بقول میکیاولی، دنیا میں اخلاقی قانون کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ وطن پرستی (PATRIOTISM) ہے اسے یوں سمجھو کہ وطن پرستی ہی اعلیٰ اخلاقی قانون ہے اور اس کا

مطلب ہے اپنے سیاسی رہنما کے ہر قول اور ہر فعل کی تحسین۔ بالفاظ دگر سیاسی رہنما مجسم اخلاقی قانون ہے۔ عوام جھوٹ بولیں تو یہ ایک امر مذموم ہے۔ لیکن سیاسی رہنما اگر جھوٹ بولے یا فریب دے تو بر سراسر محمود، اور اس کے لائق تحسین ہے۔ اسی لئے اقبال نے اس نظریہ پر حسب ذیل تنقید کی :-

مرسلے از حضرت شیطان رسید	دہریت چوں جامۂ مذہب درید
سرمۂ او دیدۂ مردم شکست	آں فلارنسا دئی باطل پرست
فکر او مذموم را محمود ساخت	مملکت را دین او معبود ساخت

باطل از تعلیم او بالیدہ است
حیلہ اندازی فنے گردیدہ است (رموز بیخودی)

میکیاولی اپنی تصنیف مقالات میں لکھتا ہے :-

جب ہمارے ملک کی آزادی خطرے میں ہو تو اُس وقت ہمیں انصاف اور ناانصافی رحمدلی اور ظلم، برائی اور بھلائی ان تمام اخلاقی مسائل سے قطع نظر کر لینا واجب ہے۔ اور وہ کام کرنا چاہیے جس سے ملک کا وجود اور اُس کی آزادی برقرار رہے"![1] (مقالہ سوم فصل چہل ویکم)

---

[1] ناظرین اس اقتباس کو غور سے پڑھیں تاکہ اقبال کے اس مصرع کا مطلب واضح ہو سکے :

مصرع مملکت را دین او معبود ساخت

میکیاولی نے جو "دین" پیش کیا۔ اس میں اس نے خدا کے بجائے "وطن" کو انسانوں کا معبود قرار دیا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ

(۱) نیکی وہ ہے جسے اللہ نیکی قرار دے۔ (۲) مسلمان کا فرض ہے۔ کہ وہ دین کے لئے اپنی جان قربان کرے (۳) مقصد حیات اللہ ہے۔

(۴) مذہب کی بنیاد قومیت ہے۔

لیکن جب ہم پاکستان میں اس قسم کے نعرے سنتے ہیں :-

(۱) ہم اپنے مقدس وطن کی ایک ایک انچ زمین کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔

(۲) اب نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان بلکہ سب پاکستانی ہیں۔

(۳) مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔

(۴) ہماری پارٹی کا کوئی مذہب نہیں ہے۔

پروفیسر (G. H. SABINE) اپنی تالیف "تاریخ نظریات سیاسی" میں لکھتا ہے۔ اگرچہ میکیاولی کے زمانہ کے پوپ اکثر اوقات رذالت اور اسراف کا اظہار کرتے تھے۔ مگر وہ اپنی مملکت کو اطالیہ کی ساری مملکتوں میں مستحکم ترین بنانے میں ضرور کامیاب تھے۔ پہلے زمانہ میں وہ یہ چاہتے تھے۔ کہ ساری دنیائے نصرانیت انہیں اپنے تنازعات میں حکم تسلیم کرے مگر اب وہ صرف اس پر قانع ہیں کہ وسط اطالیہ میں ان کا اقتدار مسلم اور قائم رہے

دوسرے اطالوی باشندوں کی طرح میکیاولی بھی کلیسا کو اہل اطالیہ کی سیاسی ذلت و خواری کا ذمہ دار قرار دیتا ہے چنانچہ وہ اپنی تالیف

"مقالات میں لکھتا ہے۔ ہماری برائیوں اور بے دینی (دونوں عیوب) کی ذمہ دار کلیسائے روم اور اس کی قائم کردہ پادریوں کی جماعت ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر ہمارے سر پر کلیسا کا احسان یہ ہے کہ اس نے ہمارے ملک کو منتشر اور منقسم کر دیا ہے۔ اور یہ افتراق یقیناً ہماری بربادی کا سبب ہوگا۔ کلیسا میں نہ تو خود اس قدر طاقت ہے کہ وہ سارے ملک پر اپنی حکومت قائم کر لے۔ اور نہ وہ کسی دوسرے کو اس کی اجازت دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہمارا ملک متعدد مملکتوں (ریاستوں) میں منقسم ہو کر ہر اعتبار سے ضعیف ہوگیا ہے لہ

میکیاولی کے فلسفہ ریاست کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ سیاست کو اخلاق اور مذہب کی گرفت سے بالکل آزاد کر دیا جائے بلکہ مذہب اور اخلاق دونوں کو مملکت کا غلام بنا دیا جائے۔ یعنی خیر و شر کا معیار مذہب نہیں بلکہ مملکت ہے نیکی وہ نہیں ہے۔ جسے خدا نیکی قرار دے۔ بلکہ نیکی یا خیر یا بھلائی وہ ہے جس سے مملکت (اسٹیٹ) کو استحکام اور اقتدار حاصل ہو۔

میکیاولی نے کہا۔ کہ مذہب کو گرجے کی چاردیواری کے اندر محدود رہنا چاہیئے۔ پوپ یا کلیسا کو مملکت کے معاملہ میں دخل دینے کا

لہ اس اقتباس سے جو پروفیسر مذکور کی کتاب صت۲۱ سے پیش کیا گیا ہے میرے خیال کی تائید اور تصدیق ہوتی ہے۔ کہ نظریۂ وطنیت دراصل کلیسائے روم کے خلاف ردعمل کا راستہ نتیجہ ہے ۱۲۔

کوئی حق نہیں ہے۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مملکت یا سیاست لادین ہو گئی۔ یعنی نظم امور ریاست (انتظام مملکت) میں ارباب حکومت، مذہب سے بے تعلق ہو گئے۔ اور انہوں نے باآواز بلند کہنا شروع کر دیا۔ کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ حکومت کو مذہب سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ (وغیر ذالک من الخرافات)[1]

میکیاولی اپنے نظریہ کی حمایت میں صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ نصرانی ضابطہ اخلاق چونکہ صرف عقبیٰ کے لئے ہے اسلئے ہم اسے قبول نہیں کرتے نیز وہ تمام نصرانی نیکیوں (رحمدلی، ہمدردی ایثار، حلم، اور فروتنی) کو انسانی سیرت کی تشکیل کے حق میں مضر سمجھتا تھا وہ کہتا ہے کہ ان سے انسان کے اندر غلامانہ رجحان طبع پیدا ہوتا ہے (تاریخ نظریات سیاسی ص ۲۹۲)۔

چنانچہ مقالات ۲ : ۲ میں وہ لکھتا ہے۔

ہمارا مذہب، عاجزی کا، فروتنی اور انکساری کا اور دنیاوی اشیاء

---

[1] دولت خداداد پاکستان کے مستقبل کے لئے یہ بات کس قدر حوصلہ افزا اور خوش آئند ہے۔ کہ کچھ دن ہوئے ایک مشہور سیاسی جماعت کے مسلمان لیڈر نے پریس کانفرنس منعقدہ لاہور میں بڑے اطمینان کے ساتھ۔ یہ ایمان افروز نکتہ ارشاد فرمایا تھا کہ

ہماری پارٹی کا کوئی مذہب نہیں ہے

واضح ہو کہ اسی لادینی اصول کو سیاسی اصطلاح میں دسم لادینی دسیکولرازم کہتے ہیں۔ ۱۲۔

سے نفرت اور ان کی تحقیر کو بہترین قسم کی راحت وشادمانی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ دوسرے مذہب اس کے برعکس روحانی عظمت، جسمانی طاقت اور اُن تمام چیزوں کو خیر اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ جن کی بدولت انسان میں سطوت اور طاقت پیدا ہو سکے۔

ان اصولوں نے انسانوں کو ضعیف بنا دیا ہے۔ اسی لئے وہ بدکاروں کے پنجہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان پر بخوبی مسلط ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے۔ کہ اکثر الناس بغرض حصول جنت مظالم برداشت کرنے کو بدلہ لینے پر ترجیح دیتے ہیں۔

(تاریخ مذکور صفحہ ۳۹۲)

میکیاولی نے سیاسیات کے باب میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے۔ کہ ہر انسان پیدائشی طور پر باعتبارِ ذات خویش، خود غرض ہے۔ نیز اس نے عوام اور مدبرین ملک کے لئے جداگانہ اخلاقی معیار قائم کیا ہے۔ اور یہ دوگونہ معیار ہی میکیاولی کے پیش کردہ نظریہ کی روح رواں ہے یعنی حکمران تمام قوانین ملکی سے بالاتر ہے۔ بلکہ اگر ملکی قانون کوئی اخلاقی ضابطہ نافذ کرے۔ تو وہ اس ضابطہ اخلاق سے بھی بالاتر ہے۔ حکمران کے طرز عمل کو کسی اخلاقی ضابطہ سے نہیں جانچا جا سکتا۔ اس کے طرز عمل حسن و قبح کا معیار اخلاقی ضابطہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ دیکھا جائیگا۔ کہ وہ مملکت کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہوا یا نہیں؟ اگر وہ کامیاب ہے تو لائق تحسین ہے۔ چنانچہ میکیاولی نے بادشاہوں اور حکمرانوں کے لئے صاف لفظوں میں قتل و غارت بے ایمانی اور ظلم و ستم کو جائز قرار

دیا ہے بشرطیکہ ان مذموم افعال سے وہ مملکت کو مستحکم کرسکیں کتاب الملوک فصل پانزدہم میں وہ لکھتا ہے. کہ جو بادشاہ اپنے تخت و تاج کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے اُس کو لازم ہے کہ وہ موقع اور مصلحت کو دیکھکر کام کرے اگر کسی وقت بدی کا ارتکاب ضروری ہو تو وہ بلا خوف لومۃ لائم، بدی کا مرتکب ہوسکتا ہے بادشاہت قایم رکھنے کے لئے ہر فعل (خواہ وہ کتنا ہی معیوب کیوں نہ ہو) جائز ہے. یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض اوقات نیکی سلطنت کی تباہی کا موجب ہوسکتی ہے بعض اوقات وہ امور جو اخلاقی زاویہ نظر سے مذموم ہیں بادشاہ کے حق میں مفید ہوسکتے ہیں۔

خلاصہ کلام اینکہ میکیاولی نے مملکت کو معبود بنا دیا اور مذہب اور اخلاق دونوں کا خاتمہ کر دیا. اور بقول پروفیسر سیبائن میکیاولی کی تعلیم یعنی مذہب کی حقانیت سے بے اعتنائی، جدید سیاسی فکر کا طغرائے امتیاز ہے۔ (صہ ۳۰۲)

ان تصریحات سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ اقبال نے نظریۂ وطنیت کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے. وہ بالکل صحیح اور برمحل ہے یعنی یہ نظریہ مذہب اور اخلاق دونوں کے حق میں زہر قاتل ہے.

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے. وہ مذہب کا کفن ہے (بانگ درا)

نظریۂ وطنیت کا منطقی نتیجہ یہ ہے. کہ جو قوم اس نظریہ کو قبول کرتی ہے. وہ خدا کے بجائے وطن کو اپنا معبود بنا لیتی ہے یعنی مذہب اور اخلاق دونوں سے بیگانہ ہو جاتی ہے. اسی نظریہ کو قبول کرنے کا نتیجہ

یہ نکلا کہ یورپ خدا سے بیگانہ ہو گیا۔ اور مادہ پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گیا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بے منزل است

یعنی اقوام یورپ کی نگاہ میں انسان، سالمات مادی کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ یعنی کائنات کا خالق خدا نہیں ہے۔ بلکہ مادہ ہے۔ اور چونکہ مادہ بے شعور ہے اس لئے انسان کی زندگی بھی بے مقصد ہے۔ زندگی وہ کارواں (قافلہ) ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔

یورپین اقوام کے اسی ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان، نوع انسان کا شکاری بن گیا ہے۔ ہر طاقتور قوم کمزور قوموں کو ہلاک کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ دنیا جہنم بن گئی ہے۔ اور امن و اماں بالکل مفقود ہو گیا ہے۔

دوسرا بند:۔ پہلے بند میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ یورپ کی نگاہ میں (۱) کائنات کی اصل یا بنیاد مادہ ہے۔ (۲) انسان سالمات مادی کے امتزاج کا نام ہے۔

اس بند میں وہ اسلام کا نقطۂ نگاہ پیش کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں

ہر چہ می بینی ز انوار حق است
حکمت اشیاء ز اسرار حق است

اس اہم شعر کے پہلے مصرع میں انہوں نے مسلک مادیت کا

ابطال کر دیا ہے. کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اس کائنات کی اصل مادہ نہیں ہے. بلکہ "نور حق" ہے جو کچھ تو دیکھتا ہے (یعنی یہ عالم محسوس) سالمات مادی کے امتزاج کا نتیجہ نہیں ہے. بلکہ تمام اشیائے کائنات وہ مظاہر ہیں جن سے نور حق ظاہر ہو رہا ہے. اصل کائنات مادہ نہیں ہے. بلکہ نور ہے. یہ تعلیم اس آیت سے مقتبس ہے :-

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (۲۴ - ۳۵)

اللہ ہی نور ہے آسمانوں اور زمین (ساری کائنات) کا۔ ۱۲

بجوائے قرآن کائنات کی اصل (مادہ نہیں ہے بلکہ) نور ہے. چنانچہ اسی آیت کی شرح اقبال نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تشکیل جدید" ص۶۶ میں یوں کی ہے.

یہ دنیا سالمات مادی کی بے شعور حرکت سے لیکر انسانی خودی میں فکر کی حرکت تک، انائے کبیر (خدا) کا جلوۂ ذات ہے.

آسان لفظوں میں یوں سمجھو کہ ہر شی (ہر چہ مے بینی) مظہر ذات وصفات حق ہے.

ع ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

اسی حقیقت کو شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی یوں بیان کرتے ہیں :-

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا

اور خواجہ میر درد دہلوی اسی صداقت کو یوں عیاں کرتے ہیں :-

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا ۔ اعیان ہیں مظاہر، ظاہر ظہور تیرا

اسی نقطہ کو شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی یوں آشکار کرتے ہیں "
"عکوس اسماء و صفات ، خلائق ممکنات (اصل کائنات) ہیں"
آخر میں غالب کا انداز بیان بھی لائق توجہ ہے :

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

الغرض اسلام کی تعلیم یہ ہے۔ کہ کائنات کا خالق اور صانع مادہ نہیں ہے۔ بلکہ حق تو ہے اور چونکہ وہ حکیم اور علیم ہے۔ اسلئے اس نے انسان کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ یعنی کاروان زندگی کی ایک خاص منزل ہے۔

اب دوسرا مصرع پڑھیے

ع حکمت اشیا ز اسرار حق است

یعنی اشیائے کائنات میں جو حکمت پائی جاتی ہے وہ خدا کی ہستی پر دلالت کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اشیائے کائنات کی بناوٹ میں غور کرنے سے ہر عقلمند آدمی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ کہ ان کو کسی حکیم اور علیم ہستی نے بنایا ہے۔ اسی کو ہم خدا کہتے ہیں

ع ہر ورقے دفتریست ز معرفت کردگار (سعدی)

دوسرا شعر : ہر کہ آیات خدا بیند حر است الخ

اس شعر کے پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو شخص اللہ کی آیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ حر ہو جاتا ہے یعنی غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب وہ مظاہرِ کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر شی اللہ کی مخلوق ہے

یعنی اپنے وجود میں اللہ تو کی محتاج ہے۔ اور میری طرح عاجز، مسکین اور ناتواں ہے۔ چونکہ ایسا ہے اسلئے نہ کوئی شے مجھے کچھ دے سکتی ہے نہ مجھ سے کچھ لے سکتی ہے۔ نہ مجھے نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان نہ مجھ پر حکومت کر سکتی ہے۔ نہ مجھے اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتی ہے لہذا میں اللہ کے سوا کسی کو اپنا رازق مالک یا حاکم نہیں بناؤں گا بس یہ احساس انسان کو "حر" یعنی مومن بنا دیتا ہے۔

جو خود محتاج ہووے دوسرے کا

بھلا اُس سے مدد کا مانگنا کیا

اب دوسرے مصرع کا مطلب سنو:۔

اقبال کہتے ہیں کہ پہلے مصرع میں جو حکمت میں نے واضح کی ہے اُس کی بنیاد قرآن حکیم کا یہ حکم ہے:۔

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ط وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ط وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ہ (۸۸: ۱۷ تا ۲۰)

پس کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا؟ اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے بلند کیا گیا؟ اور پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے قائم کئے گئے؟ اور زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے۔؟

ان آیتوں میں اللہ تو نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین (یعنی جملہ مظاہر فطرت) کا بغور مشاہدہ کریں تاکہ ہمارے اندر اسکی ہستی کا یقین پیدا ہو سکے[۱]

---

[۱] نظام عالم بتلاتا ہے کہ ہے اک اسکا بنانیوالا — ظہور آدم دکھا رہا ہے کوئی دلیل آنیوالا
(اکبر الہ آبادی)

تیسرا اور چوتھا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب انسان مظاہر فطرت (آیات خدا) کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ نیز اس کے اندر خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جب علم اُس کے دماغ کو منور کر دیتا ہے تو اُس کے اندر تقویٰ (خشیۃ اللہ) پیدا ہو جاتا ہے۔[1]

اشعار ۵ تا آخر:۔ اس کے بعد اقبال کہتے ہیں کہ علم اشیاء (سائنس) سے ہمارے اندر خدا کی ہستی پر ایمان پیدا ہوتا ہے لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ یورپ (افرنگ) میں اس کی تاثیر (سائنس کے مطالعہ کا نتیجہ) بالکل برعکس ہے یعنی اہل یورپ کے پاس خیر و شر (خوب و زشت) کا کوئی معیار نہیں ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا اور وحی دونوں کے منکر ہیں) اس لئے لازمی طور سے ان کے اندر نہ انسانیت اور ہمدردی ہے نہ رحمدلی اور محبت ہے۔

ان کا طرز عمل ایسا غیر شریفانہ اور بہیمانہ ہے کہ اس کی وجہ سے علم (سائنس اور فلسفہ) بھی سارے عالم میں ذلیل رسوا ہو گیا ہے بلکہ ان کی اخلاقی حالت اس قدر زبوں ہے کہ اگر کوئی فرشتہ بھی ان کی صحبت اختیار کرے تو شیطان ہو جائے واضح ہو کہ فرشتوں میں بدی کا مادہ بالکل نہیں ہوتا۔ لیکن اقوام مغرب کی صحبت میں رہ کر وہ بھی ابلیس صفت ہو جائینگے۔

[1] چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر ۳۵-۲۸) خدا سے تو صرف وہی بندے ڈرتے ہیں جو (خدا کے آثار قدرت) کا علم رکھتے ہیں۔ ۱۲۰

چونکہ اہل یورپ کا دل ہمدردی کے جذبات سے خالی ہے اس لیئے ان کا علم ان کو بنی آدم کی ہلاکت کے نت نئے طریقے سجھاتا رہتا ہے جن کی وساطت سے وہ نوع انسان کو ہلاک کرنے کے لیئے ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔[1]

وجہ یہ ہے کہ اس جہان خیر و شر میں اگر علم (سائنس) کمینہ فطرت لوگوں کے ہاتھ میں آجائے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں یعنی علم و ہنر کا نشہ اُن کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔

افسوس! اہل یورپ نے علم حق کو ساحری میں تبدیل کر دیا بلکہ کافر بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ان کی زندگی کافرانہ ہو گئی اور جب وہ اللہ کے منکر ہو گئے تو دنیا میں فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا

اے مسلمان اگر ہو سکے تو اس رہزن (یورپ) کے ہاتھ سے یہ تلوار چھین لے تاکہ دنیا اس کے ظلم و ستم سے محفوظ ہو جائے۔

اے مسلمان چونکہ تو انسان کو صرف مادہ کی پیداوار نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایک ذی روح ہستی تسلیم کرتا ہے اسلیئے

بیت سحر این تہذیب لادینی شکن

اس ملحدانہ تہذیب کے طلسم کو پاش پاش کر دے۔

یورپ کے جسد بے روح میں ایمان باللہ کی روح پھونک دے

---

[1] ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی موجودگی میں اقبال کا یہ شعر بلا مبالغہ بالکل صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ کس قدر سچ لکھا ہے اقبال نے۔

بیت دانش افرنگیان تیغ بدوش

تاکہ وہ حقیقت تک پہنچ سکے۔ یعنی وہ اس نکتہ کا مفہوم سمجھ سکے کہ اگر عقل انسانی دل کی مطیع ہو جائے تو انسان کو اللہ تک پہنچا دیتی ہے اسے اللہ والا یعنی نیک بنا دیتی ہے لیکن اگر عقل انسانی دل کی گرفت سے آزاد ہو جائے تو پھر وہی انسان خدا کی بجائے شیطان کا بندہ بن جاتا ہے۔ اور دنیا کو اپنے طرز عمل سے زندہ جہنم بنا دیتا ہے۔ جسے شک ہو وہ آنکھیں کھول کر عصر حاضر کا مطالعہ کرے

ولیکن الامان از عصر حاضر — کہ شیطانی بسلطانی ہم کرد

(ارمغان حجاز)

تیسرا بند:۔ اس بند میں اقبال نے یورپ کی درندگی اور بہیمیت کو اطالیہ کی مثال سے واضح کیا ہے چونکہ اقوام یورپ خدا اور آخرت دونوں کی منکر ہیں اس لئے ان میں اور بھیڑیوں میں طرز عمل کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ثبوت درکار ہو تو اطالیہ کے طرز عمل کا مشاہدہ کافی ہے کہ اس نے بلا وجہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حبش پر حملہ کر دیا۔ اور مئی ۱۹۳۶ء اس ملک کا حکمران ہیل سلاسی اپنے تخت و تاج کو خیرباد کہہ کر برطانیہ کی حمایت میں آگیا۔

لیگ آف نیشنز نے زبانی بہت کچھ احتجاج کیا۔ مگر مسولینی نے مطلق توجہ نہ کی۔ اور حبش کو اطالوی سلطنت کا ایک صوبہ بنا دیا۔ مسولینی پر احتجاج کا کوئی اثر اس لئے مرتب نہ ہو سکا کہ جو حکومتیں احتجاج کر رہی تھیں۔ وہ خود اس جرم کی مرتکب ہو چکی تھیں (واضح ہو کہ برطانیہ اور فرانس نے ہندوستان اور الجیریا میں اطالویوں سے بڑھ کر ظلم و ستم کے مظاہرے کئے تھے۔)

خوش قسمتی سے ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ اور ۱۹۴۱ء میں "برادر شغال" نے بادشاہ حبشہ کو دوبارہ تخت نشین کر دیا۔

اس واقعہ سے اقبال نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ

(۱) یورپ کی شریعت میں (ضابطہ اخلاق میں) کمزور قوموں کو غلام بنانا اور بے گناہ انسانوں کو قتل کرنا دونوں باتیں جائز ہیں۔

(۲) جنیوا میں مکر و فریب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جنیوا کنایہ ہے۔ "مجلس اقوام" سے جس کا مرکز اس زمانہ میں جنیوا تھا یہ کفن چوروں کی مجلس گذشتہ جنگ عظیم میں اپنی موت آپ ہی مر گئی۔ اور اس کی جگہ یو۔ این۔ او۔ معرض وجود میں آ گئی مسلمانوں کو نہ اول الذکر سے کچھ فائدہ پہنچا نہ آخر الذکر سے کسی فائدے کی توقع ہے۔

اقبال نے "احوال حبش" سے عبرت اندوز ہونے کی تلقین کی ہے مگر خوش قسمتی سے مسلمانوں کو ایسے رہنما میسر آ گئے ہیں جنہوں نے ان کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ دی ہے اور چونکہ یہ قوم بصارت ہی سے محروم ہو چکی ہے تو "عبرت آموزی" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

اس کے بعد اقبال ہمیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

چوتھا بند:- (۱) تمام نسلی، قومی، لسانی، وطنی اور جغرافیائی امتیازات کو مٹا دو۔ کیونکہ اسلام تو عالمگیر برادری قائم کرنے آیا ہے اسلئے

که درنگاہے او یکے بالا و پست

(۲) اپنی صلاحیتوں پر ایمان لاؤ یعنی اعتماد علی النفس کی صفت پیدا کرو دوسروں کے سہارے سے زندگی بسر کرنا چھوڑ دو۔ اور افرنگ کی عظمت کا صاف لفظوں میں انکار کر دو۔ یعنی انہیں اپنے سے

زیادہ طاقتور مت سمجھو۔ احساس کمتری کو اپنے دل سے نکال دو۔ تم یورپین اقوام سے کسی طرح کم نہیں ہو۔

دنیا میں سچائی کا علم بلند کرو اور ایشیائی اقوام کو اتحاد کا پیغام دو اے مسلمانوں یاد رکھو۔ کہ مشرقی اقوام کی لاج تمہارے ہاتھ ہے۔

(۲) اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو کہ جب تک تم اپنے اندر قوت اور طاقت پیدا نہیں کروگے دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ یعنی باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتے اور ہر قوم جمعیت (اتحاد) کی بدولت ہی قوت حاصل کر سکتی ہے۔ جس قوم کے افراد میں اتحاد نہ ہو۔ وہ ہمیشہ غلام رہیگی۔

(۳) یاد رکھو کہ دنیا میں باعزت زندگی بسر کرنے کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔

(الف) واسلے (بصیرت، علم، عقیدہ، تصور، سمجھ بوجھ، دستور العمل ضابطہ وغیرہ) کے ساتھ اگر قوت شامل نہ ہو تو وہ محض مکر دفسوں ہے یعنی کوئی شخص اپنے کسی خیال کو خواہ وہ کتنا ہی نیک اور پاکیزہ اور اچھا کیوں نہ ہو دوسروں سے تسلیم نہیں کرا سکتا۔ جب تک اس کے پاس قوت نہ ہو۔ کسی اسکیم پر عمل کرانے سے پہلے طاقت کا ہونا اشد ضروری ہے۔

(ب) لیکن اگر کسی کے پاس کوئی صحیح پروگرام یا ضابطہ نہ ہو اور صرف قوت ہی ہو تو وہ قوت بنی آدم کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتی بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ ان کے حق میں بجائے بے درماں بن جائے۔

واضح ہو رہا ہے کہ در اصل اقبال کی مراد وہ بصیرت ہے جو
رشا قرآن وحدیث کے مطالعہ سے پیدا ہو سکتی ہے یعنی علم شریعت
اور قوت سے خلافت مراد ہے تاکہ خلیفہ نظام شرعی کو نافذ کر سکے
اور جو مسلمان اس نظام (قانون الٰہی) کو تسلیم نہ کرے اسے "سیفٹی ایکٹ"
کے تحت گرفتار کر کے جیل خانہ بھجوا سکے ۱۲۰

پانچواں بند:- اس بند میں اقبال نے ایشیا کی عظمت کو اجاگر کیا ہے
چنانچہ کہتے ہیں یہ براعظم اس لحاظ سے ساری دنیا پر فضیلت رکھتا
ہے کہ شروع ہی سے عشق اور عقل دونوں کا گہوارہ رہا ہے

دنیا کے تمام مشہور مذاہب۔ مجوسیت، یہودیت، مسیحیت، ہندو دھرم
جین دھرم، بودھ دھرم اور اسلام، اسی براعظم میں پیدا ہوئے
حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، سری کرشن مہاراج اور
سرکار ابد قرار صلعم نے انسانوں کو عشق الٰہی کا سبق پڑھا کر، سوز و ساز
درد و داغ سے آشنا کیا۔ انبیاء کے علاوہ ہزاروں اولیاء اسی براعظم
کی خاک سے اٹھے۔ جنہوں نے لاکھوں انسانوں کو محبت خداوندی کا نغمہ
سنا کر حقیقی معنیٰ میں انسان بنایا۔

اسی سرزمین سے ہزاروں عرفاء اور رشی پیدا ہوئے جنہوں نے
انسانوں کو معرفت کی شراب پلائی۔ اور روحانیت کے پوشیدہ اسرار
فاش کئے دنیا میں تمام علوم وفنون ایشیائی قوموں ہی کی بدولت پروان
چڑھے ہیں۔

ہم ہی سے دنیا میں علم وہنر کی روشنی پھیلی ہم ہی نے دنیا کو اس
نکتہ سے آگاہ کیا۔ کہ ہر شے میں ایک ہی حقیقت جاری وساری ہے۔

وہی ذات واحد انسان میں روح بنکر نمودار ہوتی ہے۔

بلبل میں نغمہ ہو کر سننے والے کو محو حیرت بناتی ہے

یعنی اصل کے اعتبار سے خون آدم اور رنگ گل میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

ہم ہی نے دنیا والوں کو سب سے پہلے اسرار وجود سے آگاہ کیا یعنی وہ حکماء اسی سرزمین میں پیدا ہوئے جنہوں نے دنیا کو فلسفہ کی لذت سے آشنا کیا۔ اور مسائل حیات میں غور و فکر کر کے کائنات کی اصل کا سراغ لگایا۔

ع زد نخستیں زخمہ بر تار وجود

یہ شاعرانہ انداز بیان ہے لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا کہ ہماری ہی فکر نے وجود کے تاروں پر سب سے پہلے مضراب لگائی مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اولی (ما بعد الطبیعات) کے مسائل میں سب سے پہلے ایشائی قوموں ہی نے غور و فکر کی۔

ہم نے سب سے پہلے خود اپنے سینہ میں عشق کی آگ روشن کی یعنی بھگتی مارگ (طریق محبت) دریافت کیا پھر دنیا کو اس مسلک سے آشنا کیا۔ واضح ہو کہ حقیقت رسی کے دو ذریعے ہیں عقل اور عشق۔

جن لوگوں نے عقل کے ذریعہ سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ان کو حکماء کہتے ہیں ان لوگوں نے فلسفہ کے مختلف مدارس فکر قائم کئے جن کو ہندی میں درشن کہتے ہیں۔

جن لوگوں نے عشق کے واسطے سے حقیقت دریافت کر لی۔ اُن

کو عرفا و رشی کہتے ہیں ان حضرات نے پریم کا پیالہ پلا کر سالکوں کو راہ محبت (بھگتی مارگ) پر چلایا۔ اور محبوب حقیقی سے واصل کر دیا

اس کے بعد اقبال ایشیائی اقوام سے خطاب کرتے ہیں کہ تم لوگ تہذیب اور دین کی دولت کے امین ہو اب وقت آ گیا ہے کہ یورپ کو اس دولت سے فیضیاب کرو اور اس کی مشکلات کو حل کر دو۔ لہٰذا تمہارا فرض یہ ہے کہ یورپ کی بےواقعی عظمت کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ اور ہمت کر کے جمعیت اقوام مشرق قائم کرو

نوٹ:۔ اس بند میں اقبال نے یہ بہت بلند پایہ اور بلیغ شعر لکھا ہے۔

فکر ما جویائے اسرار وجود
زد نخستیں زخمہ بر تار وجود

واضح ہو کہ وجود کے مسئلہ پر دنیا میں سب سے پہلے ہند کے حکماء نے غور کیا۔ اور انہوں نے اس مسئلہ میں ایسی دقت نظر سے کام لیا۔ اور ایسی ایسی موشگافیاں قائم کیں۔ کہ آجتک کوئی قوم اس میدان میں اُن سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

افلاطون، ارسطو، فلاطینس (Plotinus) ڈیکارٹ اسپنوزا، ہابز، لاک، بارکلے، لائبنز، ہیوم، کانٹ، فختے، شیلنگ ہیگل، شوپن ہار، بریڈلے، الگزینڈر، اور میک ٹیگرٹ نے جو کچھ لکھا ہے یہ سب قدیم ہند کے حکماء کے افکار کی صدائے بازگشت ہے۔

جب انیسویں صدی میں مستشرقین نے قدیم ہندو فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ تو اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ فلسفہ کا کوئی قابل ذکر مذہب ایسا نہیں ہے جو ہندوستان میں قائم نہ ہو چکا ہو

چنانچہ پروفیسر میکس مولر نے (جو سنسکرت کا بہت بڑا عالم اور ہندو فلسفہ کا بہت بڑا نقاد تھا) ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے "ہندوستان ہمیں کون کون سے علوم پڑھا سکتا ہے۔ اس کتاب میں اس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ کہ ہندی فلسفہ انسانی فکر کی انتہائی پرواز ہے اسکے علاوہ پروفیسر گلیتھ پروفیسر سیکڈ انلڈ، پروفیسر ولسن سر مائینز ولیمس اور دوسرے مستشرقین نے بھی ہند کا فلسفہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

یہ صراحت میں نے اس لئے کی ہے کہ ناظرین پر اقبال کے مذکورہ بالا شعر کی صداقت آشکار ہو جائے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس شرح میں وجود کی بحث کو تفصیل سے نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ یہ بحث انتہائی مشکل ہے اگر میں اس کو کماحقہ لکھوں تو کئی سو صفحے درکار ہیں اور یہ شرح اسکی متحمل نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں یہ بحث اسقدر عالمانہ اور دشوار (TECHNICAL) ہے۔ کہ اس شرح کے اکثر ناظرین اس سے مستفید نہیں ہو سکتے اسلئے میں صرف چند تمہیدی امور اور چند اشارات پر اکتفا کرونگا کہ ناظرین کو اس کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو جائے۔

(۱) لفظ وجود کے دو معنی ہیں۔

(i) وجود بمعنی کون (حصول یا بودن یا ہونا یعنی ایک وصف انتزاعی یا معنی مصدری۔ یہ مصدری مفہوم تمام مفاہیم مصدریہ کی طرح

لہ یعنی فنی مصطلحات سے معمور ہے۔ ۱۲

ایک اعتباری مفہوم ہے۔ جو ظرف خارج میں منشار کے سوا کچھ نہیں ہے مثلاً کھڑا ہونا یا بیٹھنا جب زید کھڑا ہوا تو حالت قیام سے ایک مفہوم ذہن میں موجود ہو گیا۔ لیکن اس تصور (قیام) کا منشا کے سوا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے۔ چنانچہ اگر زید بیٹھ جائے تو اب کھڑے ہونے کا وجود خارج میں کہیں موجود نہیں ہے۔ اس اعتبار سے وجود ایک وصف انتزاعی یا معنی مصدری ہے اور فلسفہ میں وجود کے اس مفہوم سے بحث نہیں کیجاتی

(ب) وجود بمعنی مابہ الموجودیت یعنی وہ شے جس کی وجہ سے کوئی شئ خارج میں موجود ہو جاتی ہے بالفاظ دگر وجود بمعنی وہ حقیقت جس کا خارج پایا جانا ضروری ہے جس سے معنی مصدری منتزع ہوتے ہیں مثلاً وجود زید جس سے قیام یا جلوس کا معنی منتزع ہوتا ہے فلسفہ میں وجود کے اسی مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔

(۲) ہر عقلمند آدمی دیکھتا ہے اور تسلیم کرتا ہے۔ کہ کائنات موجود ہے اور اس میں لاتعداد اشیاء موجود ہیں جس طرف دیکھیو کوئی نہ کوئی شئی موجود ہے اس لئے یہ سوال سامنے آیا کہ وجود، جس کی بنا پر تمام اشیائے کائنات موجود ہیں (وجود ہر شے میں مشترک ہے) کیا ہے؟ یہیں سے بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

(۳) دنیا کے تمام نامور حکمار نے وجود سے بحث کی ہے اور اس بحث کی وجہ سے حکمار کے کئی گروہ قائم ہو گئے مثلاً مشائیہ، اشراقیہ، متکلمین (اشاعرہ) اور صوفیہ ان میں اختلافات رونما ہوئے اور ان کی بنا پر بہت سے مسائل زیر بحث آگئے۔ ذیل میں چند مسائل درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ ناظرین بحث وجود کی وسعت اور

اہمیت کا کچھ اندازہ کر سکیں۔

پہلا مسئلہ :۔ وجود کا تصور ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

دوسرا مسئلہ :۔ اگر وجود کا تصور ممکن ہے تو وہ تصور بدیہی ہے یا نظری ؟

تیسرا مسئلہ :۔ وجود بسیط ہے یا مرکب ؟

چوتھا مسئلہ :۔ وجود کی منطقی حد ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

پانچواں مسئلہ :۔ وجود کی منطقی رسم ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

چھٹا مسئلہ :۔ وجود کا اطلاق موجودات پر کس طرح ہوتا ہے ؟
باشتراک لفظی یا باشتراک معنوی ؟
اگر معنوی ہے تو کس طرح کا ہے ؟

ساتواں مسئلہ :۔ متکلمین، مشائیہ اور اشراقیہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وجود کا اشتراک ان غیر متناہی مصادیق میں، معنوی اشتراک ہے۔ لیکن اس اشتراک کا مفہوم متعین کرنے میں یہ تینوں گروہ مختلف الخیال ہو گئے۔ اسلئے کئی مسائل پیدا ہو گئے۔

آٹھواں مسئلہ :۔ امر واحد کا انتزاع امور کثیرہ سے، بلا اشتراک منشاء ممکن ہے یا نہیں ؟

نواں مسئلہ :۔ موجودات پر وجود کا حمل بالمواطات ہے یا بالاشتقاق ؟

دسواں مسئلہ :۔ وجود موجودات کے لئے عین ہے یا جز ہے یا وصف ہے ؟

گیارہواں مسئلہ :۔ وجود باری، عین ذات ہے یا غیر ذات ؟

بارہواں مسئلہ :۔ صوفیہ اشراقیہ اور متکلمین اگرچہ عینیت کے قائل ہیں مگر تعبیر میں مختلف الخیال ہیں اسلئے کئی مسائل پیدا ہو گئے۔

تیرہواں مسئلہ :۔ وجود اصل ہے باذات؟ یعنی معقول اول وجود ہے یا ذات؟

چودہواں مسئلہ :۔ وجود کا منشاء انتزاع کیا ہے؟

پندرہواں مسئلہ :۔ وجود، ماہیات کے لئے عین ہے یا غیر؟

سولہواں مسئلہ :۔ وجود ماہیات کو عارض ہوتا ہے یا ماہیات وجود کو عارض ہوتی ہیں۔

حکماء کہتے ہیں کہ وجود عارض ماہیات ہے صوفیہ کہتے ہیں کہ وجود عارض نہیں بلکہ معروض ہے چنانچہ جامی کہتے ہیں:۔

لیکن بمکاشفات ارباب شہود

اعیاں ہمہ عارض اند و معروض وجود (لائحہ چہارم)

سترھواں مسئلہ :۔ وجود ممکن کے لئے عین ہے یا زائد بر ذات؟

اٹھارہواں مسئلہ :۔ وجود کلی طبعی ہے یا جزئی حقیقی؟

حکماء کہتے ہیں کہ وجود کلی طبعی ہے صوفیہ کہتے ہیں کہ جزئی حقیقی ہے یعنی فرد واحد میں منحصر ہے۔ جیسے اللہ کہتے ہیں۔

انیسواں مسئلہ :۔ کلی طبعی خارج میں موجود ہے یا نہیں؟

بیسواں مسئلہ :۔ وجود ذہنی کا اثبات ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اب ناظرین خود غور فرمالیں کہ اگر ہر مسئلہ پر دس صفحے بھی لکھے جائیں تو ان تمام مسائل کے لئے کس قدر صفحات درکار ہونگے اور بحث کس قدر عالمانہ فنی اور خشک ہو گی۔ اس کا اندازہ ان سوالات کی نوعیت سے بآسانی ہو سکتا ہے اسی لئے میں نے اس شرح میں وجود کی بحث چھیڑنے سے اجتناب کیا ہے۔ ناظرین میں سے جن کو اس بحث سے

دلچسپی ہو وہ حسب ذیل کتب کا مطالعہ فرمالیں :۔

(ا) شرح مواقف ، شرح مقاصد ، شرح مطالع ، شرح تجرید ، اسفار اربعہ ، مباحث مشرقیہ ، فتوحات مکیہ (اس موضوع پر لاجواب کتاب ہے) ، حکمۃ الاشراق ، حجۃ البازغہ ، شفاء ، الجواہر الغالیہ شرح حاشیۂ زاہدیہ علی شرح المواقف ۔

(ب) انگریزی داں حضرات کو وجود کی بحث حسب ذیل حکماء کی تصنیف میں مل جائیگی ۔ ارسطو ، پلوٹا ئینس ، اسپنوزا ، کانٹ ، ھیگل ، برگساں ، الگزینڈر اور بریڈلے ۔

(ج) ہندی حکماء کے افکار سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر داس گپتا کی تاریخ فلسفہ ہند کا مطالعہ کافی ہوگا ۔

چھٹا بند :۔ کہتے ہیں کہ جب تم اقوام فرنگ کی عیاری دروغ بافی اور فریب کاری سے اچھی طرح آگاہ ہوچکے ہو تو ان کی قید سے نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ؟[1]

واے برحال ما کہ یہ قومیں رات دن ملت اسلامیہ کے جسم ناتواں کو مجروح کر رہی ہیں ۔ مثلاً کبھی الجیریا کے بیگناہ مسلمانوں کا قتل عام کررہی ہیں ، کبھی فلسطین کے نہتے مسلمانوں پر گولہ باری کررہی ہیں لیکن ہم انہی ظالموں سے عدل و انصاف کی توقع کرتے ہیں جو قومیں شبانہ روز چرکے لگا رہی ہیں ہم انہی سے "رفو" زخموں کے اندمال کی امید رکھتے ہیں !

[1] واضح ہو کہ اقبال نے یہ مصرع " تا کجا در قید زنار فرنگ " ([illegible]) میں لکھا تھا کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ان کی قید سے نکلنے کی کوشش کے بجائے ہم رات دن اپنے مغفروں سے حلقے کس رہے ہیں جال کا ۔ ۱۲

اے مخاطب! اس زمانہ میں مغربی قومیں سوداگری کے پردے میں ظاہری (حکمرانی) کر رہی ہیں پہلے سیاسی طور پر غلام بناتی ہیں پھر معاشی اعتبار سے اپنا دست نگر بناتی ہیں۔

اگر تم ان کی ڈپلومیسی سے بخوبی واقف ہو جاؤ تو تمہیں اپنا ٹاٹ (کرپاس) ان کے ریشم (حریر) سے بہتر معلوم ہوگا۔ یعنی پھر تمہیں ان کی مصنوعات سے نفرت ہو جائے گی[1]

لہذا اے مسلمان ان کو تجارتی بائیکاٹ کر دے[2]

---

[1] افسوس ہے کہ ہمیں ابھی تک ان کی مصنوعات سے نفرت نہیں ہوئی اور مصنوعات ہی پر کیا موقوف ہے ہمیں ان کی کسی چیز سے نفرت نہیں ہے انہی کا لباس انہی کی زبان انہی کے آداب انہی کے اصول۔

[3] انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی! (اکبر الہ آبادی)

[2] اقبال نے ولایتی مال کے بائیکاٹ کا مشورہ (جسے ان کی قوم نے مطلق قبول نہیں کیا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ "اقبال ڈے" کے جلسوں میں جو حضرات تقریریں کرتے ہیں وہ عموماً ملبوس فرنگ میں جلوہ گر ہوتے ہیں) ۱۹۳۵ء میں دیا تھا۔ لیکن آر دوند و گھوش نے اپنی قوم کو یہ مشورہ تیس سال قبل دیا تھا۔ اور اس کی قوم نے یہ مشورہ قبول بھی کیا۔ جس کا ثبوت راجن بابو، راد ہا کرشنن، راجگو پال اچاریہ، جواہر لعل نہرو اور سری کرشن سہنا کی زندگی سے بآسانی مل سکتا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو ان کی تصویریں ایک نظر دیکھ لی جائیں۔ اس کے بعد مصر، عراق اور... کے ارباب اقتدار کے درشن کرائے جائیں۔

[4] حقیقت صاف کھل جائیگی وقت امتحان اُن کی۔ ۱۲

(بے نیاز از کارگاہ او گذر) اور یاد رکھ! ان قوموں کی عیاری اور خباثت کا یہ عالم ہے۔ کہ تجھے "بے حرب و ضرب" ہلاک کر دیتی ہیں،
"ذبح المسلم بغیر سکین"

چونکہ یہ قومیں تیری دشمن ہیں۔ تجھے مٹانے پر تلی ہوئی ہیں اس لئے تو ان سے بکلی قطع تعلق کر لے۔ اور اپنی ادنیٰ چیز (بہدتی) کے بدلہ میں ان کی اعلیٰ چیز (فرزیں) مت قبول کر، کیونکہ پھر تو معاشی اعتبار سے بھی ان کا غلام ہو جائیگا۔

ان کے جواہرات بظاہر خوش رنگ ہیں مگر در اصل سب میں کوئی نہ کوئی عیب ہے۔ ان کی عیاری اور فریب کاری کا یہ عالم ہے کہ جو مشک وہ تیرے ملک میں بھیجتے ہیں۔ وہ ہرن کی ناف کے بجائے کتے کی ناف سے نکلا ہوا ہے۔ یعنی وہ مشک نہیں ہے۔ بلکہ ایک ناپاک شئی ہے۔ اور اس لئے قابل احتراز ہے۔

اے مسلمان! اگر تو ان کی تیار کردہ مخمل کے بستر پر آرام کرنے کا عادی ہو گیا۔ تو یاد رکھ کہ کچھ دنوں کے بعد تیری آنکھوں سے نیند ہی غائب ہو جائیگی۔[۲]

---

[۱] یہ حقیقت محتاج ثبوت نہیں ہے۔
بقیہ امریکہ کی مناتے ہیں۔ جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں۔

[۲] اقبال کی یہ پیشنگوئی اس زمانہ میں پوری ہو گئی۔ واقعی اب ہمارے ملک میں اناج کی اسقدر قلت ہے کہ اکثر درد مند افراد قوم کو اس فکر میں رات کو نیند نہیں آتی۔ کہ الٰہی اس قلت اور اس گرانی کا انجام کیا ہوگا

اے مسلمان! تو نے اپنے غلط طرزِ عمل کی بنا پر اپنی زندگی کو بہت دشوار بنا لیا ہے۔ دیکھ! ان کے تیار کردہ کپڑے (ململ) سے اپنی دستار مت بنا۔ آگے چل کر یہ دستار تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔[1]

سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ ان شاطر قوموں کے سامنے بالکل بچوں کی طرح احمق ہیں۔ یہ لوگ میٹھی گولیاں فروخت کر رہے ہیں اور ہم بچوں کی طرح ان سے یہ مضرِ صحت اشیاء ہاتھوں ہاتھ خرید رہے ہیں۔

اے مسلمان! یہ قومیں "تاجرانِ رنگ و بو" ہیں۔ اپنے ملکوں سے سامانِ آسائش مثلاً پوڈر، کریم، خوشبو اور دیگر سامانِ تعیش تیرے ہاتھ مہنگے داموں پر فروخت کرتی ہیں۔ اور تو آنکھ بند کر کے یہ لغویات ان سے خریدتا ہے۔ اور تجھے کبھی احساس نہیں ہوتا کہ تو قومی دولت کس بیدردی سے ضائع کر رہا ہے۔

---

[1] اقبال نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اپنے پیادہ کو ان کے فرزیں سے مت بدلو اور ان کی ململ سے اپنی دستار مت بناؤ۔ ۱۹۳۵ء میں دیا تھا۔

لیکن اکبر الہ آبادی بیس سال پہلے یہی مشورہ دے چکے تھے۔

چمکتے آتے ہیں شاطر کسی جزیرے سے | تم اپنے شہد کو بدلو نہ انکے شیرے سے
نہ کھیو زمزمہ ارغنون میں حسنِ سخن | سنبھال سکتے ہو تم اپنے لیے مجیرے سے
عروسِ دیں کے تکلف سے احتراز اولیٰ | مفید تر ہیں آئیں کریم کھیرے سے

لیکن افسوس ہے کہ

نہ حالی کی مناجاتوں کی پرواہ کی زمانے نے | نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یارانِ خود آرا

تو پھر کیا ہوا؟ صرف یہ کہ

شہد مسوں کا بے تکلف چڑھ گیا ہر لب پر پارا

اے مردِ حُر! تو فرنگی مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کر دے اور جو کچھ تیرے ملک میں پیدا ہو۔ اسی کو فروخت کر۔ اسی کو زیبِ تن کر اور اسی کو اپنی غذا بنا۔ تاکہ تو ان دشمنانِ دین سے بے نیاز ہو سکے۔

اے مسلمان! ذرا اقوامِ یورپ کی فنی مہارت (چرب دستی تو دیکھ) وہ تیرے ہی ملک سے اُون، ریشمی چمڑا ارزاں قیمت پر خرید کر لے جاتے ہیں اور پھر ان کو کمبل، قالین اور سوٹ کیس کی شکل میں تبدیل کر کے تیرے ہی ہاتھ گراں قیمت پر فروخت کرتی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ تو ان مصنوعات کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر مفتون ہو جاتا ہے۔ اور آنکھ بند کر کے خرید لیتا ہے۔

افسوس ہے اس قوم پر جس کے افراد پر جمود طاری ہو گیا ہو اور اس لئے وہ اپنے ہی موتیوں کو غیر اصول (اغیار) سے خرید رہی ہو۔ اور اپنے نیل کے چشموں کا ٹھیکہ غیروں کو دے رہی ہو۔

نوٹ:۔ اقبال نے اس فصل میں جو مشورہ اقوامِ مشرق کو دیا ہے اس میں وہ مشورہ بھی شامل کر لینا چاہیئے جو انہوں نے ۲۹ صفحہ میں ظاہر شاہ کو دیا تھا۔ وَھُوَ ھٰذا۔

حکمتِ اشیا فرنگی زاد نیست اصل او جز لذتِ ایجاد نیست

نیک اگر بینی مسلمان زادہ است این گہر از دستِ ما افتادہ است

این پری از شیشۂ اسلافِ ماست باز صیدش کن کہ او از قافِ ماست

یعنی اقوامِ مشرق (علی الخصوص مسلمانوں) کو لازم ہے کہ وہ

(۱) سب سے پہلے سائنس (طبیعات، کیمیا اور علم الحیات وغیرہ) کی تعلیم عام کریں۔

(۲) سائنٹفک علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد، صنعت و حرفت کو رواج دیں

اور وہ تمام آلات (سامان جنگ، آلات حرب، اور دیگر اشیاء) اپنے ملک میں تیار کریں جن کے لیے ہم ہر وقت یورپین قوموں کے سامنے دست سوال دراز کرتے رہتے ہیں یعنی جب تک پاکستان میں صنعتی انقلاب رونما نہیں ہو گا۔ ہماری معاشی، اقتصادی اور سیاسی غلامی کا دور ختم نہیں ہو سکتا۔ ۱۲

ملے خشک، روٹی جو آزاد رہ کر ۔۔۔ تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

فصل چہاردہم

در حضور رسالت مآب

تمہید:۔ گذشتہ فصل میں اصل کتاب ختم ہو گئی اس آخری فصل میں اقبال نے اپنے آقا اور مولیٰ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روحانی طور پر حاضر ہو کر اپنا حال دل بیان کیا ہے۔

ایک تو شاعری نام ہی ہے جذبات نگاری کا، اس پر مستزاد یہ کہ اقبال نے اپنے محبوب کی بارگاہ میں اپنی معروضات پیش کی ہیں نتیجہ اس کا یہ نکلا۔ کہ شراب سخن دو آتشہ ہو گئی یہی اس فصل کی خصوصیت ہے جذبات کا ایک بے پناہ سیلاب ہے جو امڈا چلا آتا ہے۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ تیر و نشتر بن کر دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو ان اشعار کو پڑھے۔ اور از خود رفتہ نہ ہو جائے۔

گرد تو گردد حریم کائنات ۔۔۔ از تو خواہم یک نگاہ التفات

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی ۔۔۔ کشتی و دریا و طوفانم توئی

آہوے زار و زبون و ناتوان ۔۔۔ کس بفتراکم نہ بست اندر جہان

اے پناہ من حریم کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو

ان اشعار میں جو سوز و گداز ہے اس کی نظیر اقبال کے سارے کلام میں اگر کہیں مل سکتی ہے تو رموز بیخودی کی آخری فصل میں جس کا عنوان ہے۔ "عرض حال مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین"

ذیل میں چند اشعار درج کرتا ہوں تاکہ ان کے پڑھنے سے قند مکرر کا لطف حاصل ہو۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است | در بحرفم غیر قرآن مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دہور | چشم تو بینندۂ ما فی الصدور
پردۂ ناموس فکرم چاک کن | ایں خیاباں، زخارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا | بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا

اس فصل میں پانچ بند ہیں۔ ذیل میں ہر بند کا خلاصہ درج کرتے ہیں

(۱) پہلے بند میں اقبال نے سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم کے الطاف بے پایاں سے آغاز سخن کیا ہے۔ اس سلسلہ کا آخری شعر یہ ہے۔

اے مقام و منزل ہر راہرو
جذب تو اندر دل ہر راہرو

اس کے بعد انہوں نے ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کی حالت زار کا نقشہ حضور کے سامنے کھینچا ہے اور آخر میں حضور سے التجا کی ہے کہ

قم باذنی گوئے داور را زندہ کن
درد لیش اللہ ہو را زندہ کن

(۱) یہ بھی ممکن تھا کہ اقبال پہلے ہی بند میں اپنا درد دل حضور کو سنا دیتے مگر انہوں نے قصداً ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں خود غرضی کا رنگ پیدا ہو جاتا۔ ملت اسلامیہ کے خادم ہونے کی حیثیت سے انہوں نے پہلے ملت کا حال زار بیان کیا یعنی اپنی قوم کو اپنی ذات پر مقدم کیا۔ پہلے قوم کی بہبود طلب کی پھر اپنا حال سنایا چنانچہ دوسرے بند میں سرکار ابد قرار صلعم سے التجا کی ہے کہ حضور اب میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۳) تیسرے بند میں اپنی حالت کا اظہار کیا ہے۔ اور سب سے پہلے یہ عرض کی ہے۔ کہ حضور ایسا عارضہ لاحق ہو گیا ہے کہ جس کی وجہ سے میری آواز بالکل بیٹھ گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ

در نفس سوز جگر باقی نماند
لطفِ قرآن سحر باقی نماند

(۴) چوتھے بند میں دیگر عوارض خصوصاً ضعف جسمانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں اپنی صحت کی آرزو کی وجہ بھی بیان کی ہے۔

با پرستاران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

(۵) آخری بند میں اس آرزو کا اظہار کیا ہے۔ کہ اگرچہ میں بہت گنہگار ہوں۔ مگر آپ کی محبت میں بلا شبہ سرشار ہوں اس لئے آپ کی خدمت میں حاضری کا امیدوار ہوں۔

بندہ را کو نخواہد ساز و برگ
زندگانی بے حضور خواجہ مرگ

پہلا بند:۔ اس بند کے پہلے نو اشعار میں اقبال نے سرکار ابد قرار صلعم کے بعض احسانات کا تذکرہ کیا ہے جو آپ نے بنی آدم پر کیے ہیں۔ سب سے پہلے قوم کی اصلاح حال کی طرف حضور کو متوجہ کیا ہے۔

ع دار ہاں ایں قوم را از ترس مرگ

کس قدر بلیغ مصرع ہے! قوم کے حق میں اس سے بہتر دعا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اگر مسلمان، خالد جانباز رضؓ کی طرح موت کے خوف سے بے پرواہ اور بیگانہ ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسکی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔

اس لیئے سب سے پہلے اقبال، بارگاہ رسالت میں یہ عرض کرتے ہیں کہ حضور! اس قوم کو (جو آپ کی نام لیوا ہے) موت کے خوف سے رہائی عطا کر دیجئے۔ دین اور دنیا کی ساری دعائیں اس ایک دعا میں آگئیں غور سے دیکھو تو صحابہؓ کی زندگی کی نمایاں ترین خصوصیت یہی تھی کہ وہ موت کے خوف سے آزاد ہو گئے تھے۔

چنانچہ حضرت خالدؓ نے ایرانی سرداروں کو جو خط لکھا تھا۔ اُس میں یہ تاریخی فقرہ بھی لکھا تھا۔

میں ایسی قوم کو تمہارے مقابلہ میں لایا ہوں جو موت کو اُسی قدر محبوب رکھتی ہے جس قدر تم زندگی کو محبوب رکھتے ہو۔

واضح ہو کہ جب کوئی قوم موت کو عزیز رکھنے لگتی ہے تو وہ لازمی طور سے دنیا میں سربلندی حاصل کر لیتی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اس نکتہ

غزیہ کو یوں نظم کیا ہے :۔

جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقین آیا
جسے جینا نہیں آیا ۔ اُسے مرنا نہیں آیا

اس کے بعد اقبال نے سرکار ابد قرار صلعم کے احسانات گنائے ہیں مثلاً

(۱) آپ نے دنیا سے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا اور اس عالم کو نئی زندگی عطا فرما دی ۔

(۲) آپ نے بنی آدم کو توحید کی نعمت سے بہرہ اندوز فرمایا یہ کلمہ طیبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کیا ہے ؟

مومن کے لئے منبع سوز و سرور ہے ۔ اور عقل کی شب تاریک کے لئے سراسر نور ہے ۔

(۳) آپ نے مسلمانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے آزاد کر دیا ۔ مسلمان نہ کسی حیوان کے سامنے سربسجود ہوتا ہے ۔ اور نہ مذہبی پیشواؤں اور کاہنوں کی غلامی کرتا ہے اور نہ وہ بتوں کو اپنا معبود سمجھتا ہے اور نہ بادشاہوں کو اپنا آقا مالک یا حاکم تسلیم کرتا ہے ۔

اے میرے آقا یہ جملہ نعمائے روحانی آپ ہی کی بدولت ہمیں حاصل ہوئیں آپ کی یاد سے ہمارے دلوں میں عشق کی شمع روشن ہے اور آپ کی محبت وہ طاقت ہے جو ایک مسلمان کو فقیری میں بھی امیری کا لطف بہم پہنچا سکتی ہے ۔ یعنی جو لوگ آپ کے عاشق ہیں وہ بحالتِ عسر بھی اپنی شانِ فقر برقرار رکھتے ہیں ۔ خواہ کچھ ہو جائے مگر غیر اللہ کے آگے نہیں جھکتے بلاشبہ آپ ہر مسلمان کا مقصود ہیں اور ہر سالک

(مومنوں) کے دل میں آپ کی محبت رچی ہوئی ہے۔

حضور انور صلعم کے الطافِ بے پایاں کے تذکرے کے بعد اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کی حالت زار سرکار ابد قرار صلعم کی خدمت میں بیان کرتے ہیں۔

ان اشعار میں سوز و گداز، فراوانیٔ جذبات اور شدتِ احساس کا جو رنگ جھلک رہا ہے وہ کسی طرح سے نثر میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اشعار پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

ع کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

تاہم چونکہ مجھے شرح کا فرض انجام دینا ہے اس لئے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگاتا ہوں۔ اور لہو لگا کر شہیدوں میں نام لکھاتا ہوں:۔

پہلا شعر:۔ ساز ما بے صوت گردید آنچناں الخ

معانی سے قطع نظر کر کے شاعرانہ اعتبار سے بھی بہت بلند شعر ہے ساز، صوت، زخمہ اور رگ (تار) کے تلازمہ نے شعر میں غضب کی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ساز کنایہ ہے قلب سے، صوت کنایہ ہے جذبۂ عشق سے۔ زخمہ کنایہ ہے یادِ معشوق یا ذکر محبوب سے رگ کنایہ ہے تار سے اور تار کنایہ ہے قلب سے۔

مطلب یہ ہے کہ اقبال قوم کی طرف سے اقبال جرم کرتے ہیں کہ اے میرے آقا اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں کے قلوب آپ کی محبت سے کچھ اس طرح خالی ہو گئے ہیں کہ اب اگر کوئی اللہ کا بندہ بھولے سے آپ کی یاد دلاتا ہے یا آپ کا تذکرہ اُن سے کرتا ہے تو وہ بھی انہیں ناگوار ہوتا ہے۔ اور وہ زبان حال سے یہ کہتے ہیں۔

گلہ   کچھ اور ذکر کیجئے یہ قصہ بیاں نہ ہو

میرے آقا میں اعتراف کرتا ہوں کہ مسلمان ساری ساری رات کلبوں اور ہوٹلوں میں داد عیش دے سکتے ہیں اور

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار

کی زندہ تصویر بن کر کافروں کو شرما سکتے ہیں لیکن آپ کا ذکر بھی اُن کی طبع نازک پر گراں گزرتا ہے۔

مختصر یہ کہ آج عرب اور عجم یعنی ساری دنیا میں عاشقان مصطفٰے نایاب ہیں اور پیروان ابولہب کی افراط ہے۔

اس اعتراف حقیقت کے بعد اقبال مسلمان نوجوانوں کی حالت بیان کرتے ہیں یہ اس لیئے کہ نوجوان ہی کسی قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں اسلیئے کسی قوم کے مستقبل کا اندازہ انہی کے طرز عمل سے کیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ حضور! آج کل کے مسلمان نوجوان کی حالت یہ ہے کہ

(۱) اس کا دماغ تو ایم اے کی ڈگری سے منور ہو گیا ہے مگر اس کا قلب (ضمیر) بالکل تاریک ہے۔ یعنی روحانی اعتبار سے بالکل مردہ ہے

(۲) جوانی میں بھی اس کے اندر مردانہ شان نظر نہیں آتی فولاد کی طرح سخت مضبوط ہونے کی بجائے ریشم کی طرح نرم اور نازک نظر آتا ہے۔

گلہ   نوجوانان چوں زناں مشغول تن

(۳) چونکہ وہ خود بھی غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور اس کے اجداد بھی اسی لعنت میں گرفتار رہتے اس لئے آزادی کا تصور بھی اس کے دماغ میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر بھولے بھٹکے ہو بھی جاتا ہے تو خود اس کے والدین اور اس کی منگیتر کے والدین سب مل کر

اسے ہزاروں سبز باغ دکھاتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کی "خاک شفا" چٹاتے ہیں، ایکزیکٹو کی کرسی کا خشم سنگھاتے ہیں۔ غرضیکہ ایسی بے حسی پلاتے ہیں کہ انجام کار راہ راست پر آتے ہیں۔

(۴) کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم نے اسے جذبۂ دین سے بالکل بیگانہ کر دیا ہے۔ اب رہا اس کا وجود (یعنی) ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کا وجود تو اس کے متعلق اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ ہاں انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے تو وہ ضرور زندہ تھا مگر جب وہ مذبح میں پہنچا تو ختم ہو گیا۔[1]

(۵) حضور! اب اُس کی حالت یہ ہے کہ وہ "اپنی خودی سے بیگانہ ہو گیا ہے اور فرنگی تہذیب پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا ہے یہاں انگریزی چال ڈھال انگریزی، لباس انگریزی، بول چال انگریزی، نگاہ انگریزی خیال انگریزی یعنی جسم دل اور دماغ تینوں انگریزی۔

چونکہ خودی سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ اسلئے نان جویں کی خاطر، انگریز کے آگے دست سوال دراز کر رہا ہے۔ اور مطلق غیرت نہیں آتی۔

معمولی سا عہدہ حاصل کرنے کے لئے دین و ایمان بیچنے پر تیار ہے۔

بلکہ چاندی کی چند ٹکلیوں کے لئے مذہب اور ملت دونوں کو قربان کر سکتا ہے۔ (اور کر رہا ہے)[2]

---

[1] واضح ہو کہ اقبال نے کالج کو پھانسی گھر سے اور ان کے استاد اکبر الہ آبادی نے کالج کو مذبح سے تشبیہہ دی ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

حضور! افسوس اس بات کا ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسر چونکہ خود
کم سواد اور کم نظر تھے اسلئے وہ اسے اسکے مقام سے آگاہ نہ کر سکے۔

ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

فرنگی تعلیم اور تہذیب نے اس کی شخصیت کو بالکل پگھلا دیا بالفاظ دگر
اس آگ (تہذیب مغرب) نے اس کی ماہیت ہی قلب کر دی یعنی مومن سے
کافر بنا دیا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ

ع در حرم زائید و در بتخانہ مُرد

(۶) کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مسلمان ہونے کا مدعی ہے۔ اور
شہادت کے فلسفہ سے بے خبر ہے۔ یعنی اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمان
وہ ہے جو جنت کے عوض اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے ہاتھ فروخت
کر دیتا ہے[۱] اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ جو شخص اللہ کی راہ میں مارا جاتا ہے
وہ موت پر غالب آجاتا ہے۔ اور اس لئے ابدی زندگی حاصل کر لیتا
ہے یہی وجہ ہے کہ ہم شہید کو مردہ نہیں کہہ سکتے۔

(بقیہ) اکبر کہتے ہیں:- یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

[۲] اکبر الہ آبادی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

[۱] اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط (۹ - ۱۱۲)

بلا شبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور انکے مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے ۱۲

[۲] وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ط (۲ - ۱۵۴) اور جو
لوگ راہ خدا میں شہید ہو جائیں انکو مردہ مت کہو حقیقت یہ ہے کہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم اس نکتہ کو نہیں
سمجھتے ۱۲

بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگ اورا می دہد جانے دگر

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ اس صداقت عظمیٰ سے بیگانہ ہو گیا ہے کہ

لَا غالبَ اِلَّا اللّٰہ

یعنی آگاہ ہو جاؤ۔ کہ اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں ہے۔

(۷) چونکہ اس کا دل آپ کی محبت سے خالی ہو چکا ہے اس لئے وہ ہر وقت مادیات میں منہمک رہتا ہے بلکہ اس نے خواب و خورد ہی کو مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چند لقموں کی خاطر ضمیر فروشی کرتا ہے اور صرف اپنے ایک پیٹ کو بھرنے کے لئے سینکڑوں آدمیوں کی خوشامد میں مشغول رہتا ہے۔

فرنگی اقوام سے غیر اسلامی عقاید اور افکار اخذ کرتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود اس کا دماغ کافرانہ خیالات سے معمور نظر آتا ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ مسلمان نوجوان ہر اعتبار سے مردہ ہو چکا ہے اس لئے اے میرے آقا میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اسے دوبارہ زندہ کر دیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کے دل میں توحید الہٰی (اللّٰہ ھو) کے عقیدہ کو راسخ کر دیجئے۔

نوجوانوں کی حالت بیان کرنے اور ان کے حق میں دعائے خیر کے بعد اقبال عامۃ المسلمین کے لئے دعا کرتے ہیں کہ حضور! حقیقت تو یہ ہے۔

کہ کیا جوان اور کیا بوڑھے، ہم سب مادیت اور الحاد کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ انگریزوں نے اپنے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی بدولت ہمیں بے تیرو تفنگ ختم کر دیا۔ اپنی زبان پڑھا کر ہمیں اسلام سے بیگانہ کر دیا اور اپنا ادب پڑھا کر ہمیں بے ادب بنا دیا۔ اور مغربی افکار کے ذریعہ سے ہماری شخصیت اور ذہنیت کو مسخ کر دیا۔

اے آقا! آپ ایسی قوم میں، جو اسلام سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ (جام او شکست) کوئی ایسا شخص ہماری راہنمائی کے لئے کھڑا کر دیجئے۔ یا ظاہر کر دیجئے۔ جو فی الحقیقت اللہ کا بندہ (اللہ مست) ہو تاکہ اس کی صحبت میں بیٹھ کر مسلمان دوبارہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں اور آشنائے راز ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو ساری قوموں سے افضل یقین کر سکیں [1]

دوسرا بند:- اقبال نے اس بند میں سرکار دو عالم صلعم کو شہسوار کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ شہسوار کنایہ ہے حکمران اور صاحب اقتدار ہستی سے، چونکہ حضور کو اللہ نے دونوں جہان کی سرداری (بادشاہت) عطا کی ہے اس لئے اقبال نے حضور کو اسی لقب مخاطب کیا ہے۔

---

[1] یہ تصور اس آیت سے ماخوذ ہے:۔
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط
(۳-۱۱۰) تم بہترین امت ہو جو پیدا کی گئی لوگوں کی (اصلاح کے لئے) (اور تمہارے تفوق کا ثبوت یہ ہے کہ) تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور ان کو برائیوں سے روکتے ہو ۱۲

کہتے ہیں کہ حضور! ایک لمحہ کے لئے آپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنی چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ حضور کے سامنے مجھے یارائے گویائی نہیں ہے میں اس وقت اس کشمکش میں گرفتار ہوں۔ کہ لب کشائی کرکے حال دل بیان کردوں۔ یا حواس خمسہ کو مجتمع کرکے آپ کے جمال سے لطف اندوز ہوں؟ لیکن چونکہ شوق المحکوم ادب نہیں ہوتا اس لئے عرض کرتا ہوں کہ

گرد تو گرد و حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہ التفات

حضور! میرے حال زار پر محبت کی نگاہ کیجئے۔ چونکہ میری نگاہ میں میرے لئے آپ ہی سب کچھ ہیں۔ اس لئے آپ سے اپنا حال دل نہ کہوں تو اور کس سے کہوں۔ آپ کے سوا اور کوئی ہستی رحمۃ اللعالمین نہیں ہے۔ بالفاظ دگر کائنات خلقت میں کوئی آپ کا ثانی نہیں ہے[1]

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

آپ ہی کا ذکر میری زندگی کا مقصد ہے میرے دل میں آپ کی یاد بسی ہوئی ہے۔ ہر وقت آپ ہی کا تصور کرتا رہتا ہوں میرے خیال کی دنیا آپ ہی کے دم سے آباد ہے۔ آپ ہی میرے علم و عرفان کا منتہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان خدا کا علم و عرفان تو کما حقہ

---

[1] لطف بدایونی نے اسی حقیقت کو یوں نظم کیا ہے۔

رُخ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزم خیال میں نہ دکان آئینہ ساز میں

حاصل کر نہیں سکتا کیونکہ ذات باری حیطۂ ادراک انسانی سے وراء الورا ہے۔ لہذا انسانی فکر کی انتہائی پرواز یہ ہے کہ وہ آپ کے کمالات سے آگاہ ہو سکے۔

کشتی کنایہ ہے رہبر اور محافظ سے اور دریا کنایہ ہے عالم روحانی (ملکوت، جبروت، لاہوت) سے اور طوفان کنایہ ہے احوال و مقامات سے مطلب یہ ہے کہ میں آپ ہی کے واسطے اور وسیلہ سے خدا تک پہنچ سکتا ہوں۔ میری کشتی بھی آپ ہی ہیں، دریا بھی آپ ہی ہیں، اور طوفان بھی آپ ہی ہیں۔

حضور میں ایک عاجز اور ناتواں انسان ہوں مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ع کس بفتراکم نہ بست اندر جہاں۔

میرے آقا! میں کچھ توقعات لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

تیسرا بند:۔ اس تمہید کے بعد اپنا حال دل بیان کرتے ہیں:۔

حضور کچھ عرصہ سے مختلف عوارض جسمانی میں مبتلا ہوں۔ ان میں سے ایک عارضہ یہ ہے کہ میرا گلہ بیٹھ گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

در نفس سوز جگر باقی نماند
لطف قرآنِ سحر باقی نماند

نوٹ:۔ ۱۹۳۴ء میں علامہ مرحوم کی آخری علالت کا آغاز ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کا گلا ایسا بیٹھا کہ تادم وفات آواز درست نہ ہو سکی۔ ۱۲

یعنی نہ میں اب باآواز بلند گفتگو کر سکتا ہوں۔ نہ کسی جلسہ میں تقریر کے سوز وجگر کا اظہار کر سکتا ہوں۔ اور نہ خوش الحانی کے ساتھ تلاوت قرآن کر سکتا ہوں۔

حضور! میرے قلب میں جذبات واحساسات کا ایک دریا موجزن ہے۔ ان کے اظہار کے لئے تو مجھے فضائے بیکراں بلکہ وسعت آسمان درکار ہے۔ اب آپ خود غور فرمائیں کہ میں اپنے افکار وخیالات کو، جو باہر آنے کے لئے ہر وقت بیتاب رہتے ہیں کس طرح اور کب تک اپنے سینہ میں مقید رکھوں؟

چوتھا بند: حضور اس تکلیف کے علاوہ دیگر عوارض بھی لاحق حال ہیں۔ اور اب یہ کیفیت ہے کہ کوئی دوا موافق نہیں آتی۔ بلکہ دواؤں کی بو مجھے ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ کسی قسم کی دوا پینے کو جی نہیں چاہتا۔ جس طرح بچے دوا پینے سے جان چراتے ہیں بس وہی حال میرا ہے چنانچہ میں اس کی تلخی کو شکر سے دور کرتا ہوں اور اس بات سے میرا معالج زیر لب مسکراتا ہے۔

حضور! جس طرح آپ نے بصیری پر نگاہ کرم کی تھی۔ اسی طرح میری مشکل بھی آسان فرما دیجئے۔ چونکہ میں باطل پرستوں (پرستاران شب) کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف ہوں۔ اور اس دور مادیت میں یہ جہاد اشد ضروری ہے اس لئے میں آپ سے ملتجی ہوں کہ مجھے صحت عطا فرما دیجئے۔

آپ کا وجود اس عالم کے لئے زندگی اور تازگی کا سبب ہے۔ آپ مجھے اپنے فضل وکرم (پرتو) سے محروم نہ فرمائیں۔

قدر جاں از پرتو جاناں بود
خود بدانی قدر تن از جان بود
(رومی)

میرے آقا! آپ سے بڑھ کر اس نکتہ سے کون آگاہ ہو سکتا ہے۔ کہ جسم کی قدر و قیمت، جان کی وجہ سے ہوتی ہے اگر جسم میں جان نہ ہو تو جسم کی کوئی قیمت نہیں ہے اور خود جان کی قدر و قیمت، محبوب کی نگاہ کرم (یعنی تو ذات) پر موقوف ہے۔ یعنی جس شخص پر آپ مہربان نہ ہوں۔ یا جس شخص کی جان پر آپ اپنا پرتو نہ ڈالیں اس کی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یا ز نور مصطفےٰ او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفےٰ است
(جاوید نامہ)

میرے آقا! میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ غیر اللہ سے اپنا رابطہ بکلی منقطع کر دوں۔ کسی انسان کی طرف دست سوال دراز نہ کروں۔ کسی شخص سے کوئی امید نہ رکھوں۔ اس لئے یا تو آپ مجھے شمشیر بنا دیں تاکہ جو طاقت بھی مجھے آپ کے آستانے سے دور کرنے کی کوشش کرے اُسے فنا کر دوں۔ یا مجھے ایسی روحانی قوت عطا فرما دیں کہ میری راہ میں جو دشواری حائل ہو اسے دُور کر سکوں۔

شمشیر کنایہ ہے۔ مادی ساز و سامان یا مال و دولت سے، اور جو شخص فارغ البال ہوتا ہے۔ وہ ضمیر فروشی سے محفوظ رہتا ہے۔ افلاس، انسان کو غیر اللہ کے آستانہ پر جبہہ سائی کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔

"کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا"

قریب ہے کہ مفلسی انسان کو کافر بنا دے۔ (حدیث نبوی)

کلید کنایہ ہے روحانی قوت سے جس کی بدولت انسان اپنی تمام

ضروریات خود پوری کر سکتا ہے۔ اور تمام دنیاوی مشکلات پر خود غالب آسکتا ہے اور اس لئے اصحاب اور ارباب اقتدار کے سامنے سرنیاز خم کرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ مثال درکار ہو تو محبوب الٰہی سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رحم کی زندگی کا مطالعہ کافی ہوگا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت موصوف کے لنگر خانہ کا خرچ کئی سو روپے روزانہ تھا (کم و بیش) پانچہزار نفوس دونوں وقت آنجناب کے دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے لیکن حضرت نے کبھی کسی بادشاہ یا وزیر یا امیر یا جاگیر دار کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔

یہ فقرہ تو میں نے ضابطہ کی خانہ پری کے لیے لکھا ہے ورنہ حضرت کی شان تو یہ تھی۔ کہ سلطان علاؤ الدین خلجی ساری عمر قدمبوسی کا آرزو مند رہا۔ مگر حضرت نے ہمیشہ اس کی استدعا کے جواب میں یہی فرمایا:۔ بادشاہ کا مقصد میرے پاس آنے سے یہی تو ہے کہ وہ مجھ سے اپنے لئے اور اپنی سلطنت کے لئے دعا کرائے۔ تو میں خود اس کے حق میں دعا کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے ملاقات کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی شان استغنا کو مد نظر رکھ کر تو اقبال نے سرکار ابد قرار صلعم سے یہ التجا کی ہے کہ

ع یا مرا شمشیر گرداں الکلید

حضور اگرچہ اللہ تعالی نے مجھے علم دین سے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے مگر میں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنے علم کے اقتضا پر عمل نہ کر سکا۔ اس لئے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے عمل صالح کی توفیق عطا فرمائیے۔

کوہکن کے سامنے تو صرف ایک پہاڑ تھا۔ مگر میرے سامنے تو اس سے بھی دشوار تر کام ہے۔ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا اور پھر ان کے دلوں میں، آپ کی محبت کی آگ سلگانا..... اس لئے میرے عزم (تیشہ) کو مستحکم تر (تیز تر) کر دیجئے۔ اور میری حوصلہ افزائی کیجئے۔ مسلمانوں کو آپ کے آستانے پر جھکانا، بلا مبالغہ پہاڑ کھودنے سے بھی زیادہ صبر آزما ہے۔

حضور، با ایں ہمہ کوتاہی اور با ایں ہمہ رسوائی ما میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں "کافر خویشتن"[1] نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ میں بے انتہا ترقی کی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے اور میں اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوں کہ

ع عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

اس لئے میں آپ سے ملتجی ہوں کہ میری خودی کو فقر کی سان پر چڑھا دیجئے (یعنی مجھ پر نگاہ کرم کر دیجئے)۔

آخری بند: حالِ دل بیان کر چکنے کے بعد اب اقبال آخر میں وہ بات زبان پر لاتے ہیں جسے ابتدائے آفرینش سے تا ایں دم ہر عاشق اپنے لئے باعث صد فخر و مباہات یقین کرتا ہے۔ بلکہ با ایں ہمہ بے سروسامانی اس پر ناز کرتا ہے۔

---

[1] شاخ نہال سدرہ خار و خس چمن مشو — منکر او اگر شدی منکر خویشتن مشو
(ترجمہ)

ذرا تصوّر کیجیے۔ ایک عاشق صادق کو خوش قسمتی سے یہ زریں موقع نصیب ہو گیا ہے کہ وہ اپنے معشوق کے سامنے بیٹھا ہے اور اس سے نگاہ کرم کی التجا کر رہا ہے۔ قدرتی طور پر معشوق کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اس پر نگاہ کرم کی جائے تو کیوں؟ یعنی اس عاشق میں کونسی خوبی ہے جس کی بنا پر اسے مورد الطاف بنایا جائے۔

عاشق صادق معشوق کی اس ذہنی کشمکش سے بےخبر نہیں ہے وہ جانتا ہے کہ دنیا میں جب تک کوئی شخص استحقاق ثابت نہ کر لے مورد الطاف و کرم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ پوری ہمت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ

گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است | چیز کے دارم کہ نام او دل است
دارمش پوشیدہ از چشم جہاں | کز سمِ شبدیزِ تو دارد نشاں

اے محبوب مجھے تسلیم ہے کہ میں اپنی کشتِ عمر سے کوئی "حاصل" فراہم نہ کر سکا۔ بالفاظ دگر ؎ تخم کردارے ز خاک من نرست

میں واقعی اس قابل نہیں ہوں۔ کہ آپ کی خدمت میں ارمغان عمل پیش کر سکوں۔ مگر ایک صداقت ایسی ہے جس کے اظہار سے میں باز نہیں رہ سکتا اور وہ یہ ہے کہ لاکھ برا ہی مگر ہوں آپ کا عاشق۔

حضور میرے پاس ایک بہت معمولی سی چیز ہے جسے عرف عام میں "دل" کہتے ہیں۔ بس یہ ذرا سا دل میرا سرمایۂ حیات ہے۔ اور میں نے اسے دنیا والوں سے ہمیشہ پوشیدہ رکھا ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ اس پر آپ کے گھوڑے کے سُم کا نشان ثبت ہے سلہ

چونکہ حضورؐ کو "شہسوار" کہہ کر خطاب کیا ہے لہذا اسی مناسبت سے یہاں شبدیز کا لفظ استعمال کیا ہے سم شبدیز میں ایک عاشقانہ خوبی بھی مضمر ہے وہ یہ کہ عاشق اپنی فروتنی

دعویٔ الفت کے بعد اقبال اپنی دلی آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ حضور! میں کسی دنیاوی حشمت و شوکت یا مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں میں تو آپ کا قرب چاہتا ہوں - آپ سے دور رہ کر مجھے اپنی زندگی بامُوت معلوم ہوتی ہے عاشق کے زاویہ نگاہ سے

ع زندگانی بے حضورِ خواجہ، مرگ

کا مصداق ہے آپ سے دور رہ کر زندگی، زندگی ہی نہیں ہے۔

حضور والا! آپ نے تو اپنے ایک طالب صادق کو، جو کردی الاصل ہونے کی بنا پر عربی زبان سے نابلد تھا - نطق اعرابی سے بہرہ ور فرما دیا تھا - تو آپ کے لئے مجھے مدینہ بلا لینا کیا مشکل ہے ع۱

میرے آقا! میری حالت یہ ہے کہ حوادث روزگار کی وجہ سے میرے جگر میں لالہ کی طرح داغ پڑے ہوئے ہیں اور میرے احباب میرے حال درون سے بیخبر ہیں - وہ اکثر اوقات میرے پاس آتے ہیں ہر قسم کی باتیں

(بقیہ) کا اظہار کر رہا ہے کہ میں اس قابل کہاں کہ آپ کا نقش میرے دل پر کندہ ہوتا میرے لئے یہی بس ہے کہ آپ کے گھوڑے کے سُم کا نشان میرے قلب کی زینت بنا ہوا ہے ۱۲

۱ آنحضرت کے عشاق میں ایک بزرگ گذرے ہیں جو کردستان کے رہنے والے تھے اور عربی زبان سے مطلق ناآشنا تھے انہوں نے حضور سے التجا کی کہ مجھے شرم آتی ہے کہ آپ سے محبت کا دعویٰ اور آپ کی زبان سے بیگانہ ہوں رات کو یہ دعا کی اور جب صبح ہوئی تو وہ عربی زبان میں بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگا - چنانچہ ان کا یہ قول تذکروں میں منقول ہے -

اَمْسَیْتُ کُرْدِیًّا وَ اَصْبَحْتُ اَعْرَابِیًّا

شام تک میں کردی تھا لیکن جب صبح ہوئی تو عربی بن گیا ۱۲

کرتے ہیں میری شاعری کی مدح میں نثر میں قصیدے پڑھتے ہیں کوئی مجھے ٹیگور سے بدرجہا بڑھاتا ہے۔ اور کوئی میرا رشتہ ملٹن اور شکسپیر سے ملاتا ہے کوئی مجھے اپنے وقت کا رومی اور سعدی قرار دیتا ہے مگر یہ بات کوئی نہیں پوچھتا کہ تم اپنے علاج معالجہ کے لئے دیانا کیوں نہیں جاتے؟ [له]

حضور اقدس! میں اس دنیا میں نے کی طرح نالاں ہوں کیونکہ مجھ سے ملنے کے لئے تو بہتیرے آدمی آئے مگر میرا درد کسی نے نہ جانا میں اپنے آپ کو اس دنیا میں اس چوب نیم سوز سے تشبیہ دیتا ہوں جسے قافلے والے جلتا ہوا چھوڑ گئے ہوں اور اب وہ بے کار جل رہی ہو۔

کارواں کنایہ ہے قوم کی شوکت ماضیہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانان ہند کی عظمت کا مدت ہوئی خاتمہ ہو گیا۔ اب نہ کوئی عالمگیر ہے نہ کوئی ٹیپو سلطان صرف میں مرثیہ خوانی کے لئے زندہ ہوں "سوختن" کنایہ ہے قوم کی غفلت یا اس کے زوال پر نوحہ خوانی سے مطلب یہ ہے کہ قوم مردہ ہو چکی ہے بلکہ

له اس میں شک نہیں کہ اقبال ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے جو مردہ پرست ہے اگر وہ ہندو قوم میں پیدا ہوئے ہوتے تو اس زندہ قوم کے افراد دیانا کے بہترین ڈاکٹروں کو جاوید منزل میں تشخیص مرض کے لئے لا سکتے تھے لیکن اقبال کے مداح ان کی زندگی میں انہیں دیانا بھجوانے کا بھی انتظام نہ کر سکے۔ ہاں جب ان کا انتقال ہو گیا تو اس مردہ پرست قوم نے اپنی دیرینہ روایات کے مطابق ہزاروں روپیہ مزار کی تعمیر پر بھی خرچ کر دیا اور ہر سال ۲۱ اپریل کو عرس بھی کر رہی ہے غالباً ہندی زبان میں یہ مثل اسی موقع کے لئے وضع کی گئی تھی: مر جیتے تھے تو میرے لیکھوں جھڑے، مر گئے تو میرے موتیوں جڑے۔ ۱۲

خالصہ شمشیر و قرآن را ببرد اندریں کشور مسلمانی بمرد[1] (جاوید نامہ)

اور میں نوحہ خوانی کر رہا ہوں۔ اور اس امید پر جی رہا ہوں۔ کہ شاید مسلمانوں میں کوئی انقلاب پیدا ہو جائے۔ اور کوئی جماعت ایسی ظہور میں آجائے۔ جو میرے پیغام (آہ و نالہ و فریاد یا سوختن) سے استفادہ کر سکے اور اس طرح میرا جلنا (پیغام) کارآمد ہو سکے یعنی میرے پیغام کا کوئی نتیجہ برآمد ہو سکے۔

اے میرے آقا! چونکہ میں اپنے مقصد سے دور ہوں اس لئے مجبوری کا یہ احساس مجھے ہر وقت مصروف فغاں رکھتا ہے۔ اور میں ہر وقت اپنے حال زار (اپنی بد نصیبی) پر افسوس (وائے من) کرتا رہتا ہوں۔ ۱۲

---

[1] میں نے دوسرے مصرع میں قدرے تصرف کیا ہے یعنی اندر اں کی جگہ اندریں لکھا ہے۔ تاکہ ناظرین کو کشور کا مصداق متعین کرنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔ ۱۲۔

تمت بالخیر

۱۳ ذی قعدہ ۸۶ھ